اسلام

ایک نظریہ ـــ ایک تحریک

مریم جمیلہ

مرکزی مکتبہ اسلامی - دہلی

اسلام ایک نظریہ ـــ ایک تحریک

مریم جمیلہ

مریم جمیلہ (سابق مارگریٹ مارکس) نیو یارک کے ایک یہودی خاندان میں ۱۹۳۴ء میں پیدا ہوئیں ۔ ابتدائی تعلیم امریکی سیکولر اداروں میں حاصل کرنے کے بعد ۱۹۵۲ء میں نیویارک یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔ ۱۹۵۹ء میں مشرف بہ اسلام ہوئیں ۔ ۱۹۶۲ء میں مفکرِ اسلام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے طویل مراسلت کے بعد مولانا کی دعوت پر پاکستان تشریف لے آئیں اور جماعت کے ایک ہمہ وقتی کارکن سے نکاح کرلیا ۔ اب اسلام کی قلمی خدمت کی سعادت حاصل کررہی ہیں ۔ ان کی متعدد کتابیں اور مقالات شائع ہوکر اہلِ علم اور ارباب نظر سے خراجِ تحسین حاصل کرچکی ہیں ۔

زیرِ نظر کتاب "اسلام ـــ ایک نظریہ ایک تحریک" موصوفہ کی انگریزی کتاب "اسلام اِن تھیوری اینڈ پریکٹس" کا ترجمہ ہے ۔

اس کتاب کے پہلے باب کا عنوان ہی "یہودیت سے اسلام تک" ہے ۔ یہ ذہنی اور روحانی سفر کی مختصر لیکن خیال افروز داستان ہے ۔ یہ کتاب ۳ حصّوں پر مشتمل ہے ۔ پہلے حصے میں اپنے قبولِ اسلام کے ساتھ فاضل مؤلفہ نے "مسیحی لادینیت" کا اسلامی اقدار کی روشنی میں جائزہ لیا ہے اور "دنیائے اسلام" کے بارے میں ان غلط فہمیوں اور کج بیانیوں پر بحث کی ہے جو مغرب میں عام ہیں ـــ دوسرے حصّہ میں صحت وصفائی ، آداب و اخلاق ، عرب ثقافت ، فنونِ لطیفہ ، خواتین ، معاشرتی تقاضوں کے بارے میں اسلامی تعلیمات پیش کی گئی ہیں ـــ تیسرا حصّہ عالمِ اسلام کی ان سرکردہ شخصیات کے تذکرہ اور نقد وتبصرہ پر مشتمل ہے ۔ جنھوں نے مختلف ادوار میں عالم اسلام کے مختلف خطوں میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کی ۔ اس فہرست میں محمد بن عبدالوہابؒ ، سنوسی تحریک ، شاہ ولی اللہؒ ، سید احمد شہیدؒ ، سعید حلیم پاشاؒ ، جمال الدین افغانی ، سید محمد رشید رضاؒ ، شیخ حسن البناؒ ، مولانا محمد علی جوہرؒ ، علامہ اقبالؒ ، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور جماعتِ اسلامی شامل ہیں ۔ اس حصہ کے بعض مندرجات اور نتائج کے بعض پہلوؤں سے اختلاف ہوسکتا ہے لیکن مصنّفہ نے اپنی بات اخلاص اور پورے زور سے کہی ہے ۔

آخری حصّے میں مغربی دنیا میں اسلام اور مشنری تحریکوں کی سعی وجہد کا جائزہ لیا ہے ۔ اہلِ علم مسلمانوں پر جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے ، اس کا ذکر کیا ہے اور اس بات سے بحث کی ہے کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے امکانات کس حد تک ہیں ۔

پوری کتاب اپنے اندر فکر انگیز مباحث رکھتی ہے ۔ مصنفہ کی راست فکری اور غیر مرعوبانہ ذہن بجائے خود ان پشتینی مسلمانوں کے لیے بے حد سبق آموز ہے جو اسلام کا مطالعہ اور اس کا دفاع سخت مرعوبانہ ذہنیت سے کرتے ہیں ۔

مطبوعات اشاعت اسلام ٹرسٹ نمبر 987

نام کتاب	اسلام، ایک نظریہ — ایک تحریک
مصنفہ	مریم جمیلہ
ناشر	مرکزی مکتبہ اسلامی، ۱۳۵۳، چتلی قبر، دہلی ۶

اشاعت :

بار اوّل	اپریل ۱۹۸۲ء	۲۰۰۰
بار دوم	جون ۱۹۹۳ء	۱۰۰۰

قیمت ۲۵/- روپے

مطبوعہ : روبی پرنٹنگ پریس، دہلی ۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تعلیماتِ قرآنی

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۔ (البقرہ : ۲۱-۲۲)

"اے لوگو! اپنے اس رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور ان سب کو جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں پیدا کیا تاکہ تم متقی بن جاؤ۔ وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہاری خاطر زمین کا فرش بچھایا اور آسمان کی چھت بنائی اور اُوپر سے پانی برسایا، اور اس کے ذریعے سے ہر طرح کی پیداوار نکال کر تمہارے لیے رزق بہم پہنچایا، پس ان باتوں کے علم کے بعد کسی کو اللہ کا مدِّمقابل نہ ٹھیراؤ۔"

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۔ (البقرہ : ۲۸)

"تم لوگ اللہ کے ساتھ کفر کا رویّہ کیسے اختیار کرتے ہو، حالانکہ تم بے جان تھے اُس نے تم کو زندگی عطا کی پھر وہی تم پر موت طاری کرے گا، پھر وہی تم پر دوبارہ زندگی عطا کریگا۔

پھر تم اُسی کی طرف پلٹ کر جاؤ گے۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۔ (آل عمران : ۸۵)

"جس نے اسلام کے سوا کسی اور دین (نظامِ حیات) کو اختیار کرنا چاہا، اُس کا وہ دین (نظامِ حیات) ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ناکام و نامراد رہے گا۔"

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۭ وَلَوْ اٰمَنَ اَھْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّھُمْ ۭ مِنْھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُھُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۔ (آلِ عمران : ۱۱۰)

"تم (اے مسلمانو) وہ بہترین گروہ ہو جسے انسانوں کی ہدایت کے لیے برپا کیا گیا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ اگر اہلِ کتاب (یہودی اور عیسائی) بھی ایمان لے آتے تو انہی کے حق میں بہتر تھا۔ اگرچہ ان میں کچھ لوگ تو مومن بھی ہیں لیکن ان کی اکثریت نافرمانوں پر مشتمل ہے۔"

يٰٓاَيُّھَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۔

(النساء : ۱۴۴)

"اے ایمان لانے والو، مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق اور دوست نہ بناؤ۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کی صریح حجت اپنے خلاف قائم کر لو۔"

ھُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَي الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۔ (التوبہ : ۳۳)

"وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اُسے تمام ادیان پر غالب کر دے، خواہ یہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔"

يٰٓاَيُّھَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۔

(النساء : ۵۹)

"اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں۔ پھر اگر کسی معاملے میں تمہارا آپس میں نزاع ہو جائے تو اُسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو، اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طرزِ عمل ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۔ (الاحزاب : ۳۶)

"کسی مومن مرد اور مومن عورت کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ جب اللہ اور اُس کا رسول کسی کا فیصلہ کر دیں تو وہ اپنی رائے کو اس میں دخل دیں اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا وہ کھلی گمراہی میں ہے۔

اَلْيَوْمَ يَىِٕسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ۭ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۭ (المائدہ : ۳)

آج کافروں کو تمہارے دین کی طرف سے پوری مایوسی ہو چکی ہے، لہٰذا تم ان سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر

فرمودات رسولؐ

حضرت ابوہریرہ رضہ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

مَنْ اَطَاعَنِي دَخَلَ الْجَنَّةَ وَ مَنْ عَصَانِي فَقَدْ اَبٰى۔ (بخاری)

"جس نے میری اطاعت کی وہ جنّت میں داخل ہوا اور جس نے میری نافرمانی کی اُس نے (جنّت میں جانے سے) انکار کیا۔"

حضرت جابر رضہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

فَاِنَّ خَيْرَ الْحَدِيْثِ كِتَابُ اللّٰهِ وَخَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَشَرَّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ۔ (مسلم)

" بلاشبہ بہترین ذکر اللہ کی کتاب ہے اور بہترین رہنمائی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی ہے۔ بدترین امور دین میں اختراع کردہ باتیں (بدعات) ہیں اور ہر بدعت گمراہی ہے۔"

حضرت عائشہ رضہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

مَنْ اَحْدَثَ فِي اَمْرِنَا هٰذَا مَالَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ (متفق علیہ)

"جس نے ہمارے اس کام (اسلام) میں کوئی نئی بات داخل کی، جس کا اُس سے کوئی تعلق نہیں ہے، وہ مردود ہے۔"

حضرت ابن عمر رضہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ۔ (مسند ابن حنبل۔ سُنن ابوداؤد)

"جس نے دوسرے لوگوں (یعنی کافروں) کی مشابہت اختیار کی، اُس کا شمار انہی میں ہوگا۔"

حضرت ابوہریرہ رضہ روایت کرتے ہیں کہ مَیں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کو یہ فرماتے سُنا ہے:

من خرج من الطّاعة وفارق الجماعة فمات ميتةً جاهلية ومن قاتل تحت رايةٍ عمّيّةٍ يغضب لعصبيّةٍ اويدعو لعصبيّة او ينصر عصبيةً فقتل فقتلةٌ جاهلية (مسلم)

"جس نے قلادہ اطاعت اپنی گردن سے اُتارا اور مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہوگیا تو وہ جاہلیت کی موت مرے۔ اور جس نے اندھی قومی عصبیت کا پرچم اُٹھایا اور اس کے نیچے لڑتا ہوا مارا گیا تو اُس کا قتل جاہلیت کا قتل ہوگا......"

حضرت انس رضہ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

اِسْمَعُوْا وَ اَطِيْعُوْا وَاِنِ اسْتُعْمِلَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ حَبَشِيٌّ كَاَنَّ رَأْسَهٗ زَبِيْبَةٌ (مسلم)

"سُنو اور اطاعت کرو اگرچہ تمہارا حکمران کسی حبشی غلام کو بنا دیا جائے جس کا سر انگور کی مانند چھوٹا ہو۔"

حضرت ابوسعید رضہ روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

اَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ

(ابن ماجہ، ترمذی، ابوداؤد)

"بہترین جہاد وہ کلمۂ حق ہے جو کوئی شخص کسی ظالم حکمران کے سامنے کہتا ہے۔"

حضرت نواس بن سمعانؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ۔

"خالق کی معصیت میں کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں ہے۔"

حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا يَلِجُ النَّارَ رَجُلٌ بَكَى مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ حَتّٰى يَعُوْدَ اللَّبَنُ فِي الضَّرْعِ وَلَا يَجْتَمِعُ عَلٰى عَبْدٍ غُبَارٌ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ وَدُخَانُ جَهَنَّمَ۔

(ترمذی)

"جو شخص خشیتِ الٰہی سے روتا ہے اُسے آگ میں نہیں ڈالا جائے حتیٰ کہ دودھ ہوا دودھ تھن میں واپس چلا جائے اور کسی شخص پر اللہ کی راہ میں اُڑنے والا گرد و غبار اور جہنم کا دھواں جمع نہیں ہو سکتا۔"

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى أَكُوْنَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ۔ (بخاری)

"تم میں سے کوئی شخص اُس وقت صاحبِ ایمان نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اُس کے نزدیک اُس کے باپ، اُس کے بیٹے اور تمام نوعِ انسانی سے زیادہ محبوب نہ بن جاؤں۔"

مندرجات

دیباچہ ۱۳

باب ۱: تعارف ۱۵

یہودیت سے اسلام تک ۱۷

مسیحی لادینیت اسلامی اقدار کی روشنی میں ۳۱

"محمدی دنیا" اسلام کے متعلق ایک مثالی غلط بیانی ۴۱

باب ۲: اسلام — ایک نظریہ ۵۱

مسلمان ذہن ۵۳

اسلام اور ذہنی صحت ۶۳

اسلام اور صفائی پسند ۸۳

اسلامی اور مسیحی آداب کا تقابل ۹۳

اسلام اور عرب تہذیب ۱۰۷

اسلام اور فنی کاوشیں ۱۱۱

مسلمان عورت — معاشرے میں اس کا کردار ۱۲۱

مسلمان عورت کی آزادی اور اسلام ۱۲۹

مسلمان ماں کے فرائض ۱۳۹

اسلامی جماعت کے لوازمات ۱۴۵

باب ۳: اسلام — عمل کے میدان میں ۱۵۷

علما رکون ہیں ؟ ۱۵۹
محمدؒ بن عبدالوہابؒ کی تحریک ۱۶۳
سنوسی تحریک ۱۷۳
شاہ ولی اللہ ۱۹۱
سیّد احمد شہیدؒ ۱۹۷
شہزادہ سعید حلیم پاشاؒ ۲۰۳
بدیع الزّماں سعید نورسیؒ ۲۱۹
سیّد جمال الدّین افغانیؒ ۲۳۱
سیّد رشید رضاؒ اور تحریکِ منار ۲۳۷
شیخ حسن البنّاؒ ۲۴۵
الاخوان المسلمون ۲۵۳
محمد علی جوہرؒ ۲۶۷
پیغامِ اقبالؒ ۲۸۱
مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ ۲۹۹
جماعتِ اسلامی پاکستان ۳۴۹

باب ۴ — حاصلِ بحث ۳۷۷

اسلام اور دنیائے مغرب میں تبلیغی جدّوجہد ۳۷۹
اہلِ علم کا فرض ۳۸۵
اسلامی نشاۃ ثانیہ کے امکانات ۳۸۹

پیش لفظ

زیرِ نظر کتاب نومسلم خاتون محترمہ مریم جمیلہ کی ایک قابلِ قدر تصنیف

(Islam in Theory and Practice)

کا ترجمہ ہے۔ موصوفہ کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔ ان کی متعدد کتابیں اور مقالات شائع ہو کر اہلِ علم اور اربابِ نظر سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب وقت کے ایک اہم ترین موضوع سے بحث کرتی ہے۔ کتاب چار حصّوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصّے میں مصنفہ نے اپنے اُس اعتقادی سفر کی داستان بیان کی ہے جو انہوں نے یہودیت کی تاریکی سے نکل کر اسلام کی روشنی میں آنے کے لیے کیا۔ ساتھ ہی مسیحی لادینیت کا اسلامی اقدار کی روشنی میں جائزہ لیا ہے اور عالمِ اسلام اپنے فکر و عمل سے اسلام کی جو غلط نمائندگی کر رہا ہے اور اس کے جو نتائج مرتب ہو رہے ہیں اُس پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔

دوسرے حصّے میں انہوں نے اسلام کے نظریاتی پہلوؤں سے بحث کی ہے۔ اسلام، انسان کے ذہن و عقل پر کس طرح صحت مندانہ اثر ڈالتا ہے، کیسی صاف ستھری اور پاکیزہ زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتا ہے، کس نوعیت کے آداب و اطوار دیتا ہے، اُس کی تہذیب و ثقافت کا حقیقی رنگ کیا ہے، فنونِ لطیفہ میں کس قسم کی رہنمائی دیتا ہے، مسلمان عورت کو معاشرے میں کون سا مقام عطا کرتا ہے اور اسلامی معاشرے کو وجود میں لانے کے لیے کن امور کو ضروری قرار دیتا ہے؟ ان سوالات پر بڑی فکر انگیز بحث کی گئی ہے۔

تیسرے حصّے میں دنیائے اسلام کی ان تمام تحریکوں کا جائزہ لیا ہے جو اٹھارہویں صدی سے اب تک اسلام کو عملاً برپا کرنے کے لیے کام کرتی رہی ہیں۔ ان کے علاوہ ان

اسلامی شخصیتوں کی جدوجہد کا تجزیہ بھی کیا جنہوں نے اس مقصد کے پیشِ نظر کام کیا اور مسلمان معاشرے کے فکر و ذہن پر گہرے اثرات ثبت کیے۔

آخری حصے میں مغربی دنیا میں اسلام اور مشنری تحریکوں کی سعی و جہد کا جائزہ لیا ہے۔ اہلِ علم مسلمانوں پر جو فرض داری عائد ہوتی ہے، اُس کا ذکر کیا ہے اور اس بات سے بحث کی ہے کہ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے امکانات کس حد تک ہیں۔ مختصر یہ کہ پوری کتاب اپنے اندر فکر انگیز مباحث رکھتی ہے۔ مصنفہ کی راست فکری اور غیر مرعوبانہ ذہن بجائے خود ان پشتینی مسلمانوں کے لیے بے حد سبق آموز ہے جو اسلام کا مطالعہ اور اُس کا دفاع سخت مرعوبانہ ذہنیت سے کرتے ہیں۔ مصنفہ کا دل اُس جوش و جذبے اور عقیدت سے پوری طرح معمور ہے جو ہر زمانے میں نومسلموں کی سب سے بڑی خصوصیت رہی ہے اور اُس کا اظہار اُن کی اس کتاب میں بھی ہوتا ہے۔ فکر و نظر کی طرح مصنفہ کا اندازِ بیان بھی واضح، موثر اور دل نشین ہے۔

جہاں تک ترجمہ کا تعلق ہے، میں نے کوشش کی ہے کہ بنیادی طور پر ترجمہ ہی رہے، لیکن زبان و ادب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے۔ اس کے ساتھ ساتھ اصل تحریر میں جو تیقن اور جوش و جذبہ پایا جاتا ہے وہ ترجمے میں بھی برقرار رہے۔ میں اس کوشش میں کہاں تک کامیاب رہا اس کا فیصلہ اہلِ نظر ہی کر سکتے ہیں۔ ایک آدھ مقامات پر ناگزیر سمجھتے ہوئے حواشی بھی دے دیئے ہیں۔

وما توفیقی الا باللہ۔

۲۹ جمادی الثانی ۱۳۸۹ھ
مطابق
۱۲ ستمبر ۱۹۶۹ء

آباد شاہ پوری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

یہ کتاب مختلف مقالات پر مشتمل ہے۔ یہ مقالات ان تعلیم یافتہ غیر مسلموں کے لیے قلمبند کیے گئے ہیں جو یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ایک سچا مسلمان اسلام کو کس زاویۂ نظر سے دیکھتا ہے اور اس کے نزدیک اپنے دین کا حقیقی مفہوم کیا ہے۔ نیز ان مقالات کا مقصد ان نسلی مسلمانوں کو صحیح اسلام سے رُوشناس کرنا ہے جو اپنی مغربی تربیت کی بدولت بے آمیزش یقین و اعتقاد سے محروم ہو چکے ہیں۔ یہ کتاب اسلامی تعلیمات کی کسی جامع و وسیع تحقیق پر مبنی نہیں ہے، کیونکہ یہ کام بہت سے مسلمان علماء پہلے ہی باحسن و خوبی کر چکے ہیں۔ درحقیقت اس کتاب میں اسلام کے صرف اُن گِنے چُنے پہلوؤں کو لیا گیا ہے، جن پر میری حقیر رائے میں انگریزی زبان میں خاطر خواہ بحث نہیں کی گئی۔ تعارف میں مَیں نے ان اسباب سے پردہ اُٹھانا چاہا ہے جن کی بناء پر مَیں نے اپنے آبائی دین، مسیحیت اور لا ادریا انسان دوستی (Agnostic Humanism) کو خیرباد کہا اور اُس پر اسلام کو ترجیح دی۔ کتاب کا دُوسرا حصہ اسلام کے ان پہلوؤں سے بے لاگ اور غیر معذرت خواہانہ انداز میں بحث کرتا ہے جنہیں آج کا جدید ذہن قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ تیسرے حصے میں بتایا گیا ہے کہ موجودہ دَور میں اسلام کو عملی جامہ پہنانے کی جدوجہد عملاً کس طرح ہو رہی ہے۔

اس طرح یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام جو نظامِ حیات دیتا ہے وہ محض ایک "از کار رفتہ طاقت" نہیں ہے جس کی اختراعیت ایک ہزار برس پہلے ختم ہو چکی ہے، بلکہ اس کے برعکس اسلامی نشاۃِ ثانیہ کا شوق و جذبہ روز بروز قوی تر ہوتا جا رہا ہے۔ "حرفِ آخر" میں دُنیا بھر میں اسلامی نشاۃِ ثانیہ کے امکانات اور ان تدابیر کا جائزہ لیا گیا ہے جو اس مشن کو حقیقت کا رُوپ عطا کرنے کی جدوجہد میں انتہائی ممد ثابت ہو سکتے ہیں۔

اس کتاب کا پہلا انگریزی ایڈیشن ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا تھا۔ بعدازاں اس پر نظرثانی کی گئی، بعض نئے مقالات لکھے گئے اور بعض میں حذف و اضافہ کیا گیا۔ اُردو ترجمہ اسی دوسرے ایڈیشن کا پیش کیا جا رہا ہے۔

مریم جمیلہ
(سابق مارگریٹ مارکس، نیویارک)

لاہور
۲۵ جمادی الاوّل ۱۳۸۷ھ
بمطابق
یکم ستمبر ۱۹۶۷ء

تعارف

یہودیت سے اسلام تک

بہت چھوٹی عمر ہی سے مجھے یہ معلوم کرنے کا اشتیاق تھا کہ یہودی ہونے سے کیا مراد ہے۔
یہ اشتیاق پہلے پہل غالباً ایسٹر کے زمانے میں پیدا ہوا۔ ایسٹر کے دن آتے تو میرے مسیحی ہم جماعت مجھے "مسیح کی قاتل" کہنا شروع کر دیتے۔ ایسٹر گزرتے ہی گویا معجزہ رُونما ہو جاتا۔ وہ لوگ یکسر بدل جاتے اور سال کے باقی دن بڑے خوش گوار اور دوستانہ ماحول میں گزرتے۔ ایک مرتبہ میں نے ایک چھوٹے سے رومن کیتھولک ہم جماعت سے اِس طرزِ عمل کا سبب پُوچھا تو اس نے جواب دیا کہ ہمیں پادری صاحب نے کہا تھا۔

اسی زمانے میں اخبارات میں اور ریڈیو پر جنگ کی خبریں پے در پے آنے لگیں۔ دوسری عالمگیر جنگ چھڑی تو میں پانچ برس کی تھی اور جب ختم ہوئی تو گیارہویں برس میں جا رہی تھی۔ ہٹلر کی نازی حکومت کے ہاتھوں لاکھوں یہودیوں کے استیصال کی خبریں بڑی ہی وحشتناک اور روح فرسا تھیں اور کم سنی کے باوجود میرے ذہن پر ایک مستقل نقش چھوڑ گئیں۔ پھر میری اور دوسری غیر یہودی ہم جولیوں کی ظاہری شکل و صورت میں بھی خفیف سا مگر نمایاں فرق تھا۔ ان ساری باتوں نے مجھے یقین دلا دیا کہ یہودی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہم دوسرے لوگوں سے "مختلف" ہیں اور ہمارا اس معاشرے سے فی الواقع کوئی تعلق نہیں ہے جس کا ہم

اپنے آپ کو حصّہ سمجھتے ہیں۔

جب میں زندگی کی نویں اور دسویں منزل میں تھی، پورے دو برس ہفتہ وار مذہبی تعلیم کے دَوران میں اپنے حقیقی نام ونشان کی تلاش کا خیال میرے دل و دماغ پر حاوی رہا؛ چنانچہ انگریزی میں یہودی قوم کے متعلق جس قدر کتابیں مجھے مِل سکیں مَیں نے بڑے حریصانہ ذوق و شوق کے ساتھ پڑھ ڈالیں۔ تھوڑی ہی مدّت میں یہودیوں کی المناک تاریخ میرے لیے اس قدر جانی بُوجھی تاریخ بن گئی کہ اُس سے متعلق صفحۂ قرطاس پر اُبھرنے والی خیالی تصویریں بسااوقات اپنے گرد و پیش پھیلی ہوئی حقیقی زندگی سے بھی زیادہ حقیقی نظر آتیں ——— ایک ننھا سا لڑکا آلتی پالتی مارے بیٹھا ہے۔ تلمود کی ایک جلد آگے رکھی ہے اور پڑھ رہا ہے۔ سر پر مخمل کی ٹوپی ہے۔ کانوں تک لمبے بال ہیں۔ بڑی بڑی کالی آنکھوں سے حُزن وملال ٹپک رہا ہے۔ صبح سے شام تک وہ اپنے اسباق میں مستغرق رہتا ہے۔ یہ قرونِ وسطیٰ کے یورپ کے ممتاز ترین یہودی فاضل راشی (Rashi) کے بچپن کی تصویر ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ موسیٰ ابن میمون ہے۔ ایک اور نامی گرامی یہودی مفکر۔ صلاح الدّین کا طبیبِ خاص موسیٰ اپنے ایک دوست کو خط لکھ رہا ہے جس میں قاہرہ کے کشمن اور مصروف شب و روز کا ذکر ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مسلم سپین میں یہودی کلچر کا درخت بہار پر ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر جور و تعدّی، تعذیب و عقوبت اور قتلِ عام کا مسلسل چکر چل پڑتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ ہے سپینی کلیسا کی عدالتِ احتساب۔ اور یہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یورپ کے یہودیوں کو عام آبادی سے کاٹ کر غیتو میں دھکیلا جا رہا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

نیویارک میں میری خلیری بہن کے گھر کے سامنے، سڑک کے پار ایک ربانوی درس گاہ تھی۔ یہاں متدیّن والدین اپنے چھوٹے بچوں کو مذہبی تعلیم کے لیے بھیجا کرتے تھے۔ بچے مخملی ٹوپی سر پر اوڑھے، کانوں تک لمبے بال لہرائے، عبرانی کتابوں کا پلندہ اٹھائے درس گاہ جاتے اور دن بھر قطار میں بیٹھے آگے پیچھے جھُوم جھُوم کر بلند لَے میں تورات اور تلمود پڑھتے رہتے۔

ہمارے کالی سیاہ داڑھی والے اُستاد بڑے سخت گیر تھے۔ نظم و ضبط کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ ایک لمبا سا موٹا ڈنڈا اُن کے ہاتھ میں ہوتا اور سُست اور کام چور شاگردوں کی خبر لینے کے لیے ہروقت مستعد رہتے۔ پھر سیناگاگ کے ماتمی گیت تھے جنہیں ہم ہمیشہ اندوہگیں لَے میں گایا کرتے تھے۔

یہ سارے تجربات ہرچند میرے بچپن کا اہم حصّہ بن چکے تھے، لیکن میرا گھرانا اس دنیا سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ مَیں ایک کٹر مذہبی گھرانے میں نہیں، "اصلاح یافتہ" گھرانے میں پیدا ہوئی تھی جو مسیحی معاشرہ میں بڑی حد تک جذب ہو چکا تھا۔ میرے والدین یہودی شریعت پر عمل کرتے تھے نہ میرے قریبی رشتہ دار۔ امریکہ میں بسنے والے یہودیوں کی غالب اکثریت اصلاحی ہے، مگر اُنکے برعکس ہمارا گھرانا جرمن تھا۔ ہم لوگ روسیوں کی طرح جبر و تشدد اور قتلِ عام کے نکالے ہوئے نہ تھے بلکہ سو سوا سو سال پہلے اقتصادی ترقی کی تلاش میں اپنی مرضی سے امریکہ چلے آئے تھے۔ مشرقی یورپ کے یہودیوں کی طرح جرمنی کے یہودی غیتو کی الگ تھلگ زندگی سے نکل کر نہیں آئے تھے بلکہ وہ مسیحی معاشرہ میں ضم ہو چکے تھے۔ میری پڑدادی جو شکل و صورت میں جرمن خواتین کیطرح حسین، دراز قامت اور گورے رنگ کی تھیں، کرسمس ہمیشہ بڑی دُھوم دھام سے مناتی تھیں۔ اس تقریب پر وہ اپنے بیٹے بیٹیوں اور اُن کے بچوں کو بڑے اہتمام سے تحفے تحائف دیتیں اور بڑا سا شجرِ عید آراستہ کرتی تھیں۔

ہم اصلاح یافتہ یہودی اپنے عبادت خانوں کو "سیناگاگ" (Synagogue) نہیں ٹمپل (Temple) کہا کرتے تھے۔ ان ٹمپلوں میں عبادت پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے طرز پر ہوا کرتی۔ تربیت یافتہ پیشہ ور مرد و زن کا مخلوط طائفہ مشہور و معروف مسیحی مناجاتیں بڑی سُریلی دُھن میں گاتا۔ اس طائفے میں متعدد مسیحی بھی ہوتے۔ مناجاتوں کے وہ سارے الفاظ بدل ڈالے گئے تھے جن سے یہودی حاضرینِ اجتماع کے جذبات مجروح ہوتے تھے۔ ہماری دُعائیں تقریباً سب کی سب انگریزی زبان میں تھیں۔ ان میں عبرانی کے الفاظ نہ ہونے کے برابر تھے۔ جو احکام راسخ الاعتقاد یہودیوں کے نزدیک واجب العمل تھے اُن کی پابندی ہمارے لیے لازمی نہ تھی۔ اصلاح یافتہ رہنما انہیں فرسودہ اور جدید زندگی

کے لیے بیکار سمجھتے تھے۔ ہمارے گھر کی فضا پڑوس کے مسیحی گھروں سے ذرا بھی مختلف نہ تھی۔ ہم بھی راسخ الاعتقادی سے اتنے ہی بیگانہ تھے جتنا کہ ہمارے پڑوسی۔ بس ایک چیز نے ہمارے یہودی تشخص کو معدوم ہونے سے بچا رکھا تھا اور یہ بات بجائے خود حیران کن تھی۔ مسیحی معاشرہ میں "انضمام" کے باوجود ہم لوگوں میں مسیحیوں کے ساتھ شادی بیاہ کا رواج نہ تھا۔ اسی طرح ہمارے معاشرتی تعلقات بھی اپنی ہی نسل و قوم تک محدود رہتے تھے۔

مجھے اصلاح یافتہ یہودیت سے سخت نفرت تھی۔ میرے نزدیک وہ جدید مغربی زندگی کا رنگ ڈھنگ اختیار کرنے کی کوشش میں کھوکھلی اور بے معنی باتوں کا مجموعہ بن کر رہ گئی تھی۔ مقدس شریعت سے کلیتًا اعراض کے نتیجے میں اس کے پیرو محض برائے نام یہودی رہتے تھے۔ تحریکِ اصلاح نے فی الحقیقت یہودیت کو اس کی رُوح اور معنویت سے عاری کر دیا تھا اور نام کے سوا اُس کے دامن میں کوئی شے باقی نہ چھوڑی تھی۔ اکثر اصلاح یافتہ یہودی، جنہیں میں جانتی تھی، ملحد تھے۔ یہ لوگ چند ایک یہودی رسوم سے محض عادات، خاندانی روایات یا معاشرتی مجبوریوں کی بنا پر چپٹے ہوتے تھے۔

تحریکِ اصلاح کا مقصد ان یہودیوں کو گرویدہ بنانا اور سنبھالنا تھا جو بصورتِ دیگر مسیحی معاشرہ میں اس طرح مدغم ہو جاتے کہ یہودی تشخص کا کوئی نشان باقی نہ رہتا۔ چنانچہ یہودیت کو صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے ایک نئے سانچے میں ڈھال کر ہم عصر امریکی زندگی کے مطابق بنا دیا گیا۔ تحریکِ اصلاح کے اس تصور کا جبلی بودا پن مجھ پر جلد ہی آشکارا ہو گیا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ یہ تحریک یہودیوں کے ثقافتی انضمام کو روکنے میں نہ صرف ناکام رہی ہے بلکہ اس نے اُلٹا اِس عمل کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ تارکِ وطن یہودیوں کی پہلی پود، خصوصًا وہ جو مشرقی یورپ سے تعلق رکھتی تھی، اپنے عقائد میں بڑی پختہ، پرجوش اور مخلص تھی، تاہم ان کے بچوں کا طرزِ عمل بالکل مختلف تھا۔ انہوں نے پبلک سکولوں میں تعلیم پائی تھی اور امریکی طرزِ زندگی کو اپنا لیا تھا۔ یہودی قانون اور

مذہبی مراسم عام فضا میں اس قدر اجنبی بن گئے تھے کہ جب بزرگوں نے ان قوانین و رسوم کو اپنی نوخیز نسل پر بجبر نافذ کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے قوانین و رسوم اور بزرگوں کے اقتدار دونوں کے خلاف بغاوت کر دی، تاہم "یہودی ہونے" کے تصور سے اُن کی وابستگی بڑی گہری تھی اس لیے یہودیت کو کامل طور سے خیرباد کہہ دینے کے بجائے وہ اصلاح یافتہ ٹمپل کے رُکن بن جاتے۔ اس سے اُن کی معاشرتی حیثیت بھی قوم کی نظر میں خاصی بڑھ جاتی کیونکہ اصلاح یافتہ ٹمپل میں شرکت کے لیے روپیہ درکار تھا اور رُکنیت صرف بالائی طبقات تک محدود تھی۔ تیسری نسل نہ صرف یہودیت کی رُوح اور اس کے مضمرات بلکہ نام کو بھی ترک کر دینے کے لیے بے قرار تھی، چنانچہ جب میں جوانی کی عمر کو پہنچی تو میرے والدین اُس آخری رکاوٹ کو بھی رفع کر چکے تھے جو انہیں غیر یہودی قوم سے الگ کرتی تھی۔ وہ ایک لاادری (Agnostic) انسان دوست تنظیم ایتھیکل کلچرل سوسائٹی (Ethical Cultural Society) میں شامل ہو گئے۔ چند سال بعد وہ اس تنظیم سے اس لیے غیر مطمئن ہو گئے کہ اس کے ارکان کی غالب اکثریت یہودی نژاد تھی، چنانچہ ایک نواحی یونیٹیرین چرچ (Unitarian Church) میں شمولیت اختیار کر لی۔ اگرچہ اس چرچ نے مسیحیت کی ظاہری سج دھج کو ہاتھ سے جانے نہ دیا تھا تاہم اس کے تصورات ایتھیکل کلچرل سوسائٹی سے مماثل تھے۔ میری بڑی بہن نے جب دیکھا کہ امی اور ابا یونیٹیرین بن کر بے حد مطمئن اور مسرور ہیں تو اس نے بھی فورًا اپنے شوہر سمیت ان کی پیروی کی۔ اس کے دو بچے غالبًا اب اپنا شمار کبھی یہودیوں میں نہ کریں گے حتیٰ کہ ان کے نام سے بھی ظاہر نہ ہو گا کہ وہ ایک یہودی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس طرح جذب و انضمام کا عمل مکمل ہو گیا۔

اصلاح یافتہ یہودیوں میں یہ مفروضہ عام ہے کہ یہودی مظلوم و ستم رسیدہ قوم اس لیے ہیں کہ وہ اپنے پڑوسیوں سے "مختلف" ہونے پر اصرار کرتے ہیں۔ اسی اختلاف؟

کو رفع کر دیا جائے تو ساری عداوت اور آویزش جاتی رہے گی۔ مَیں نے اس طرزِ استدلال کو کبھی مؤثر نہ پایا۔ خصوصاً جب کہ مجھے خوب علم تھا کہ ہٹلر کی نازی حکومت کے تحت انسانی باڑوں (concentration camps) میں جو ۶۰ لاکھ سے زائد یہودی مارے گئے تھے ان کی اکثریت اسی طرح کا ملاً ضم شدہ "تھی جس طرح کہ ہم۔

یہودیوں اور عربوں کی باہمی قرابت میرے لیے بچپن ہی سے مسحور کن تھی۔ یہودی کتابوں میں مَیں نے پڑھا تھا کہ ابراہیم علیہ السلام ان دونوں قوموں کے باپ ہیں۔ یہودی ان کے بیٹے اسحاق (علیہ السّلام) کی اولاد ہیں اور عرب اپنا سلسلۂ نسب اُن کے بڑے بیٹے اسمٰعیل (علیہ السّلام) کے ساتھ جوڑتے ہیں۔ کیا یہ محض ایک افسانہ تھا یا حقیقت؟ امریکہ میں "سامی دشمنی" کی اصطلاح یہودیوں سے نفرت اور بغض وعناد کے ساتھ مخصوص ہو چکی ہے۔ اس لفظ کا اطلاق کبھی عربوں کے سلسلے میں نہیں ہوتا؛ تاہم جغرافی خصوصیات، طبعی ہیئت اور تہذیب وثقافت کی اصطلاح میں عرب کہیں زیادہ خالص "سامی" ہیں۔ یورپ میں صدیوں اقامت کی وجہ سے یہودیوں کی ارثی خصوصیات کی طرح عربوں کے ساتھ رشتہ داری کا رنگ بھی اگرچہ پھیکا پڑ چکا ہے تاہم اساسی طور پر یہ یک جدّی قرابت اب تک باقی ہے۔ مَیں بہت سے یہودیوں کو جانتی ہوں اور ان میں سے بعض میرے اپنے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، جو خدّوخال کے اعتبار سے بالکل عرب نظر آتے ہیں۔ ایسے عرب جو اگرچہ بطور مفروضہ ہی سہی، خالص یورپی نژاد ہوں۔

۱۹۴۸ء کی جنگِ فلسطین کے دوران امریکہ میں صہیونی پروپگنڈا اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ ریڈیو اور اخبارات کے ذریعے صہیونیوں کے حق میں رائے عامہ کو ہموار کرنے کیساتھ ساتھ عربوں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکانے کی منظم مہم انتہا پر تھی۔ میں نے صہیونی پروپگنڈے کی فریب کاری اور بودے پن کو خود بخود بھانپ لیا۔ عربوں کے ساتھ میری روز افزوں ہم آہنگی سے میرے گھر والے دہشت زدہ ہو گئے۔ عربوں کی تاریخ اور ان کی تہذیب وثقافت

سے متعلق پبلک لائبریری میں جس قدر کتابیں ملیں مَیں نے پڑھ ڈالیں۔ باوجودیکہ ان کتابوں کے اکثر مصنفین کا لب ولہجہ غیر ہمدردانہ بلکہ بڑی حد تک معاندانہ تھا۔ ان کے مطالعے سے مجھے یقین ہو گیا کہ عربوں کے خلاف صہیونیوں کا پروپگنڈا یکسر ناانصافی پر مبنی ہے۔ اُن دنوں مَیں عربوں کے متعلق جو بات بھی پڑھتی اس سے از حد متاثر ہوتی حتیٰ کہ ٹھیک وہ خصوصیات جو ایک عام یورپی اور امریکی کو ناگوار گزرتی ہیں مجھے دل کش معلوم ہوتی تھیں۔

سال پر سال گزرتے چلے گئے۔ اس عرصے میں بتدریج یہ حقیقت مجھ پر آشکارا ہو گئی کہ عربوں نے اسلام کو سر بلند نہیں کیا بلکہ اسلام نے عربوں کو عظمت عطا کی۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم مبعوث نہ ہوتے تو عرب آج قطب شمالی کے ایسکیمو اور جنوبی افریقہ کے زولو قبائل کی طرح گمنام اور پردۂ تاریکی میں مستور ہوتے۔ اسی طرح قرآنِ کریم عربی زبان میں نازل نہ ہوتا تو آج عربی اگر ناپید نہیں تو دنیا کی غیر اہم اور بے مایہ زبانوں میں شمار ہوتی۔ چونکہ ہمارے رسولِ پاکؐ عرب تھے اور قرآنِ کریم عربی زبان میں نازل ہوا اس لیے دنیا کا ہر مسلمان، خواہ وہ کسی قوم اور نسل سے تعلق رکھتا ہے، ثقافت کے اعتبار سے عرب ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

"عربوں سے تین امور کی بنا پر محبت کرو۔ مَیں عرب ہوں، قرآنِ کریم عربی میں ہے اور اہلِ جنّت کی زبان عربی ہو گی۔" (بیہقی)

ہمارے بہت سے جدید تعلیم یافتہ حضرات اسلام کی ان ہدایات کو رد کر دیتے ہیں جو عرب ماخذ کی مظہر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ہدایات مقامی نوعیت کی ہیں اور اُس خاص دَور کی سوسائٹی سے تعلق رکھتی ہیں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بود وباش رکھتے تھے۔ اُس سوسائٹی کے لیے تو یہ معقول اور صحیح تھیں، لیکن اب فرسودہ ہو چکی ہیں، اس لیے انہیں ترک کر دینا چاہیئے؛ تاہم سچے اور مخلص مسلمانوں کے نزدیک حضورؐ کا

عرب ہونا کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھا۔ اللہ چاہتا تو ہمارے نبیِ آخر یونانی، رومی یا انگریز بھی ہو سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ساری قوموں کو چھوڑ کر اگر ایک عرب کو خاتم النبیین بنایا تو اُس کی اس مشیت کے پیچھے یقیناً کوئی معقول سبب کارفرما تھا۔

یہودیت اور اسلام کے درمیان روحانی رشتہ اسلام اور عیسائیت سے زیادہ مُحکم اور گہرا ہے۔ یہودیت اور اسلام دونوں توحید کے قائل ہیں اور اس میں کسی قسم کی مصالحت یا مداہنت روا نہیں رکھتے۔ دونوں شریعتِ الٰہی کی کڑی پابندی کو نہایت اہم سمجھتے ہیں اور اسے خالقِ کائنات کی اطاعت و محبت کا نشان قرار دیتے ہیں۔ دونوں پروہت گری، تجرّد اور رہبانیت کو مسترد کرتے ہیں۔ اسی طرح عبرانی اور عربی دونوں زبانوں میں بڑی نمایاں اور مؤثر مشابہت پائی جاتی ہے حتیٰ کہ روایاتی راسخ الاعتقاد یہودیت اور اسلام جو ثقافتی فضا اور ماحول پیدا کرتے ہیں وہ بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ نیویارک کی ربّانوی درس گاہ میں تورات اور تلمود کی تلاوت کرنے والے ننھے لڑکے اپنے آپ کو کسی مسجد کے مکتب میں اجنبی محسوس نہیں کریں گے۔ علیٰ ہذا القیاس مقدس قانون پر بحث و تمحیص کرنے والے فاضل علماء کی مجلس میں ایک یہودی خود کو اپنے گھر میں محسوس کرے گا۔

یہودیت میں مذہب قوم پرستی کے ساتھ اس قدر خلط ملط ہو چکا ہے کہ ان دونوں کے درمیان بمشکل امتیاز کیا جا سکتا ہے۔ یہودیت کا لفظ "یہودا" سے ماخوذ ہے جو ایک قبیلے کا نام ہے۔ ایک یہودی یہودا قبیلے کا فرد ہوتا ہے۔ اس مذہب کے نام سے بھی ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ کوئی عالمگیر پیغام اپنے دامن میں رکھتا ہے۔ کوئی یہودی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور نوعِ انسانی کی رہنمائی کے لیے اُس کے نازل کردہ پیغام پر ایمان رکھنے اور اُس کی پیروی کو تقاضائے ایمان سمجھنے کی بنا پر یہودی نہیں ہوتا بلکہ وہ اس لیے یہودی ہے کہ یہودی ماں باپ کے گھر میں پیدا ہوا ہے۔ اب چاہے وہ

کھلے بندوں ملحد بن جائے اپنے یہودی بھائیوں کی نظر میں یہودی ہی رہے گا۔

اس فسادِ کامل نے قوم پرستی کے ساتھ مل کر یہودی مذہب کو روحانی طور پر مفلس و قلاش کر دیا ہے۔ خدا پوری نوعِ انسانی کا خدا نہیں ہے بلکہ صرف اسرائیل کا خدا ہے۔ کتابِ مقدس اللہ کی نازل کردہ وحی نہیں ہے جو پوری نوعِ انسانی کی طرف بھیجی گئی ہے بلکہ بنیادی طور پر یہودیوں کی تاریخ ہے۔ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ رسول نہ تھے بلکہ محض یہودی بادشاہ تھے۔ یہودیوں کی نجات کا انحصار آخرت میں کامیابی پر اتنا نہیں ہے جتنا کہ فلسطین کی واپسی پر ہے۔ یہودی جس قدر تہوار مناتے ہیں، مثلاً: حنوکہ، پوریم اور پساش وغیرہ، سب مذہب سے زیادہ قومی اہمیت کے حامل ہیں۔ صرف ایک تہوار خالص مذہبی نوعیت کا ہے اور وہ ہے یوم کپر (یوم کفارہ)۔ اس قوم پرستی ہی کی بنا پر یہودیوں نے حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ علیہما السلام پر ایمان لانے سے انکار اور انہیں بدعتی قرار دے کر ذلیل و رسوا کیا، کیونکہ یہ حضرات جو عالمگیر پیغام دے رہے تھے وہ یہودیوں میں عام پھیلے ہوئے قومی جذبے سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے رسالت کا منصب لے لیا اور ان کے ایک جدّی قرابت داروں یعنی عربوں کو عطا کر دیا۔

توقع کے عین مطابق یہودیوں نے ہمارے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی دعوت کو ماننے سے انکار کیا اور شدّ و مدّ سے مخالفت کی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا رسولؐ ایک اُمّی عرب کو منتخب کر لیا تھا۔ یہ یہودیوں کی قومی خود پسندی پر ناقابلِ برداشت ضرب تھی۔ اس ضرب کی شدّت کا اندازہ آج بھی یہودیوں کی تحریروں سے کیا جا سکتا ہے:

(*The Pictorial History of the Jewish People*) کا مصنّف (Nathan Ausbel) لکھتا ہے:

"عیسویت کی طرح مذہب اسلام بھی، جس کی بنیاد محمدؐ نے ساتویں صدی عیسوی میں رکھی تھی، یہودی مذہب کی ایک شاخ تھا۔ یسوعؑ کی طرح محمدؐ کے پیشِ نظر بھی کسی نئے مذہب کی بنا ڈالنا نہ تھا۔ درحقیقت انہوں نے "یہودی پیغمبر" ہونے کا اعلان کیا تھا .... یہ یقین و اذعان تھا یا مصلحت ـــــــ ایک محرک جس سے وہ کسی صورت بیگانہ نہ تھے ـــــــ محمدؐ کی پیغمبرانہ زندگی کے آغاز میں عرب کے یہودی ان کی دعوت کے خصوصی مخاطب تھے۔ انہوں نے قرآن کے لیے بیانیہ مواد اور اصول و مبادی تلمود اور مدرش سے مستعار لیے، لیکن بڑے عجیب مسخ شدہ انداز میں۔ شعری و لطافتوں سے بھرپور) سورتیں تالیف کرتے وقت انہوں نے آدم، ابراہیم، لوط، یوسف، موسیٰ، ساؤل، داؤد، سلیمان، ایلیاہ، ایوب اور یونس وغیرہ کے قصص توریت سے لیے .... لیکن جب مدینہ کے یہودیوں نے جو اپنی مقدس کتابوں سے اچھی طرح واقف تھے، ان کی تورات کا یُرفریب پردہ چاک کرنا چاہا تو محمدؐ نے پہلے تو ان کے ربّیوں سے زبردست بحث و تکرار کی اور پھر ان سے منہ موڑ لیا۔ فرشتہ جبریل دوبارہ اُن کے پاس آیا اور قبلہ یروشلم سے مکّہ تبدیل کر دینے کا حکم دیا۔ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ محمدؐ نے یہودیوں کی توہین آمیز زبانی باتوں کا انتقام قتل و غارت کی صورت میں لے لیا۔ عرب میں اگرچہ یہودیوں کی کثیر التعداد بستیاں تھیں اور سب کی سب بیحد مستحکم تھیں، لیکن انہوں نے ہوشیاری اور پے بہ پے خونخوار حملوں سے کام لے کر ان پر قبضہ کر لیا۔ ہزاروں یہودیوں کی گردن ماردی اور ہزاروں کے ہاتھ پیر کاٹ ڈالے لے۔"

لے صفحہ ۹۳

چنانچہ اسلام اور اسلامی افکار و تصورات کے ساتھ میری روز افزوں ہم خیالی کو دیکھ کر میرے واقف کار یہودی غضب ناک ہو گئے۔ ان کے نزدیک میں نے اُن سے سخت دغا کی تھی۔ وہ مجھے بے غیرت قرار دیتے اور کہتے کہ میرا یہودیت سے انکار اپنی آبائی میراث اور یہودی قوم سے شدید نفرت کا نتیجہ ہے۔ وہ مجھے متنبہ کرتے کہ میں نے مسلمان ہونے کی کوشش کی تو اہلِ اسلام مجھے کبھی دل سے قبول نہیں کریں گے۔ یہ خدشات کلیتًا بے بنیاد ثابت ہوئے۔ آج تک کسی مسلمان نے مجھ پر یہودی النسل ہونے کی بنا پر انگشت نمائی نہیں کی جب میں مشرف با سلام ہوئی تو مسلمانوں نے بڑے جوش و خروش سے میرا خیر مقدم کیا اور اس طرح پیش آئے گویا میں انہی میں کی ایک فرد تھی۔

آج یہودی سب سے زیادہ اس بات پر سرِ افتخار بلند کرتے ہیں کہ وہ صدیوں مسلسل جبر و ظلم کی چکّی میں پسنے اور بے دردانہ ذبح کیے جانے کے باوجود بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ وہ یہ لاف زنی کرتے ہوئے بھی نہیں تھکتے کہ دوسری بے شمار قومیں جو دولت اور تعداد میں اُن سے کہیں زیادہ طاقتور تھیں صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں، لیکن اُن کا وجود بڑے فاتحانہ انداز میں باقی رہا۔ چونکہ یہودیت کا مذہبی پہلو کمزور پڑ چکا ہے اور خود یہودی بھی لادینیت اور مادہ پرستی کا شکار ہو گئے ہیں اس لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بے شک یہودی بچ نکلے ہیں، مگر کس مقصد کی خاطر؟ میری مرز بوم میں ایک یہودی بھی ایسا نہیں ہے جس نے اس سوال کا جواب دینا تو درکنار کبھی اپنے آپ سے پوچھنے کی زحمت بھی گوارا کی ہو جیسا کہ ہر کہیں نئی روشنی کے یہودیوں کا نقطۂ نظر ہے وہ لوگ بھی محض حیاتیاتی اور لادینی سیاسی مفہوم میں زندہ بچ رہنے کو کافی سمجھتے ہیں۔ اسے ستم ظریفی ہی کہہ سکتے ہیں۔ یہ "ربّانیوں" "خادمانِ دین" اور "خُدا کے برگزیدہ بندوں" کی وہ قوم ہے جس کا مقصدِ حیات دُنیا کو خدا کی وحدانیت کے علم اور اُس کے مقدس فرامین کے نُور سے منوّر کرنا تھا۔

مَیں نے اِسلام اپنے اجداد کی میراث اور اپنی قوم سے نفرت کی بنا پر قبول نہیں کیا۔ میری اس خواہش کے پیچھے استرداد سے زیادہ تکمیل کا جذبہ کار فرما تھا۔ میرے لیے اس کا مطلب ایک جاں بلب اور محدود مذہب کو چھوڑ کر ایک ایسے متحرک اور انقلابی مذہب کو اپنانا تھا، جو عالمگیر اقتدار اعلیٰ سے کم تر کسی چیز پر قناعت نہیں کرتا؛ چنانچہ بنی اسرائیل ہی کے ایک اور فرد کی زبان میں، جس نے وہی راہِ سفر اختیار کی جس پر مَیں گامزن ہوں، کہہ سکتی ہوں:

> "میرے جدِّ اعلیٰ ابراہیم، مجھے یہاں (مکہ میں) دیکھ کر میری آمد کا مقصد بخوبی سمجھ لیتے۔ ان کے رفیع الشان پُرجلال تجربے کے لیے میرا یہ حقیر و ناتواں اضطراب کوئی معمہ نہ ہوتا۔ وہ فوراً جان لیتے، جیسا کہ اب میں جان چکا ہوں، کہ میرے دُور دراز کے سفروں کا مقصد ایک ایسی دُنیا سے وصال کی منفی خواہش میں پایا جاتا ہے، جس کی زندگی کے عمیق ترین مسائل بلکہ خود حقیقت تک رسائی کا انداز ان تمام طور طریقوں سے بالکل مختلف ہے جن کا میں اپنے بچپن اور نوجوانی کے دنوں میں خوگر رہا تھا۔ پھر میرا عرب کی اس سرزمین میں آنا کیا حقیقت میں اپنے گھر واپس آنے کے مترادف نہ تھا؟ ہاں، کیا یہ مراجعت وطن نہ تھی؟ رُوح کی مراجعتِ وطن، جو ہزاروں سال پیچھے مُڑ مُڑ کر اپنے پُرانے گھر کی تلاش میں مصروف رہی تھی۔ ہاں میرا یہ سفر اس عرب آسمان کی خاطر تھا، جو کسی بھی دوسرے آسمان سے زیادہ سیاہی مائل، زیادہ بلند، زیادہ ستاروں سے بھر پُور اور بارونق ہے۔ جو میرے اجداد کی طویل نقل مکانی پر محرابی چھت بنائے کھڑا ہے .... اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ میرا راستہ اپنی ساری طوالت کے باوجود کتنا آسان اور سیدھا تھا ـــــــ وہ راستہ جو ایک ایسی دنیا سے جو میری نہ تھی اُس دُنیا کی طرف جاتا ہے جو فی الحقیقت میری اپنی تھی۔"[1]

---

[1] *The Road to Mecca*, Muhammad Asad (formerly Leopold Weiss), Max Rheinhart, London, 1954, pp. 49-50

مسیحی لادینیت
اِسلامی اقدار کی روشنی میں

مسیحیت نے لادینیت کو اصولاً اپنا لیا ہے اور یہی نہ پٹ سکنے والی خلیج مسیحیت کو اسلام سے الگ کرتی ہے ۔ لادینیت سے مراد وہ فلسفہ ہے جو انسانی زندگی کے صرف چند منتشر اجزاء پر مذہب کا حقِ اختیار تسلیم کرتا ہے اور اجتماعی زندگی سے متعلق معاملات کو بالصراحت اُس کے فیصلہ کن اثر سے خارج کر دیتا ہے ۔ لادینیت جو مذہب کو انسان کے خالص نجی اور انفرادی معاملے تک محدود رکھتی ہے ، موجودہ مغربی تہذیب کی بُنیاد اور اسلامی اصول و مبادی سے مسیحیت کے ہر تجاوز اور انحراف کا سرچشمہ ہے ۔

یہودی حضرت موسیٰ علیہ السّلام پر نازل کردہ شریعتِ الٰہی کے محافظ ہونے کا دعوٰی کرتے ہیں یا کم از کم ان کے ہاں شریعتِ الٰہی کی اطاعت کا تصوّر باقی ہے ۔ ان سے عظیم ترین مہلک غلطی یہ سرزد ہوئی کہ انہوں نے اس شریعت کو صرف اپنے لیے مخصوص کر لیا ۔ یہ نسل پرستی اپنے نقطۂ انتہا کو اُس وقت پہنچی جب بابلونا میں جلاوطنی کے بعد فارس کے کریم النفس بادشاہ سائرس کے زمانے میں یہودیوں کو اپنے وطن جانے کی اجازت مل گئی اور

ان کے رہنما عذرا نے سامریہ کے اُن یہودیوں کو یہودی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جو فلسطین میں پیچھے رہ گئے تھے۔ سامریہ کے یہ یہودی تورات پر ایمانِ صادق رکھتے تھے، لیکن عذرا نے انہیں صرف اس لیے کافر قرار دے دیا کہ انہوں نے غیر یہودیوں سے شادی بیاہ کے تعلقات قائم کر لیے تھے۔ اگرچہ یسوع مسیح علیہ السلام کے پیروکار حقیقتِ ایزدی کو پوری نوعِ انسانی پر حاوی سمجھتے تھے، لیکن آخرکار ان کے "اندر یہ تصور" عام ہو گیا کہ یہودی قوم اور اغیار (gentile) کے درمیان حائل شدہ رکاوٹوں کو زائل کرنے کے لیے موسوی شریعت کو مسترد کر دینا لازمی ہے؟ چنانچہ انہوں نے پیغام کو فراموش کر دیا اور پیغمبر کی پوجا شروع کر دی۔

یہ فیصلہ کہ مسیحیت اپنے دَور کی غالب تہذیب کا رُخ متعین نہیں کرے گی، بلکہ وہ تہذیب مسیحیت کو خاص رُخ پر چلائے گی، بڑے دُور رس اثرات کا حامل تھا۔ اس نے مسیحیت میں لامحدود بدعتوں اور تحریفات کا دروازہ چوپٹ کھول دیا۔ نئے نئے عقائد مسیحیت میں داخل ہونے لگے۔ باپ بیٹے اور روح القدس کا ذاتِ باری میں متحد ہونے کا عقیدہ، یہ عقیدہ کہ خُدا نوعِ انسانی کو اپنی رحمت و شفقت سے نوازنے کی خاطر اپنے بیٹے یسوع مسیح (علیہ السلام) کی صورت میں ظاہر ہوا، یہ عقیدہ کہ یسوع مسیح نے مصائب جھیل کر اور صلیب پر جان دے کر تمام نوعِ انسانی کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا، حضرت آدم اور حوا کے ابتدائی گناہ کی بنا پر یہ عقیدہ کہ انسانی فطرت وراثتاً بد ہے، تمام انسان گناہ گار پیدا ہوتے ہیں اور یسوع مسیح کے نجات دہندہ ہونے پر پختہ و کامل ایمان انہیں نجات سے ہمکنار کر سکتا ہے، یہ سب مسیحی عقائد یہودی روایات سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے؛ چنانچہ مسلمان علماء کہتے ہیں کہ یہ عقائد کافروں کی اُن مذہبی رسوم اور طور طریقوں سے ماخوذ ہیں جو رومی سلطنت کے طول و عرض میں عام طور پر مروّج تھے۔ تصویروں اور مجسموں کی حرمت کے بارے میں موسوی فرمان کو یونان کی نفتی روایات کے حق میں مسترد کر دینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ یسوع مسیح (علیہ السلام) کی الوہیت کے عقیدہ میں اور

زیادہ شدت اور غلو پیدا ہو گیا۔ اس ضمن میں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ مسیحیوں کا عہد نامۂ جدید یسوع مسیح (علیہ السلام) کی اپنی زبان آرامی میں (جو ایک اور سامی زبان ہے اور عبرانی اور عربی سے گہرا رشتہ رکھتی ہے) کبھی قلم بند نہیں کیا گیا۔ یہ عہد نامہ پہلی مرتبہ یونانی زبان میں مرتب ہوا۔ کیا یہ بات حیران کُن نہیں ہے کہ عہد نامۂ جدید کے موجودہ تراجم میں یسوع مسیح علیہ السلام کے تمام حواریوں کے نام یونانی اور لاطینی ہیں۔ گویا وہ اپنے عبرانی ناموں پر نادم و شرمسار تھے۔ اس سلسلے میں یہ بات خاص اہمیت رکھتی ہے کہ ساؤل نے اپنا نام بدل کر پال رکھ لیا تھا۔ گویا اُس نے اسرائیل کی عبرانی روایات کو مسترد کرنے اور یونانی اور رومی ثقافت کو اپنانے کا واضح مظاہرہ کیا۔ اسی طرح عہد نامۂ جدید کا ادبی اُسلوب عبرانی صحائف کی اثر انگیز سادگی سے عاری ہے۔ اس کے برعکس وہ اُس متصوفانہ سوفسطائیت سے مملو ہے جو یونانی فلسفہ کے ساتھ مخصوص ہو چکی ہے۔ مسیحیوں کے دو بڑے تہوار ———— کرسمس اور ایسٹر ———— اصلاً تمام تر کافر (PAGAN) تہوار ہیں۔ حتیٰ کہ نام نہاد مسیحی کیلنڈر بھی اپنے کافر ماخذ کا پتہ دیتا ہے۔ یہی نہیں دنوں اور مہینوں کے نام تک یونانی اور رومی دیوی دیوتاؤں کے نام پر رکھے گئے ہیں۔ کلیسائی نظامِ حکومت بھی براہِ راست کافر رومی شہنشاہ ڈایوکلیشئین کی انتظامی اصلاحات کے خطوط پر استوار کیا گیا اور آج تک انہی پر قائم چلا آتا ہے۔ عالمی مسیحیت کی بھاری اکثریت کا مقدس ترین شہر یروشلم نہیں کافر روما ہے۔ رومن کیتھولک چرچ کی اصطلاح سے بڑھ کر بھی کوئی متناقض اصطلاح ہو سکتی ہے؟

پروٹسٹنٹ تحریکِ اصلاح و تجدید کے بعد مسیحیت کا لادینی نظریہ یہودی روایات کی محدود مقامی قوم پرستی کے ساتھ مِل جُل گیا اور اس سنجوگ کے نتیجے میں جدید مغربی تہذیب پیدا ہوئی۔ Wilfred Cantwell Smith لکھتا ہے:

"جدید مغربی تہذیب انسان کی عظیم الشان تہذیبوں میں واحد

تہذیب ہے جو ثنویت کی حامل ہے۔ یہ تہذیب دو واضح روایات سے مرکب ہے۔ ایک کا تعلق یونان اور روما سے ہے اور دوسری کا فلسطین سے۔ ان روایات کو یہ تہذیب آج تک یک جان نہیں کر سکی۔ یورپ کی پوری تاریخ میں یہ دونوں روایات دوش بدوش زندہ اور ارتقا پذیر رہی ہیں۔ ان میں بعض اوقات آپس میں تصادم بھی ہوا، پریشان کن کشاکش بھی رونما ہوئی، اتفاق اور ہم آہنگی کے شب و روز بھی آئے تاہم یہ کبھی یک جان نہ ہو سکیں۔ ایک دوسرے پر بڑا گہرا اثر ڈالنے کے باوجود متمائز اور الگ تھلگ رہیں۔ . . . . مسیحیت کی پیش قدمی کا آغاز ایک ایسی دنیا میں ہوا جو پہلے سے منظم تھی اور خود مسیحیت کی ترجیحی صلاحیتیں صدیوں اغیار کی حکومت کے سائے میں رہنے کی وجہ سے ختم ہو چکی تھیں۔ اگرچہ مسیحیت ایک مدت تک رومی سلطنت کے پرستاریوں کا مذہب بنی اور خاصا اہم کردار ادا کرتی رہی . . . . تاہم اُس نے ایک ایسی دنیا میں اپنے سفر کا آغاز کیا جو باقاعدہ ایک نظم کے تحت چل رہی تھی، جس کے اپنے غیر مذہبی قوانین تھے، جس کی اپنی زبانیں تھیں، اپنی حکومت اور اقتصادی ڈھانچہ تھا۔ جس عرصے میں مسیحی اپنی شخصی اخلاقی زندگی کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہے دنیا میں معاشرتی نظام کی تشکیل کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا اور اس کو جاری رکھنے کی ذمہ داری دوسری قوموں نے اپنے کندھوں پر اٹھا لی۔ تاریخ کو کس رُخ پر چلنا چاہیئے؟ کلیسا کی معاشرتی جماعت کے دامن میں اس سلسلے میں عملاً کچھ کہنے کو نہ تھا۔ تاریخی عمل کی رہنمائی مسیحی پروگرام میں شامل نہ تھی۔ حتیٰ کہ جب مظلومیت کا دَور ختم ہوا اور مسیحی ظلم و جبر کی مدافعت کرنے والی اقلیت بنے رہنے کے بجائے ایک مقتدر سوسائٹی

کو وجود میں لانے کے لیے آگے بڑھے اور جب تاریخ کی روانی میں وہ اقتدار اور ذمہ داری کے مقاماتِ بلند پر پہنچے تو انہوں نے رائج الوقت معاشرتی نظام کو جُوں کا تُوں اپنا لیا۔ یہ جانتے ہوئے کہ اس نظام کا ان کے مذہب سے کوئی تعلق نہیں، اسے برقرار رکھا۔ مسیحی ہونے کی حیثیت میں وہ زیادہ سے زیادہ اُس کی اصلاح و ترقی اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اُس کی جگہ کوئی نیا معاشرتی نظام لانا کبھی ان کے پیشِ نظر نہ رہا[1]۔"

چونکہ اسلام کامل طور سے خود مکتفی اقتدار کے صرف ایک مجموعہ اور حق و صداقت کے واحد معیار کو روا رکھتا ہے اور اہلِ ایمان کو حکم دیتا ہے کہ وہ زندگی کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے بجائے ایک سالم اکائی کی حیثیت میں بسر کریں اور صرف وہی باتیں قبول کریں جو اس طریقِ زندگی سے ہم آہنگ اور براہِ راست متعلق ہوں، اس لیے مسیحیت ایک مسلمان ذہن کو پیچیدہ، پراگندہ، بے ربط، غیر حقیقی اور بالکل ناقابلِ عمل نظر آتی ہے؛ تاہم مسلمانوں کو یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ جن امور کو ہم ناقص گردان کر رد کر دیتے ہیں مسیحی انہی کو سب سے بڑی خوبی قرار دیتے ہیں۔ مسٹر کینیتھ کریگ (Kenneth Cragg) لکھتے ہیں:

"ماضی اور حال کے اکثر مسلمان مصنفین مسیحیت کو مطعون کرتے ہیں کہ وہ مغربی تہذیب کی تربیت و تادیب اور اس کا محاسبہ کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اُس نے نہ تو سامراجیت کی روک تھام کی اور نہ استحصال کا توڑ کیا۔ اس کے برعکس اُس نے دنیا پر مغربی اقتدار کا جُوا مستحکم کرنے میں اس کی امداد

---

[1] *Islam in Modern History*, Princeton University Press New Jersey, 1957, pp. 29-30.

اعانت کی .... عہد نامۂ جدید میں کلیسا کو معاشرہ کے اندر معاشرہ کی حیثیت دی گئی ہے۔ اُسے تاریخ میں کبھی پورے انسانی معاشرہ کا مترادف نہیں سمجھا گیا۔ اس کی بنیاد نجات بالکفارہ کے تصور اور حقیقتِ نفس الامری پر رکھی گئی ہے۔ چنانچہ وہ قرار دیتا ہے کہ انسانی فطرت گناہ گار اور تلون مزاج ہے۔ انسان اپنی فطرت میں گندھے ہوئے جذبۂ سرکشی کی بنا پر "فطری" ہے اور اصلاح یابی اور عفو کی بنیاد پر "روحانی" ہے۔ انسان کی اصلاح کے متعلق مسیحی نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ شخصی عمل اور ایمان و اعتقاد کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ نیکی، صداقت اور محبت فطری انسان کے نہیں نوساختہ انسان کے اوصاف ہیں۔ تغیر کی یہ کیفیات شخصی ہونے کی بنا پر اجتماعی زندگی سے تعلق نہیں رکھتیں۔ مسیحیت ان افراد کی ہے جو اس پر ایمان رکھتے ہیں اور انہی کا جزو لاینفک ہے۔ وہ کسی خاص سوسائٹی اور تہذیب کے ساتھ محدود (co-terminous) نہیں ہے۔ مسیحیت کا آخری محل (locus) چیزیں نہیں افراد ہیں۔ مذہب عیسوی کے نزدیک انسان قانون کے ذریعے تکمیل پذیر نہیں ہو سکتا۔ مسیحی ذہن کا ایمان یہ ہے کہ نجات یافتہ سوسائٹی کا مقام ہمیشہ قوم کے اندر ہوگا اور وہ پورے معاشرہ سے مماثل (identical) نہ ہوگی۔ اس پورے معاشرہ ——— لادینی دنیا ——— کو اپنا نظام استوار کرنے میں آزادی ہونی چاہیے۔ ہم قانون سازی یا دعا کے ذریعے اسے مسیح کے ساتھ نہیں ملا سکتے۔ یہ ہے وہ اصولی استدلال جس کی بنا پر مسیحی مذہب کلیسا اور ریاست کے درمیان واضح خطِ امتیاز کھینچتا اور انہیں ایک دوسرے سے الگ کرتا ہے۔ مسیحیت اس امر میں اسلام سے متفق ہے کہ خدا کے مطالبات قطعی ہیں اور کوئی معاملہ بھی ان سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا جا سکتا، لیکن اُسے اس

ساتھ کلیسائی نظامِ مراتب کا قیام اور شہنشاہ کانسٹنٹائن کے عہد (۳۱۲ء) سے پروٹسٹنٹ تحریکِ اصلاح تک کلیسا کے روحانی اقتدار اور قیصر کے دنیوی اقتدار میں تصادم اسی حقیقت پر شاہد ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ رومن کیتھولک یورپی تاریخ کے اس دور کو حقارت سے مسترد نہیں کریں گے، مگر جب اس پر نظر ڈالیں گے تو اس کی طرف لوٹنے کی خواہش اپنے دل میں مچلتی ہوئی پائیں گے۔ یہی نہیں وہ اسے ایک مثالی دور قرار دیں گے۔ اگرچہ رومن کیتھولک چرچ نے لادینیت کو اصولاً تسلیم کر لیا ہے، تاہم آزاد خیال پروٹسٹنٹوں کی طرح وہ اس کی وکالت زور و شور اور کثرانداز میں نہیں کرتا۔ رومن کیتھولک اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ "مسیحی" و "دینوی" اقتدار کا معاشرتی و دستوری زوال اور الحاد و مادہ پرستی کا عروج ایک ہی وقت میں شروع ہوا اس لیے آزاد خیال پروٹسٹنٹوں کے برعکس، وہ فرد کی غیر محدود آزادی پر یقین نہیں رکھتے۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ کسی مذہب کے پیروان جارح حریفوں کو کبھی برداشت نہیں کر سکتے جو اُس کی تخریب اور بربادی پر تُلے ہوئے ہوں۔ صداقت اپنی قیمت پر جھوٹ اور مکر و فریب کی اشاعت و ترقی کو کبھی برداشت نہیں کر سکتی اور نہ اُس سے بے اعتنائی برت سکتی ہے۔ فرد کی غیر محدود آزادی کو برداشت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم بدی کے مقابلے میں عدمِ مزاحمت کا رویہ اختیار کر رہے ہیں اور اس مفروضہ کو تسلیم کر رہے ہیں کہ صداقت، ہماری کسی جدوجہد کے بغیر، خود بخود کامیاب ہو جائے گی۔

اس مرحلہ پر ایک ناگزیر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب فرد اور معاشرہ کی فلاح و بہبود باہم دگر اس قدر مربوط ہے تو پھر مذہبی اور غیر مذہبی اُمور کے درمیان ایک واضح

بات سے اتفاق نہیں ہے کہ ان مطالبات کو خارجی طور پر ایک مذہبی سیاسی نظام قائم کر کے ہی پورا کیا جا سکتا ہے۔[1]

مسیحیت کے جدید ترجمان خصوصاً "آزاد خیال" پروٹسٹنٹ فرقے اب اس لادینی انسان دوست نظریہ کی تصدیق کر چکے ہیں کہ جب تک کوئی شخص اپنے پڑوسی کو آزار نہیں پہنچاتا اُسے کُلی آزادی ہونی چاہیئے کہ وہ جس عقیدے کو پسند کرتا ہے اُس پر ایمان لائے اور جو طرزِ عمل مناسب سمجھتا ہے اختیار کرے۔ انفرادی آزادی کا یہ فلسفہ جو انگلستان اور امریکہ میں مروج جمہوری طرزِ حکومت کی اساس ہے، محض اس لیے کارگر ہے کہ مذہب سے بے اعتنائی عام ہو چکی ہے۔ حالات اگر مختلف ہوتے تو سوسائٹی مایوس کن انتشار کا شکار ہو جاتی، چونکہ انسان فطرۃً اجتماعیت پسند ہے اس لیے جس بات کو وہ حق جانے گا دوسروں کے سامنے اس کی اشاعت و تبلیغ کی سعی کرے گا اور اپنے مخصوص عقائد کو پھیلانے کے لیے اپنے حریفوں کے خلاف لڑے گا۔ آخر کار عقائد کے کسی ایک مجموعہ کا فتح یاب ہونا اور غالب آنا لازمی ہے۔ لہٰذا یہ نقطۂ نظر محض ایک فریب ہے کہ مذہب ایک خالص شخصی اور انفرادی معاملہ ہے۔ کوئی فرد معاشرہ سے الگ تھلگ اور اپنے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ ایک فرد کے کردار و عمل کا اثر یقیناً ان لوگوں پر پڑتا ہے جن کے ساتھ وہ رہتا سہتا ہے۔ اسی طرح اُس کے پڑوسی جو طرزِ عمل اختیار کریں گے اُس کا فوری اثر اُس پر پڑے گا۔ پھر انفرادی مسائل کو اجتماعی مسائل سے کیسے الگ کیا جا سکتا ہے؟

چونکہ انسان فطرۃً اجتماعیت پسند ہے اس لیے کوئی نظریہ کسی اجتماعی ادارہ میں صورت گر ہوئے بغیر نہ تو فروغ پا سکتا ہے اور نہ زندہ رہ سکتا ہے، چنانچہ مسیحی کلیسا کے

---

[1] *The Call of the Minaret*, Oxford University Press, New York, 1956. PP. 327-7

خطِ امتیاز کیسے کھینچا جا سکتا ہے۔ بالفاظِ دیگر مذہبی اقتدار کو کس مقام پر یہ فیصلہ کرنا ہو گا کہ کون سی چیز قیصر کی ہے اور کون سی خدا کی؟

"محمدی دُنیا"
اِسلام کے بارے میں ایک مثالی غلط بیانی

مجلّہ (Holiday) (فلاڈلفیا) کے مارچ ۱۹۹۲ء کے شمارہ میں مشہور اینگلو انڈین امریکی مصنفہ آبری مینن کا ایک خصوصی مقالہ شائع ہُوا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں اسلام کی صدیوں سے جو غلط تصویر پیش کی جا رہی ہے، یہ مقالہ اُس کی ایک عمدہ مثال ہے۔ ہم بالیقین کہہ سکتے ہیں کہ اس مقالہ میں جو غلط بیانی کی گئی ہے، قبل ازیں بے شمار مرتبہ کی جا چکی ہے اور آئندہ بھی کی جاتی رہے گی۔ مقالہ کا عنوان "محمدی دنیا" بجائے خود اصطلاح کا غلط استعمال ہے۔ ہم محمدی نہیں مسلمان ہیں۔ "محمدی" اور "محمدیت" کی اصطلاحات صلیبیوں نے ایجاد کی تھیں اور ان کا مقصد سارے یورپ میں اسلام کے خلاف یہ جھوٹ پھیلا کر نفرت پیدا کرنا تھا کہ ہمارے رسولِ پاک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا ہونے کا دعویٰ کیا تھا اور مسلمانوں کو اپنی پرستش کا حکم دیا تھا۔ اسلام ابتدائے زمانہ ہی سے موجود رہا ہے۔ ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ سمیت تمام انبیاء اور رسول سچے مسلمان تھے۔ اسلام کے معنی ہیں اللہ کی مرضی کے آگے سرِ اطاعت خم کر دینا۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ مسلمان کہلاتے ہیں۔ لہٰذا ہم مسلمان اپنے مذہب کا نام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نامِ گرامی پر رکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

اسلام کے تمام مثالی دشمنوں کی طرح آبری مینن نے بھی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے تعددِ ازدواج کا ذکر کر کے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ حضورؐ عورتوں کے ساتھ حدِ اعتدال سے متجاوز رغبت رکھتے تھے۔ حضرت خدیجہ رضؓ کی وفات کے بعد اور اپنی حیاتِ طیّبہ کے آخری عشرہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے دو وجوہ کی بنا پر نکاح کیے۔ ان بیوہ خواتین کی دیکھ بھال اور حفاظت کے لیے جن کے شوہر اسلام کی خاطر جنگ کرتے ہوئے شہید ہو گئے تھے اور مختلف قبائل اور خاندانوں کے ساتھ یگانگت اور اتحاد و اتفاق کے روابط کو مضبوط کرنے کے لیے پچیس برس کا ایک نوجوان جس کا مقصدِ وحید جسمانی حظ و تسکین کا سامان فراہم کرنا ہو، کبھی ایک ایسی چہل سالہ خاتون سے شادی نہ کرتا جو دو مرتبہ بیوہ ہو چکی تھی، پھر اُس کے انتقال تک مکمل پچیس برس تک وفاشعاری کی زندگی بسر نہ کرتا اور اُس کی یاد اپنے آخری وقت تک عزیز نہ رکھتا۔ خالصتاً نفسانی حظ کے لیے شادی کرنے والے شخص کی نگاہِ انتخاب کبھی بے نوا، ادھیڑ عمر اور بوڑھی بیوہ خواتین پر نہیں پڑتی۔

مقالہ نگار نے حسبِ توقع، مسلمان خواتین کے نام نہاد "پست مرتبہ" پر بڑا زور بیان صرف کیا ہے۔ جب میری مسیحی سہیلیوں کو پتہ چلا کہ میں نے پاکستان میں سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے، تو وہ میرے گھر پر ٹوٹ پڑیں، نیز ٹیلیفون پر میرا ناک میں دم کر دیا۔ ہر ایک کی زبان پر بس یہی تنبیہہ تھی کہ میں ہوش کے ناخن لوں، اسلام میں عورتوں کی حالت نہایت زار و زبوں ہے اور مسلمان سوسائٹی میں انہیں ذلیل و خوار اور پست مرتبہ سمجھا جاتا ہے، مجھے خوفناک رنج و مصیبت سے دوچار ہونا پڑے گا۔ لیکن جب میں مسلمان ممالک میں پہنچی تو مجھے خوشگوار حیرت نے آن لیا۔ میری سہیلیاں جس چیز سے ڈراتی رہی تھیں، وہ کہیں نظر نہ آئی، بلکہ مسیحی مشنری اور ان کے ہمدرد غیر مسلم دنیا کو نسلاً بعد نسل جو کچھ بتاتے چلے آتے ہیں، اس کے برعکس میں نے کسی ایک مسلمان گھر میں بھی مسلمان عورت کی ذلت و خواری کے نہ

کوئی آثار پائے اور نہ اُس کے ساتھ کسی قسم کا ظالمانہ اور اہانت آمیز سلوک روا دیکھا۔ مصر، سوڈان، سعودی عرب، پاکستان غرض، عالمِ اسلامی میں میں جہاں کہیں گئی اور جس مسلمان گھرانے میں مہمان ٹھہری، معاشرتی یا اقتصادی مرتبہ سے قطعِ نظر، ہر جگہ میں نے دیکھا کہ مرد، مسلمان خواتین کے ساتھ بھرپور شفقت، عزّت و احترام اور پاس و التفات سے پیش آتے ہیں، اور اب میں خود ایک بیوی، ماں اور ایک وسیع پٹھان خاندان کی ایک رکن کی حیثیت میں ویسا ہی تجربہ کر رہی ہوں۔

آبری مینن آگے چل کر بڑے شوخ و شنگ انداز میں دعویٰ کرتی ہے کہ ہمارے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو گرویدہ کرنے کے لیے حسی (sensuous) جنّت کی تعلیم دی۔ اُس کے نزدیک یہ ایک فطری بات تھی۔ صحرائے عرب کے رہنے والوں کو اسی قسم کی کوئی چیز متاثر کر سکتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ نام نہاد حسی جنّت صرف کفار کے بگڑے ہوئے اذہان تک محدود ہے۔ ایک سچے مسلمان کے حاشیۂ خیال میں بھی کبھی اس کا تصوّر نہیں آیا۔ کیا یہ بات معقول اور قابلِ تسلیم ہے کہ ہمارے لاتعداد اولیاء اور شہداء نے ایک ایسی جنّت کی خاطر جانیں دیں جس کے دامن میں مادّی جنس کے سوا کچھ نہیں ہے؟ کیا یہ بات عقل میں آسکتی ہے کہ ایک شخص اپنا سارا مال و متاع، عزیز و اقارب حتیٰ کہ اپنی جان تک محض جسمانی مسرّت سے لُطف اندوز ہونے کے لیے قربان کر دے گا۔ اگر یہ نفسانی مسرّت و تسکین ہی انہیں مطلوب تھی، تو یہ تو اِس دُنیا ہی میں بڑے مزے سے بافراط مل سکتی تھی۔ مجھے آج تک ایک مسلمان بھی ایسا نہیں ملا اور نہ اسلامی لٹریچر میں کوئی ایسی کتاب میری نظر سے گزری ہے جس نے آخرت کی وہ مادّی یا نفس پرستانہ تعبیر بیان کی ہو جو مسیحی مشنری قرن ہا قرن سے بیان کرتے چلے آتے ہیں۔ تمام مسلمان جانتے ہیں کہ ہمارا قرآنِ کریم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مستند احادیث، اپنے صحیح سیاق و سباق کے ساتھ، ہمیں یہ تعلیم دیتی ہیں کہ جنّت کی پُر مسرّت زندگی رُوحانی بھی ہوگی اور جسمانی بھی

اور خدائے برتر کا دیدار اور اس کے حضور میں حاضر باشی سب سے بڑھ کر مایۂ شادمانی ہوگی۔ یورپ اور امریکہ کے مسیحی مشنری صدیوں سے اسلام کو ایک نفس پرست مذہب قرار دے رہے ہیں یہاں تک کہ پوری غیر مسلم دنیا اسے ایک بدیہی بات سمجھنے لگی ہے۔ بنابریں اگر آبری مینن بھی اسی دام کا شکار ہو گئی ہے تو کچھ تعجب خیز بات نہیں ہے۔ وہ اپنے قارئین کو یہ تاثر دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتی کہ اسلام ایک نفس پرست مذہب ہے، اس کے اخلاقی معیار نہایت پست ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان شہوت پرست اور عشرت پسند ہیں۔ یہ ایک سفید جھوٹ ہے جو مسیحی مشنریوں نے اسلام کے متعلق گھڑ کر مسلسل پھیلایا ہے۔ وہ مذہب جو اپنے ہر ماننے والے کو رات دن میں پانچ وقت، متعین وقفوں کے ساتھ، نماز ادا کرنے کا حکم دیتا ہے، جو متواتر ایک ماہ کے روزے رکھنے کی سخت تاکید کرتا ہے، بلوغت کے بعد مردوں اور عورتوں کے اختلاطِ باہمی کو روکتا ہے اور ہر قسم کی منشیات، قمار بازی، قسمت آزمائی کے کھیلوں، تصاویر، موسیقی اور رقص و سرود کو ممنوع قرار دیتا ہے، ناجائز جنسی تعلق رکھنے کی انتہائی سخت سزا نافذ کرتا ہے، کیا اُسے شہوت پرست مذہب کہا جا سکتا ہے؟ کیا مسیحیت سمیت کوئی دوسرا مذہب اتنا سخت گیر ہے جتنا کہ اسلام؟ اسلام اپنے نظریات کے ساتھ منسلک رہنے کا شدید مطالبہ کرتا ہے اور انتہا درجے کا (puritanical) ہے۔

"بدیسی رسوم" اور "مشرقی ممالک" کی سحر طراز دل کشیوں سے مسحور ہو کر مغربی سیاحوں اور مصنفین نے ایک آدھ مسلمان ملک کی سوسائٹی کے بعض انتہائی زوال پذیر پہلوؤں کو لیا اور اسے تمام مسلمانوں کا حقیقی امتیازی خاصہ قرار دے کر ان کے سر چپیک دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے وسیع لٹریچر میں سے، جو عربی، فارسی، ترکی اور اُردو میں پایا جاتا ہے، ایک عام یورپی اور امریکی کو یا تو الف لیلہ کے انگریزی ترجمے، مترجمہ رچرڈ برٹن، کی خبر ہے یا رباعیاتِ عمر خیام کے انگریزی ترجمے، فٹز جیرالڈ، کی یہ کتابیں

انگریزی بولنے والے ملکوں میں اس قدر مقبول ہیں کہ انگریزی زبان کے کلاسیکی ادب میں شمار کی جاتی ہیں۔ اہلِ مغرب کو یہ سُن کر اچنبھا ہوگا کہ عربی بولنے والی دنیا میں یہ نام نہاد (Arabian Nights) کوئی ادبی مقام نہیں رکھتی، اسے نقش نگاری کے ایک مرقع سے زیادہ وقعت نہیں دی جاتی۔ اسی طرح عمر خیام خود اپنے ملک میں مُلحد گردانا جاتا ہے اور اس کی شاعری تو صیف و تحسین سے زیادہ حقارت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ اس مثال سے کسی شخص کے ذہن میں یہ اُلجھن باقی نہیں رہنی چاہیئے کہ زیر بحث دونوں تہذیبوں میں سے کون سی تہذیب نظریاتی اعتبار سے افضل و برتر ہے۔

اپنے متعدد پیشروؤں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے آبری مینن نے بڑے جوشِ مسرت کے ساتھ دعویٰ کیا ہے کہ اسلام کی وحدانیت نئی نہیں ہے، بلکہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) نے یہ تصور یہودیوں سے لیا ہے۔ یہودی اہلِ علم کا یہ عام دستور بن گیا ہے کہ وہ اسلام کی جس چیز کو یہودیت سے ہم آہنگ پاتے ہیں، اُسے وہ اپنے سے "مستعار لیا ہوا" قرار دے دیتے ہیں۔ یہودی علماء اپنے وقت، فکری و علمی صلاحیتوں اور عملی قوت کا بڑا حصہ یہ طے کرنے میں ضائع کر چکے ہیں کہ ہمارے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلّم نے قرآنِ کریم "مرتب کرنے" وقت، تورات، تلمود اور مدرش سے کیا کچھ لیا ہے۔ قرآنِ کریم اور یہودی یا مسیحی کتبِ مقدسہ میں جو کچھ متناقض پایا جاتا ہے، اُسے وہ حضورؐ کی ناقص یادداشت اور ناتمام علم سے منسوب کر دیتے ہیں۔ اس طرح یہودی اور مسیحی فاضلین صدیوں سے یہ ثابت کرنے کے لیے سرمار رہے ہیں کہ ہمارا قرآنِ پاک الہامی کتاب نہیں ہے، بلکہ دوسری عام کتابوں کی طرح غلطیوں سے بھرپور ایک عام کتاب ہے۔

اب امرِ واقع یہ ہے کہ ہمارے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلّم اُمّیِ محض تھے اپنی مقامی زبان عربی کے علاوہ کوئی دوسری زبان نہیں جانتے تھے۔ پھر حضورؐ یہودی یا مسیحی کتبِ مقدسہ سے کوئی چیز کیسے مستعار لے سکتے تھے جب کہ آپؐ پڑھنا ہی نہ جانتے تھے اور ان کتابوں

تک رسائی ایک اجنبی زبان کے سوا کسی اور زبان میں ممکن نہ تھی۔

مقالہ نگار نے قرآن کے موضوع پر جو کچھ لکھا ہے، اُس سے اس کی جہالت بُری طرح آشکارا ہوتی ہے۔ وہ لکھتی ہے کہ قرآنِ کریم کی آیات بھیڑ کی ہڈیوں پر الگ الگ قلم بند کر لی گئی تھیں، جنہیں بعد ازاں کسی نظم و ترتیب کا لحاظ کیے بغیر نہایت لاپروائی سے ایک صندوق میں ڈال دیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد مسلمانوں کے سامنے یہ پریشان کن مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوا کہ قرآن کو کس طرح مدوّن کیا جائے؟ چنانچہ انہوں نے انتہائی تیزی سے کام لیتے ہوئے مختلف سورتوں کو مکانکی انداز میں ترتیب دینے کا فیصلہ کر لیا۔ طویل سورتیں پہلے رکھ دیں اور چھوٹی آخر میں۔ مقالہ نگار کے اس دعویٰ کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ کریم جیسے جیسے نازل ہوتا گیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق ان آیات کو ٹھیک متعلقہ مقام پر رکھتے چلے گئے۔ صحابہ کرام رض نے حضورؐ کی ہدایات کی اتباع نہایت وفاداری سے کی۔ کوئی چیز ظن و تخمین پر نہیں چھوڑی گئی۔

ایمری مینن بیان کرتی ہے کہ اُس نے مسلمانوں کی نوخیز نسل کو دمشق کی جامع مسجد اور قاہرہ کی جامعہ الازہر میں قرآنِ کریم پڑھتے دیکھا ہے۔ اس طرح وہ اپنے قارئین کو یہ بتانا چاہتی ہے کہ مسلمانوں کا ذہن کس طرح "مقید" ہو کر رہ گیا ہے۔ دَورِ حاضر کے مادہ پرستانہ ذہن رکھنے والے تمام افراد کی مانند وہ بھی یہ اعتقاد رکھتی ہے کہ ہم مسلمانوں کا یہ ایمان ہماری سب سے بڑی کمزوری ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری رسولؐ ہیں اور قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے جو نوعِ انسانی کی ہدایت کے لیے نازل کی گئی۔ اس لیے کہ ایک مرتبہ صداقت آشکارا ہو جائے تو اُسے بدلا نہیں جا سکتا۔ تبدیلی کی خاطر تبدیلی تمام جدّت پسند نظریات کے نزدیک سب سے بڑی نیکی ہے۔ ابدی صداقت اور بدیہی اقدار کو "قرونِ وسطیٰ کے تصوّرات" قرار دے کر حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ صداقت کو کسی ایسی پُراسرار شئے سمجھنا آج کا دستور بن چکا ہے، جو کبھی آشکارا نہیں ہو سکتی!

چنانچہ یہ لازمی خیال کیا جاتا ہے کہ لوگ اخلاق و صداقت کے معیار خود بنائیں تاکہ وہ جس نئی صورتِ حالات سے دوچار ہوں، اس پر پُورا اُتر سکیں۔ اس طرزِ فکر و عمل کا نتیجہ وہ مکمل اخلاقی اور روحانی انتشار ہے، جس سے آج ہم دوچار ہیں۔

قرآنِ کریم کبھی تقویمِ پارینہ نہیں بن سکتا۔ بنا بریں موجودہ دَور کے مادّی مفاسد کے خلاف اس سے بڑھ کر صحیح و موثر حجت اور کوئی نہیں۔ اگر اسلام کلّی طور پر نافذ ہو جائے تو ہم ایک ایسے انقلاب کا تجربہ کریں گے جس کے آگے دوسرے تمام انقلابات ہیچ ہو کر رہ جائیں گے۔ ہر قسم کا ظلم و ستم اور جبر و تشدد اس طرح غائب ہو جائے گا گویا کبھی اس کا وجود ہی نہ تھا۔ جونہی انسان اپنے جیسے انسانوں کے آگے جُھکنا بند کر دیں گے اور صرف خدائے واحد سے خوف کھائیں گے یہ دنیا پیچ پچ تہ و بالا ہو جائے گی۔ اُوپر کی بگڑی ہوئی اور ظلم و ناانصافی سے معمور دنیا نیچے ہو جائے گی اور نیچے کی راست رو اور حق و انصاف کی دُنیا اُوپر۔

تاہم ایمری مینن موجودہ مسلمانوں کی کمزوری کو اسلام کی کوتاہی کے ثبوت میں پیش کرے گی۔ میرا جواب یہ ہے کہ اگر کوئی ممتاز ڈاکٹر کسی مریض کے لیے کوئی تیر بہدف دوا تجویز کرتا ہے، لیکن وہ مریض اس دوا کو استعمال کرنے سے انکار کر دیتا ہے تو یہ کس کا قصور ہے؟

یہاں یہ اہم ترین سوال پیدا ہوتا ہے کہ مغربی مصنّفین اسلام کو بدنام کرنے کے لیے آخری حد تک چلے جانے کے اس قدر مشتاق کیوں ہیں؟ ہماری طرف سے غصّے کے عالم میں محض زبانی مذمّت پر انحصار کرنا اور ترکی بہ ترکی جواب دینا بالکل بے سُود ہوگا۔ ان کے اس طرزِ عمل کے پیچھے جو محرکات کارفرما ہیں، ہمیں ان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ولفریڈ کینٹویل سمتھ لکھتے ہیں:

"مغرب اسلام کو سمجھنے کی جو سنجیدہ اور سر توڑ مساعی کر رہا ہے دُنیائے اسلام

اُن کا ادراک نہیں رکھتی۔ اس قسم کا فہم و ادراک کس قدر مشکل ہے اس کا اُسے
فی الواقع ادنیٰ سا تصور بھی نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ دُنیا کی ان
عظیم تہذیبوں کے درمیان اختلافات نازک بھی ہیں اور عمیق بھی۔ نہ تو مغربی
تہذیب کی وسیع پیمانے پر کوششیں ہی کافی اور مؤثر ثابت ہوئی ہیں اور
نہ اسلامی تہذیب ہی جان سکی ہے کہ یہ تہذیبی خلیج کس قدر وسیع اور بے
پایاں ہے۔ ۔۔۔۔۔۔۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے وہ اس بات
کا پوری طرح اندازہ کرنا تو درکنار یہ قبول کرنے میں بھی ناکام رہے ہیں کہ
کسی باہر کے شخص کے لیے اسلامی تہذیب، خصوصاً اس مذہب کو
سمجھنا کس قدر مشکل ہے، جس پر اس تہذیب کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اسلام
ایک مسلمان کی نظر میں بالکل سیدھا سادہ، سُلجھا ہوا، معقول اور بیّن و
واضح ہے۔ اس کے متعلق کسی قسم کی غلط فہمی کو وہ خوفناک ۔۔۔۔۔ ہٹ دھرمی
اور مریضانہ خبثِ باطن پر مبنی سمجھتا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ یہ اوّلین مفروضات
دوسری تہذیبوں کے بنیادی مفروضات سے کس قدر مختلف ہیں۔ اُسے اور اہلِ
مغرب دونوں کو ۔۔۔۔۔ ابھی اس بات سے آگاہ ہونا باقی ہے کہ نوعِ انسانی کے
عظیم مذاہب کائنات کے متعلق صحیح اور واضح نقطۂ نظر متعین کرنے کے سلسلے
میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ وہ جوابات مختلف
دیتے ہیں بلکہ سوالات بھی مختلف کرتے ہیں۔"[1]

دوسرے الفاظ میں اس ساری غلط فہمی کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ان متصادم
اخلاقی اور روحانی اقدار میں مصالحت اور توافق ناممکن ہے۔ مغرب اسلام کو جس انداز

---

[1] *Islam in Modern History*, pp. 102-103.

سے دیکھتا ہے، آیئے ہم اس پر ایک نظر ڈالتے چلیں۔ لاادری مذہبِ انسانیت کے پیروکاروں
کے نزدیک اسلام کی دقیق دینی بنیادیں اور اخلاقی مطلقیت (absolutism) ایک جامد
رجعت پسند اور قرونِ وسطیٰ کا فرسودہ نظام وجود میں لاتی ہیں۔ یہ نظام نشو و نما اور ارتقا
کی صلاحیتوں سے محروم ہونے کی بنا پر اپنے پیروکاروں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کی
قدیم تہذیب میں مقید رکھتا ہے اور اس طرح انسان کی "ترقی" کی تمام امیدوں کو خاک
میں ملا دیتا ہے۔ اسلامی نظریۂ حیات کی ہر پہلو پر حاوی ہمہ گیری، جس کے تحت مذہب
اور حکومت متحد ہو جاتے ہیں، جدید لادینیت کے معتقدین کی نظر میں "کلیت پسند"
ہے اور "ذہنی ذوقِ تجسس کی آزادی اور حقِ عمل کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔" اخلاق
اور عبادت کے لازم و ملزوم ہونے اور ایک مسلمان کی زندگی کے ہر پہلو کی نگرانی کرنے
والے کثیر التعداد قوانین کو وہ "محض بیکار سی موشگافی اور بے روح رواج" سے
تعبیر کرتے ہیں۔ پردہ یا مرد و زن کی علیحدگی اُن کے نزدیک "عورت کی ذلت و پستی"
کے ہم معنی ہے اور آزادیٔ نسواں کے جدید علمبردار اسے "عورتوں کو قومی زندگی میں
آزادانہ حصہ لینے اور بیرونِ خانہ معاشرتی ترقی میں بے روک ٹوک شریک ہونے کی
آزادی عطا کرنے سے انکار" کے مترادف قرار دیتے ہیں۔ تصویروں، مجسموں، موسیقی
اور رقص و سرود کی اسلامی ممانعت میں ایک مہذب مغربی کو "انسان کی بہترین تخلیقی
صلاحیتوں کی بربادی نظر آتی ہے۔"

ایک مغربی مستشرق اور سچے مخلص مسلمان کے نقطۂ نظر میں غالباً سب سے بڑا
اختلاف یہ ہے کہ اوّل الذکر اسلام کو محض اس مخصوص ماحول کا تشکیل کردہ تاریخی مظہر
قرار دیتا ہے جس میں ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سکونت پذیر تھے۔ اس کے برعکس
مؤخر الذکر کا ایمان و اعتقاد یہ ہے کہ ان تاریخ ساز سالوں میں جو کچھ وقوع پذیر ہوا اس
کی نوعیت کائناتی، عالمگیر اور الہامی صداقت کی ہے اور وہ زمان و مکان سے ماورا

قیامت تک تمام قوموں اور ملکوں کے لیے یکساں طور پر واجب العمل ضابطہ ہے۔ تاہم مستشرقین اسلام کو دوسرے مذاہب کی طرح محض ایک مذہب اور تاریخ کی متعدد دوسری تہذیبوں کی طرح ایک تہذیب قرار دیتے ہیں۔ جو صرف اپنے دینوی عروج کے دَور میں اہم اور وقیع تھی۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اب مغربی تہذیب و ثقافت نے اُس کی جگہ لے لی ہے اور اسلام قصۂ ماضی بن چکا ہے۔ اُسے پھر سے رواج نہیں دیا جا سکتا۔

یہ ہیں وہ چند اسباب جن کی بنا پر دنیا ئے مغرب کے لیے اسلام کا "معروضی" مطالعہ ناممکن ہو چکا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی آنکھوں پر سیاہ عینک چڑھا لے تو جب تک وہ اسے نہیں اُتارتا اس کی نظر مسخ شدہ ہی رہے گی۔ علیٰ ہذا القیاس جب تک مغربی تہذیب کے پورے کے پورے کردار کی قلب ماہیت نہیں ہوتی (چند اکا دُکا افراد کی امکانی مستثنیات کے ساتھ) ہم مسلمان ان سے کسی اور طرزِ عمل کی توقع نہیں کر سکتے۔

---

(۲)

اِسلام ـــــ ایک نظریہ

مسلمان ذہن

مسلمان ہونے کے تقاضے عبادات کی پابندی سے کہیں زیادہ ہیں۔ ہر چند عبادات ناگزیر ہیں، لیکن جب تک ایک نومسلم کا پورا ذہنی، اخلاق اور روحانی نقطۂ نظر بدل نہیں جاتا عبادات کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ مشرف باسلام ہونے کے بعد میرے اندر اہم ترین تبدیلی یہ آئی کہ میرے ذہن کی کایا پلٹ ہو گئی۔ وہ ایک کافر ذہن سے مسلمان ذہن میں تبدیل ہو گیا۔ مسلمان ذہن کس طرح کام کرتا ہے؟ دنیا کے بارے میں ایک مسلمان کا تصور کیا ہے؟ زندگی کو وہ کس زاویۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کا دین وایمان اس کے کردار، افعال اور امنگوں پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے؟ ان سب سوالات کا جواب میں اپنے ذاتی تجربے کی روشنی میں دوں گی۔ بہت سی باتیں ایک غیر مسلم کے لیے حیران کن ہوں گی بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ بعض باتوں پر دہل کر رہ جائے، لیکن جب حقیقی اسلامی اقدار کے داخلی مفہوم اور اصلی حسن وخوبی پر اس کی نظر کافی حد تک گہری ہو جائے گی تو یہ ساری حیرت ودہشت خود بخود جاتی رہے گی۔

اسلام کا بنیادی عقیدہ یہ تصور ہے کہ انسان اللہ کا بندہ ہے۔ عربی میں اللہ کے بندے کو "عبداللہ" کہتے ہیں۔ یہ نام مسلمان ملکوں میں عام پایا جاتا ہے۔ اسلام کے حقیقی معنی

ہیں اللہ کی مرضی کے آگے جُھک جانا۔ وہ سب لوگ جو اللہ کی اطاعت و رضا کی اس زندگی کو اختیار کرتے ہیں مسلمان کہلاتے ہیں۔ چونکہ اللہ کی ذات برتر و بالا ہے اور وہی ساری کائنات کی فرمانروا ہے اس لیے مسلمان ذہن کو کلیسا اور ریاست کی تفریق کا مسیحی تصور بالکل غیر منطقی نظر آتا ہے۔ اسلامی حکومت کا مقصد اللہ کے قانون کا نفاذ ہے، جو قرآن و سُنّت میں محفوظ ہے۔ مسلمان حکمران نہ تو خود قانون کی حیثیت اختیار کر سکتا ہے، نہ وہ اپنے طور پر کوئی نیا قانون بنانے کا حق رکھتا ہے۔ شریعتِ الٰہی کو کبھی بدلا نہیں جا سکتا۔ ہاں، اس کی تعبیر کی جا سکتی ہے، وہ بھی کڑی حدود کے اندر۔ ہر چیز کا مالک اللہ ہے۔ انسان کی اپنی کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ کلیتہً اللہ تعالیٰ کا دستِ نگر ہے۔ ہر وہ شے جو انسان کے قبضہ و تصرف میں ہے۔ حتّٰی کہ اُس کا جسم بھی ——— اللہ تعالیٰ نے محض مستعار دی ہے تاکہ وہ اسے حتی الامکان انتہائی معقول طریقے سے کام میں لائے۔ اگر کوئی شخص اِس ذمّہ داری سے پہلو تہی کرتا ہے تو وہ عبرت ناک سزا پائے گا۔ انسان کا فرض ہے کہ وہ اللہ کی بندگی کا حق ادا کرنے کے لیے بوقتِ ضرورت ہر شے اپنی ذاتی مسرّت، اپنا عیش و آرام، اپنی خواہشات، آسائشیں، دولت، مال و متاع حتّٰی کہ زندگی تک راضی خوشی قربان کر دے۔ سچّے اور مخلص مسلمان کو کسی عظیم تر نیکی اور بھلائی کی خاطر اپنی ساری چند روزہ مسرّتیں قربان کر دینے میں کوئی پس و پیش نہ ہوگا۔ اِس کا اجر اُسے ابدی مسرّت اور قلبی اطمینان کی صورت میں ملے گا۔ "اللہ کا بندہ" ہونے کا مطلب انسانوں کے جور و استبداد سے آزادی ہے۔ سچّا مسلمان کسی انسان سے نہیں ڈرتا وہ صرف اللہ سے ڈرتا ہے۔

مسلمان دنیا کو دو مخالف کیمپوں ——— دارالاسلام اور دارالکفر میں تقسیم کرتا ہے۔ نوعِ انسان کی بدترین مصیبت غربت، بیماری یا ناخواندگی نہیں کُفر ہے۔ نوعمر حاملہ دُلہنیں، کنواری مائیں، امراضِ خبیثہ، اسقاطِ حمل، زنا بالجبر، حرامی بچّے، لاوارث شرابی اور جنگ جویانہ وطن پرستی سب کُفر کے منطقی نتائج اور تلخ ثمرات ہیں۔ جو کچھ اسلامی تعلیمات

سے ہم آہنگ ہے سب سے بڑی نیکی اور بھلائی اُسی سے عبارت ہے۔ اس کے برعکس کُفر اللہ تعالیٰ کے خلاف مکمل بغاوت ہے جسے کبھی برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ ایک مسلمان اپنے دوسرے ہم چشم انسان کی سیرت کا اندازہ اُس کے عقیدہ کی صحت اور روزمرّہ زندگی میں اس کے عملاً نفاذ کی اساس پر کرتا ہے۔ کسی شخص کی نسل، قومیت، دولت یا معاشرتی حیثیت کا اس کے حقیقی انسانی وصف سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک شخص جس چیز پر ایمان لانے کا مدعی ہے، اگر اُس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش نہیں کرتا تو وہ محض ایک منافق ہے، فی الحقیقت وہ سرے سے ایمان ہی نہیں رکھتا۔ ایک مسلمان کے نزدیک انسان کے کسی فعل کا دار و مدار اُس کے عقائد پر ہے۔ کیونکہ فوق الفطرۃ دینی بنیادوں کے بغیر وہ حُسنِ عمل اور اخلاقیات کے وجود کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

سچّا مسلمان موت سے نہیں ڈرتا۔ موت وہ گھاٹی ہے جس سے گزر کر ایک مسلمان اَبدی زندگی سے ہمکنار ہوتا اور قُربِ الٰہی حاصل کرتا ہے۔ مسلمان جب بیمار ہوتا ہے تو صحت یاب ہونے کے لیے ہر ممکن علاج معالجہ کرواتا ہے، لیکن بایں ہمہ اگر تمام طبّی وسائل اس کی صحت بحال کرنے اور زندگی بچانے میں ناکام رہتے ہیں تو وہ بڑے سکون و اطمینان کے ساتھ داعیٔ اجل کو لبیک کہتا ہے۔ اُس کا یہ ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر جاندار کی زندگی کی مدّت پہلے ہی سے مقرر کر دی ہے۔ کوئی شخص نہ تو اس مقررہ وقت سے پہلے مر سکتا ہے نہ دنیا بھر کی دوائیں اور طبیب مل کر اس کی موت کو آنِ واحد ہی کے لیے مؤخر کر سکتے ہیں۔

سچّا مسلمان متعصب نہیں ہوتا۔ ہمارا قرآنِ پاک تجسّس اور غیبت کی ممانعت کرتا ہے۔ وہ اہلِ بدعت کے تکفیر پر یقین نہیں کرتا۔ کوئی مسلمان چاہے کتنا ہی غلط کار کیوں نہ ہو جب تک وہ اپنے دین کو علانیہ نہیں چھوڑ دیتا، اُسے دُوسرا مسلمان دینی و معاشرتی حقوق سے محروم نہیں کر سکتا۔ مسلمان نہ تو دوسرے مذاہب پرست جور و تعدّی دراز کرنے

ہیں اور نہ لوگوں کو جبراً مسلمان بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت کے سائے میں مذہبی اقلیتیں خود مختار اور سالم گروہوں کی صورت میں زندگی بسر کرتی ہیں۔ انہیں اپنے مذہبی قوانین پر چلنے، اپنے بچوں کو اپنی مرضی کے مطابق تعلیم دینے اور اپنی تہذیب و ثقافت کو دوام بخشنے کی اجازت ہوتی ہے۔ مزید برآں انہیں جان و مال کا مکمل تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق وہ بحیثیتِ انسان مساوی انصاف اور عمدہ سلوک کے مستحق ہوتے ہیں، تاہم شریعتِ اسلامی کے ان تمام عطا کردہ حقوق کے باوجود کسی غیر مسلم کو مسلمان کا ہمسر نہیں سمجھا جاسکتا۔ اسلامی حکومت کے سایہ میں بسنے والے غیر مسلم فوجی خدمت سے مستثنیٰ ہوتے ہیں، کیونکہ جو لوگ اسلام کی دعوت پر ایمان رکھتے ہیں وہی اس کی خاطر جنگ کر سکتے ہیں۔ اسی بنا پر کسی غیر مسلم کو حکومت کے کلیدی مناصب پر بھی فائز نہیں کیا جاسکتا۔ ایک مسلمان نسلی و قومی اختلافات کے باوجود دوسرے مسلمانوں کے ساتھ گہری قرابت محسوس کرتا ہے، لیکن غیر مسلموں کے درمیان وہ اپنے آپ کو ہمیشہ اجنبی پاتا ہے۔

اسلام ایک عالمگیر دین ہے۔ اُس کے دروازے تمام نوعِ انسانی پر کھلے ہیں۔ وہ غیر مسلموں کو اپنی آغوشِ رحمت میں لانے کے لیے سرگرم جدّ و جہد کرتا ہے۔ مسیحیوں کے برعکس ہمیں پیشہ ور مبلّغین کی ضرورت نہیں۔ ہر مسلمان بجائے خود ایک مبلّغ ہے۔ اسلام کی تبلیغ و اشاعت، اپنی امکانی حد تک، اُس کا مقدس فریضہ ہے۔ بہت سے غیر مسلم یہ جان کر ورطۂ حیرت میں ڈوب جائیں گے کہ دنیا کے وسیع و عریض علاقوں میں —— خصوصاً جنوب مشرقی ایشیا اور افریقہ میں —— اسلام عام عرب اور ہندوستانی تاجروں کے ذریعے پھیلا۔ اس مقصد کے لیے نہ تو جبر و تشدد اور قوت سے کام لیا گیا نہ ان ممالک کو سیاسی طور پر کبھی محکوم بنایا گیا۔ یہ نتائج صرف اس لیے رونما ہوئے کہ ان تاجروں اور بیوپاریوں نے پہلے اسلام کو پیش کیا اور پھر کاروبار کی طرف توجہ دی۔

صحیح راسخ الاعتقاد یہودیوں کی طرح مسلمان بھی یہ ایمان رکھتے ہیں کہ انسان کو اللہ تعالےٰ کا تقرب اُس کے مقدس قوانین کی تعمیل اور پابندی ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ بنابریں وہ عبادات اور اخلاقیات کے درمیان کوئی نمایاں خطِ امتیاز نہیں کھینچتے، جو ایک دوسرے کے ساتھ غیر منفک طور پر مربوط ہیں۔ مسلمان روح کو اُس کے خارجی قالب سے الگ نہیں کرتے کیونکہ ان کا ایقان ہے کہ کوئی عقیدہ اپنے محسوس مظہر کے بغیر مؤثر اور کارگر نہیں ہوتا۔

وضو اور نماز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی سنّت کے عین مطابق ادا کرنا لازمی ہے۔ نماز ایک مسلمان کے اندر حسّاس ضمیر اور بلند کردار کو نشو و نما دیتی اور اسے پختگی عطا کرتی ہے۔ اس لیے کہ جب وہ نماز پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی یہ دیکھنے والا نہیں ہوتا کہ اُس نے یہ فرض ٹھیک ٹھیک انجام دیا ہے یا نہیں۔ شخصی حفظانِ صحت اور طہارت و پاکیزگی کی ضرورت پر اور کوئی مذہب اس قدر زور نہیں دیتا۔ جسمانی طہارت روحانی پاکیزگی کو متاثر کرتی ہے اور خارجی انسان داخلی انسان کا مظہر ہوتا ہے۔

قرآن و سنّت کا تعزیری قانون وہ اہم ترین موضوع ہے جس پر غیر مسلموں نے نکتہ آفرینی کی اور غلط فہمی پھیلاتی ہے۔ اسلام جن امور کو معاشرہ کے خلاف بدترین جرائم قرار دیتا ہے مغربی ممالک میں انہیں شاید ہی جرم سمجھا جاتا ہے اور چوری کے سوا کسی جرم پر شاذ و نادر ہی قانونِ تعزیرات نافذ کی جاتی ہیں۔ مسلمان نہ تو اس بات کے قائل ہیں کہ قانون کی خوبی اور فضیلت کا انحصار اس کی نرمی پر ہے اور نہ اُن کا یہ اعتقاد ہے کہ مجرم معاشرہ سے زیادہ ہمدردی اور شفقت کے سزاوار ہیں۔

مسلمانوں کی نظر میں قرآن و سنّت کا تعزیری قانون ساتویں صدی عیسوی کے قدیم عرب کا ظالمانہ اور وحشیانہ ماحصل نہیں ہے اور نہ وہ آج کی دنیا سے غیر متعلق ہے۔ اس کے برعکس ان کا ایقان یہ ہے کہ یہ قانون ہمارے جدید تہذیب کی اخلاقی بیماریوں

اور انتہائی نفسیاتی تخریب کاریوں سے زیادہ مجرموں کا تنفیق و ہمدرد اور ایک حقیقی اِسلامی معاشرہ کو جرائم سے پاک صاف رکھنے میں انسان کے خود ساختہ قوانین سے زیادہ مؤثر ہے۔

مسلمانوں کا ایمان ہے کہ ایک صحت بخش معاشرہ وجود میں لانے کے لیے مردوں اور عورتوں کی علیحدگی نہایت ضروری ہے - دوسرے الفاظ میں اسلام مردوں اور عورتوں کے آزادانہ میل جول کی ممانعت کرتا ہے - یہی وجہ ہے کہ کوئی مسلمان مخلوط معاشرتی تقریبات، مخلوط درس گاہیں یا لڑکوں اور لڑکیوں میں شادی سے پہلے عشق و محبت کی پینگیں (کورٹ شپ) برداشت نہیں کر سکتا - لازم ہے کہ نہ تو مرد غیر عورتوں کی طرف دیکھیں نہ عورتیں غیر مردوں کی طرف - ہر وقت حیادار لباس زیب تن رہے - عورتوں کو کسی کام سے باہر جانا ہو تو اپنا پورا جسم پردہ میں ڈھانپ کر نکلیں اور حتی الامکان سیدھے سادہ غیر نمایاں انداز میں چلیں پھریں - عورت کا حسن و جمال صرف اس کے اپنے لیے ہے - اُس کا جسم کسی حالت میں بھی بے پردگی اور آوارہ نگاہوں کا ہدف نہیں بننا چاہیئے - مردوں اور عورتوں کے درمیان عشق و محبت کے کھلے عام مظاہر سخت تعزیر کے لائق ہیں - اسلام مرد کو گھر سے باہر کے معاشرتی فرائض سونپتا ہے اور عورت کو درونِ خانہ کے تمام معاملات کا ذمہ دار بناتا ہے - بنا بریں کاروبار یا سیاست کے میدان میں مردوں کے ساتھ مسابقت عورتوں کا کام نہیں ہے - مسلمان خوب اچھی طرح جانتا ہے کہ عورت جب ایک دفعہ گھر کو چھوڑ دیتی ہے تو گھر باقی نہیں رہتا -

تجرّد کی زندگی کو قرآن و سنّت مذموم قرار دیتے ہیں - ہر نارمل مرد اور عورت سے ازدواجی زندگی بسر کرنے کی توقع کی جاتی ہے - اگرچہ مرد کو چار بیویاں کرنے کی اجازت ہے تاہم نہ تو اسلام تعددِ ازدواج کا حکم دیتا ہے اور نہ مسلمان معاشرہ میں اس کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے - بس یہ ایک اجازت ہے جس سے خال خال لوگ فائدہ اُٹھاتے

ہیں - مسلمانوں کی غالب اکثریت ہمیشہ یک زوجگی پر عامل رہی ہے -

اسلام کی طرف سے محدود تعددِ ازدواج کی اجازت ناجائز جنسی تعلقات کو بڑی حد تک ختم کر دیتی ہے ، کیونکہ اگر کوئی شخص کسی دوسری عورت سے تعلقات استوار کرنے کا خواہشمند ہے تو اُس کے لیے پہلے اُس عورت کے ساتھ شادی کرنا ، اس کی کفالت کا بار اُٹھانا اور ربوبیت کی ذمہ داری کو قبول کرنا ضروری ہے - اسلام بھی قومی اور بین الاقوامی پیمانے پر "خاندانی منصوبہ بندی" کے اتنا ہی مخالف ہے جتنا کہ رومن کیتھولک چرچ ، اور اس مخالفت کے اسباب بھی تقریباً یکساں ہیں - ایک مسلمان کے نزدیک اس سے بڑھ کر مفسدہ اور دین و مذہب سے انحراف اور نہیں ہو سکتا کہ انسان ازدواجی تعلقات بھی قائم رکھے اور ان کی اصل غرض و غایت کی راہ میں رکاوٹ بھی ڈالے - مانع حمل ادویات وغیرہ استعمال کرنے کی اجازت صرف غیر معمولی انفرادی صورتوں میں ہے اور وہ بھی محض طبی بنیادوں پر - بچوں کی تعداد میں تخفیف کی عمداً کوشش کرنے کے لیے اقتصادی وجوہ کا عذر ناکافی ہے ، کیونکہ آدمی کا رازق خود آدمی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ہے -

اسلام "فنونِ لطیفہ" کی حوصلہ شکنی کرتا اور اس سلسلے میں تمام دیگر مذاہب سے مختلف رائے رکھتا ہے - ایک مسلمان قوم میں کسی مینجیلنگلو ، ریمبرانٹ ، بیتھوون یا شیکسپئر کو اپنے اوپر نچھاور کرنے کے لیے تحسین و آفرین کے پھول نہیں ملیں گے - یہی وجہ ہے کہ مسلمان شہروں میں سمفنی سرود گاہوں ، اوپیرا گھروں ، تھیٹروں اور فنی عجائب خانوں کا نمایاں فقدان ہے - اسلامی فن کی تخلیقی قوت نے اپنا کامل اظہار عربی خطاطی کی صورت میں کیا ہے یا طرزِ تعمیر میں ، جس سے آج تک کوئی قوم سبقت نہیں لے جا سکی -

سازو سرود کو ہر جگہ مذموم قرار دیا جاتا ہے - مساجد میں تو وہ بالکل ممنوع ہے - پیشہ ور مطرب اور سازندے پوری دنیائے اِسلام میں معاشرتی لحاظ سے پست اور ذلیل

سمجھے جاتے ہیں۔ ساز و سرود انسان کے قلب و ذہن کو اپنے اللہ سے غافل کر دیتے ہیں اور بالآخر اُسے شہوت پرستی کی پستیوں میں پہنچا دیتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اپنے جذبات کے اظہار پر بے حد مجبور ہو جاتے تو اُسے گانے کی اجازت ہے، لیکن احتراز و اجتناب اولیٰ تر ہے۔ کوئی عفیف اور پاکدامن شریف مسلمان خاتون کھلے عام نہیں گائے گی۔ قرآن پاک کی قرأت، اذان اور قوالی کی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت گوئی واحد نغمہ و سرود ہے جسے مستحسن سمجھا جاتا ہے۔

چونکہ رقص ناجائز جنسی تعلقات کا نہایت طاقت ور محرک ہے اس لیے اسلام میں اس کی مکمل ممانعت ہے۔ شاید عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے تہوار، جب کہ لوگوں کو جہاد کے لیے جوش میں لانا مقصود ہو، یا شادی کی تقریبات اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اس قسم کے جشن کبھی مخلوط نہیں ہوتے۔ مرد مردوں کے ساتھ مل کر رقص کرتے ہیں اور عورتیں صرف عورتوں کے ساتھ۔

سٹیج، سینما یا ٹیلی ویژن کے پردوں پر سوانگ بھرنے کی بھی اسی بنا پر حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ کھیل، تماشے، خواہ ان میں کوئی شخص ایک کردار کی حیثیت میں شریک ہوتا ہے یا تماشائی کی، نہ صرف فسق و فجور کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں بلکہ لوگوں کو اپنے ذاتی تصورات میں اس حد تک گم کر دیتے ہیں کہ حقیقی زندگی سے اُن کی دلچسپی جاتی رہتی ہے۔

لٹریری فکشن، خواہ ڈرامے کی شکل میں ہو یا ناول کی، کسی مسلمان ملک سے کوئی فطری تعلق نہیں رکھتا۔ البتہ خطابت اور شاعری کو بے حد ترقی دی جاتی ہے اور فصیح تقریروں کو مسلمان ہر جگہ بڑی قدر و وقعت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

اسلام کا نظامِ حیات بدیہی اقدار پر مبنی ہے۔ اخلاق و صداقت مطلق ابدی اور عالمگیر ہیں۔ انہیں انسان نے نہیں اللہ نے جاری کیا ہے۔ بنابریں انسان ان میں

دخل دینے کا کوئی حق نہیں رکھتا۔ مسلمانوں کے نزدیک قرآنِ کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نہیں، اللہ کی کتاب ہے۔ ان کا ایمان ہے کہ اس کا ایک ایک لفظ حقیقی معنوں میں سچا ہے اور اس کی اطاعت لازمی ہے۔ قرآنِ کریم علمِ کُل کا منبع ہے اور اُس کے کسی جزو کے متعلق شک و ریب کا اظہار اللہ تعالیٰ کی ہدایت کو مسترد کر دینے کے مترادف ہے۔ حدیث یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور سنّت —— حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل —— قرآنِ کریم کی صحیح تعبیر و تشریح کے لیے لازمی ہیں۔ دوسرے کے بغیر تنہا کسی ایک پر انحصار بے معنی ہے۔ چونکہ قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کی عطا سے مبرّا، مکمل اور آخری وحی ہے جو انسان کی ہدایت کے لیے بھیجی گئی ہے، اس لیے اسلام کی نہ تو "تہذیب و اصلاح" کی جا سکتی ہے، نہ اس میں کسی قسم کا ردّ و بدل کیا جا سکتا ہے۔ اس کو "ترقی دینے" کی ضرورت کبھی پیش نہیں آ سکتی۔ اسلام ایک مکمل اور خود مکتفی دین ہے۔ اخذ و انتخاب کی اس میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مسلمان کے نزدیک "ترقی" یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کو قرآنِ کریم کے الفاظ اور رُوح کے عین مطابق ڈھالیں۔ اُن کا دُنیاوی مقصود مادّی کامیابی نہیں آخرت کی زندگی کے لیے ساز و سامان مہیا کرنا ہے۔

اسلام مسلمانوں سے کامل اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے۔ مسلمان شب و روز کے ہر لمحے میں مسلمان رہتا ہے۔ اسلام کی ضابطہ پسندی کسی دوسرے مذہب کے پیروکاروں کے لیے ناقابلِ تصوّر ہے۔ اس کے قوانین ایک مسلمان کی پیدائش سے لے کر موت تک، زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہیں۔ وہ بیداری کے عالم میں ہو یا خوابیدہ، اسلام ہر وقت مسلمان کے ساتھ رہتا ہے۔ اُسے ایک لمحے کے لیے بھی اپنی اسلامی حیثیت کو فراموش کرنے کی اجازت نہیں۔

اسلام اور ذہنی صحت

جدید معاشرہ جن انتہائی سنگین مسائل سے دوچار ہے ، ان میں سے ایک مسئلہ اعصابی و دماغی عارضہ کی ہمہ گیر وبا ہے۔ عجیب الٹا معاملہ ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی جس قدر تیزی سے ترقی پذیر ہیں اور امریکہ و یورپ کے نام نہاد "ترقی یافتہ" ممالک اقتصادی خوش حالی سے جتنا زیادہ بہرہ اندوز ہو رہے ہیں ، دماغی مریضوں کی تعداد میں اُسی قدر اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ ذہنی امراض کے نئے نئے شفاخانے تعمیر ہونے اور گنجائش سے زیادہ بھرتے چلے جاتے ہیں۔ نیز خودکشی کرنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ دُنیا بھر کے سنجیدہ مفکّرین پر اب یہ حقیقت آشکارا ہو چکی ہے کہ اس صُورتِ حال کا ذمّہ دار ، بڑی حد تک ، وہ مادّہ پرستانہ فلسفہ ہے جو پُوری دُنیا میں اختیار کیا جا چکا ہے۔

مروّجہ ہم عصر فلسفہ کی رُو سے کائنات اور اس کی جاندار مخلوقات کی تخلیق محض ایک حادثہ کا نتیجہ تھی۔ نسلِ انسانی ارتقاء کے میکانکی عمل کی بدولت حیوانی حالت کے پست تر مدارج سے بتدریج گزرتی ہوئی ہزاروں سال میں مرتبۂ انسانیت کو پہنچی ہے۔ چونکہ قانونِ فطرت لاشخصی ہے اس لیے اُس کا نہ تو کوئی تعلق اخلاقی قانون سے ہے نہ افراد کی ذاتی زندگیوں سے۔ پھر چونکہ زندگی کا انحصار نامیاتی مادّہ پر ہے اس لیے رُوح کو دوام حاصل

نہیں ہو سکتا۔ شعور و احساس دماغ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ زندگی بس یہی دنیا کی زندگی ہے اور انسان کی انفرادی شخصیت کو مرنے کے بعد کوئی چیز محفوظ نہیں رکھ سکتی؛ چنانچہ انسان جو عدم سے وجود میں آیا ہے، مرنے کے بعد فطرۃً اسی طرح نیست ہو جائے گا جس طرح کہ وہ اپنی ماں کے رحم میں حمل کی صورت اختیار کرنے سے پہلے تھا۔ بنابریں آخرت کے متعلق کسی قسم کا تصور محض خوش خیالی ہے۔ انسان کی غرض و غایت یہ ہے کہ وہ کسی مافوق الفطرت ہستی کی مدد کے بغیر اپنی زندگی کے احوال کو اس طرح ڈھالے کہ انتہائی راحت و مسرت اور مادی فلاح و بہبود سے ہمکنار ہو جائے۔

ذہنی صحت کے سلسلے میں سیگمنڈ فرائیڈ (۱۸۵۶ء — ۱۹۳۹ء) کو عصرِ جدید کا امام سمجھا جاتا ہے۔ آج ذہنی و اعصابی امراض کا جو نفسیاتی علاج رائج ہے وہ زیادہ تر اسی شخص کے نظریات پر مبنی ہے۔ فرائیڈ نے اپنا بنیادی نظریہ کافر یونانیوں کی دیومالا سے اخذ کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ انسانی کردار زیادہ تر ذہنی لاشعور کے جبری اور جبلی میلانات کا نتیجہ اور اپنی اصل کے اعتبار سے تقریباً تمام تر جنسی اور شہوانی ہوتا ہے۔ اس کی رائے میں دماغی عوارض کا سبب انسان کی وہ ناآسودہ تکمیل جنسی خواہشات ہوتی ہیں جنہیں کوئی مہذب معاشرہ برداشت نہیں کرتا۔

فرائیڈ کا نظریہ کہتا ہے کہ انسان کا ذہن بالکل خوردسالی ہی سے ایسے جذبات سے معمور ہوتا ہے جو اس کی اپنی ذات اور دوسروں کے لیے تباہ کن ہوتے ہیں۔ نیز یہ کہ نسلِ انسانی کے تمام روحانی اور مادی کارنامے جنسی میلان کے ارتفاع و تہذیب کے سوا اور کچھ نہیں ہیں۔ جیسا کہ فرائیڈ لکھتا ہے:

"یہ بات درست نظر نہیں آتی کہ کائنات میں کوئی ایسی طاقت موجود ہے جو پدرانہ فکر و تردّد کے ساتھ ایک ایک فرد کی فلاح و بہبود کا خیال رکھتی اور اپنے حلقۂ شفقت میں شامل سبھی لوگوں کو مبارک و مطمئن انجام سے

ہمکنار کرتی ہے۔ اس کے برعکس انسانوں کے نصیبے انصاف کے کسی بھی عالم گیر اصول سے متضاد و متباین ہیں۔ یہ بات بھی کسی طرح درست نہیں ہے کہ نیکی کا صلہ ملتا ہے اور بدی کی سزا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ زبردست، عیار اور بے ایمان لوگ دنیا کی خاطر خواہ منفعتوں پر چھین جھپٹ کر قابض ہو جاتے ہیں اور نیک اور خدا ترس تہی دست رہ جاتے ہیں۔ خدائی انصاف کے اس تصور کا کہیں وجود نظر نہیں آتا، جو مذہب کے بموجب دنیا بھر میں حکمران ہے۔ سائنس کی عظمت کو گھٹانے کی کوئی کوشش اس حقیقت کو بدل نہیں سکتی کہ وہ ہمیں حقیقی خارجی دنیا پر انحصار کرنا سکھاتی ہے، جب کہ مذہب محض ایک طفلانہ وہم ہے اور اپنی قوت ان اتفاقات سے اخذ کرتا ہے جو ہماری فطری آرزوئیں پوری کرنے کے لیے ناگہاں پیش آجاتے ہیں۔ جو لوگ اس صورتِ حالات سے غیر مطمئن ہیں اور اپنے ذہن کے وقتی اطمینان کے لیے کسی اور چیز کی جستجو میں ہیں۔ انہیں یہ چیز جہاں سے دستیاب ہو سکتی ہے اس طرف رجوع کرنا چاہیے، ہم ان کی مدد کرنے سے قاصر ہیں۔"

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ملحد اور مادہ پرست لوگ مذہبی عقیدہ کو محض منفی نظریات کے بل پر رد کرتے ہیں۔ نیز اُن کے پاس انسان کی رُوحانی ضروریات کو پُورا کرنے کے لیے ایسی کوئی شے نہیں ہے جو مذہب کی جگہ لے سکے۔ یہ بات مشکوک ہے کہ سیگمنڈ فرائیڈ کے نظریات نے انسانی مصائب کی تخفیف میں کوئی تعمیری حصہ لیا ہے۔ ان نظریات کے مقبول اور مؤثر قوت ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ مادہ پرستانہ فلسفہ کے اس عام رُجحان کو تقویت بخشتے ہیں جو انسان کو مرتبۂ انسانیت سے گرا کر جانور کی سطح پر لا کھڑا کرتا ہے۔ لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ذہنی نظریہ کو اپنانے کے بعد کسی آفت و نکبت کے مارے ہوئے شخص کے لیے خودکشی کے سوا اور کیا چارہ کار رہ جاتا

ہے؟ اگر مذہب ایک طفلانہ وہم ہے تو مادہ پرستوں کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے کہ انسان کو اگر سلامتیٔ عقل و ہوش مطلوب ہے تو پھر اس کی ان جبلی خواہشات کو کس طرح پورا کیا جا سکتا ہے، جو زمان و مکان سے ماورا پوری نوعِ انسانی میں عالمگیر بنیادوں پر پائی جاتی ہیں۔

دماغی "تعطل" کے چند بڑے اسباب حسبِ ذیل ہیں:-

۱۔ اپنے آپ سے نفرت۔

۲۔ مصیبت کو برداشت نہ کر سکنا۔

۳۔ دنیاوی کامیابی کے حصول میں ناکامی۔

۴۔ مستقبل کے متعلق خوف اور پریشانی۔

۵۔ یہ وسوسہ کہ انسان کی زندگی کوئی بنیادی اہمیت نہیں رکھتی۔

موت اپنے وقت پر بجائے خود ایک عمدہ اور کارآمد شئے ہے۔ کبھی کبھار یہ نوجوان، صحت مند، خوش نصیب اور نافع افراد کے لیے بھی قرینِ مصلحت ہوتی ہے۔ بوڑھوں، بیماروں، دکھیوں اور امید و رجاء سے محروم زندگی بسر کرنے والوں کے لیے تو واقعی نہایت تسکین ہے۔ بنابریں وہ شخص جو بعض خاص حالات میں اپنی موت کا وقت خود منتخب کرتا اور بڑے شاندار طریقے سے دُنیا سے رخصت ہو جاتا ہے، ہمارے افسوس و تاسف اور لعنت و ملامت کے بجائے عزت و احترام کا مستحق ہے[1]

اسلام "ذاتی تحفظ" کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ چونکہ صحیح معنوں میں ایک مسلمان فرد خود مجسّم اسلام ہے اس لیے اس کے بغیر اسلام زندہ نہیں رہ سکتا۔ مسلمان کا فرض ہے

---

[1] *People!* A Plea for Universal Birth Control, William Vogt, Hillman Books, New York, 1961, pp. 28-29.

کہ وہ اپنے جسم و جان کی حفاظت کرے اور اس مقصد کو بنیادی اہمیت دے۔ اس سلسلے میں صرف ایک استثنائی صورت ہے۔ جب مسلمان کی انفرادی بہبود معاشرہ کی اجتماعی فلاح سے اس طرح متصادم ہو جائے کہ ایک کا حصول دوسرے کو نقصان پہنچائے بغیر ممکن نہ ہو۔ اُس وقت مسلمان مجبور ہے کہ وہ اپنی ذات پر معاشرہ کو ترجیح دے اس لیے کہ وہ اس معاشرہ کا ایک جزو ہے اور کسی چیز کے جزو کو اُس چیز سے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی؛ چنانچہ جب جہاد کے لیے مسلمان کو پکارا جائے تو اُس وقت اُسے یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنی جان بچانے کے لیے گھر میں بیٹھا رہے۔ اس ایک استثنیٰ کے علاوہ وہ نہ تو اپنے آپ کو ارادتاً کوئی ضرر پہنچا سکتا ہے اور نہ کسی ایسے فعل کا مرتکب ہو سکتا ہے جس سے اتلافِ ذات کا اندیشہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان کو لحم خنزیر ایسی نجس اور غلیظ غذائیں کھانے کی اجازت نہیں۔ کیونکہ وہ اس کی جسمانی، دماغی اور اخلاقی صحت کے لیے مضر ہیں۔ اسی طرح زہریلے مشروبات یا مغشیات مثلاً مخدرات یا الکوحل وغیرہ پینے کی ممانعت کر دی گئی ہے، جو انسان کے جسم اور ذہن کو تباہ کر دیتے ہیں۔ مزید براں اُسے کسی قسم کی بے اعتدالی کا عادی ہونے کی بھی اجازت نہیں کیونکہ ان سب کا نتیجہ اتلافِ جان کی صورت میں نکلتا ہے۔ اُسے حکم ہے کہ وہ دوسرے لوگوں سے محبت کرے اور اُن کا ہاتھ بٹائے تاکہ لوگ بھی اس سے محبت کریں اور بوقتِ ضرورت اُس کو سہارا دیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اُسے ہر حالت میں خودکشی سے روکا گیا ہے۔

عَنْ ابی ھریرۃ رض قال قال رسولُ اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم الذی یخنق نفسہٗ یخنقھا فی النّارِ والذی یطعنھا یطعنھا فی النّارِ (بخاری)

"ابوہریرہ رض کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اپنا گلا گھونٹتا رہے گا اور اپنے آپ کو نیزہ مار کر مر جائے گا دوزخ میں بھی وہ

اپنے آپ کو نیزہ مارتا رہے گا۔"

اسلام خودکشی کو بدترین جرم قرار دیتا ہے۔ زندگی اور موت اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے وقوع پذیر ہو سکتی ہے۔ خودکشی کا فعل درحقیقت یہ ثابت کرتا ہے کہ اس کے مرتکب کا نہ تو اللہ تعالیٰ پر ایمان ہے اور نہ آخرت کی زندگی پر۔ یہی وجہ ہے کہ سچے مسلمانوں کا معاشرہ خودکشی سے فی الواقع بالکل بیگانہ رہا ہے۔

معاشرتی انتشار جو آج کے نام نہاد "ترقی یافتہ" ممالک کا امتیازی خاصا بن چکا ہے، لاتعداد ذہنوں کی تباہی کا ذمّہ دار ہے۔ ڈاکٹر محمد نسیم اپنے مضمون "فلاحی ریاست کی دوہری مشکل ——— بہتات کے درمیان تنہائی" میں لکھتے ہیں:۔

جدید معاشرہ انفرادیت پر جس طرح حد سے زیادہ زور دے رہا ہے اس سے خاندانی روابط ٹکڑے ٹکڑے ہو چکے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ ہمسایوں، بلکہ دوستوں اور رشتہ داروں تک کی حالت سے اعراض و غفلت کا نتیجہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ تنہائی کی مصیبت سے دوچار ہو رہے ہیں۔ ادھیڑ عمر کے سیکرٹری، سرکاری ملازمین، اساتذہ، نرسیں حتیٰ کہ ڈاکٹر تک تنہائی کے شاکی ہیں۔ اُن کا پیشہ لوگوں سے تعلق رکھتا ہے۔ فطری اعتبار سے وہ تنہائی پسند بھی نہیں ہیں، لیکن شہر میں انہیں ذاتی تعلقات قائم کرنے کا کوئی موقع نہیں ملتا۔ چنانچہ وہ یکا و تنہا رہنے پر مجبور ہیں۔ نوجوانوں اور بوڑھوں کی تنہائی کی جڑیں یکساں نوعیت کی بے کیفی میں پنہاں ہیں۔ ایک برسرِ کار ہے دوسرے کو پنشن ملتی ہے، لیکن انہیں کسی اور چیز کی بھی ضرورت ہو سکتی ہے، اس کے متعلق کسی کو کوئی فکر و تردّد نہیں ہے۔۔۔۔۔۔۔ سن رسیدہ لوگوں کی حالت تو بے حد قابلِ رحم ہے۔ گٹھیے یا وجعِ مفاصل کے مریض، اکثر کانوں سے بہرے اور بعض اوقات بینائی سے محروم ایک کمرے یا فلیٹ

میں بڑی بے بسی کے عالم میں پڑے رہتے ہیں۔ بچے اور یار دوست عموماً پہلے ہی مر چکے ہوتے ہیں۔ انہیں سب سے زیادہ یہ اندیشہ لاحق رہتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو وہ بیمار ہو جائیں یا چل بسیں اور کسی کو خبر تک نہ ہونے پائے۔ بے مونس و غم خوار لوگوں کی تعداد برطانیہ اور دوسرے مغربی ممالک بلکہ امریکہ تک میں گزشتہ بیس برس سے برابر بڑھ رہی ہے اور وہ ملک، جن کی حرکت پذیری کی صلاحیت جیسے جیسے بڑھتی جاتی ہے لاشخصیت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے ان کے عام ڈاکٹروں، امراض دماغی کے ماہروں اور سماجی کارکنوں کے لیے یہ ایک سنگین مسئلہ بن چکا ہے۔ انگلستان کے ہسپتالوں میں ایک تہائی مریض دماغی امراض کا شکار ہوتے ہیں اور سینکڑوں تنہائی کی زندگی کا تناؤ برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے خودکشی کر لیتے ہیں[1]۔"

یہی وجہ ہے کہ اسلام شادی بیاہ اور صحت بخش خاندانی زندگی کی فیصلہ کن اہمیت پر بہت زیادہ زور دیتا ہے۔ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مسلمانوں کو چاہیئے وہ اپنے چھوٹوں پر شفقت کریں اور بزرگوں کے ساتھ عزت و احترام سے پیش آئیں۔ ایک مرتبہ ایک بدّو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اقبال کیا کہ میرے دس بچے ہیں، مگر مَیں نے کبھی کسی کو نہیں چُوما، حضورؐ نے اُسے سخت سرزنش کی۔ اِسلام مسلمانوں کو اپنے خاندان کے افراد ہی سے محبّت کرنے اور ان کا ہاتھ بٹانے کا حکم نہیں دیتا بلکہ یہ بھی لازمی قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے پڑوسیوں اور دُوسرے دینی بھائیوں کے ساتھ باہمی اشتراک و معاونت کے گہرے تعلقات قائم رکھیں۔ اتحاد و اخوّت کا یہ قوی شعور ذہنی صحت کو محفوظ رکھنے کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔

---

[1] *The Light*, Lahore, February 1, 1966, pp. 1-2.

اسلام کی رُو سے دنیا کی زندگی کوئی تفریحی سفر نہیں ہے بلکہ بڑی ہی شدید آزمائش ہے جس کے نتائج آخرت میں حقیقت کا جامہ پہنیں گے۔ بنا بریں انسان اس دنیا میں جن بدبختیوں اور مصیبتوں سے دوچار ہوتا ہے، وہ قطعی اہمیت نہیں رکھتیں بلکہ ان کے ذریعے تو یہ جانچا جاتا ہے کہ کوئی شخص اپنے ایمان کے دعوے میں کس حد تک سچا اور ثابت قدم ہے۔

جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ۔

(البقرہ : ۱۵۵)

"اور ہم ضرور تمہیں خوف و ہراس، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصان اور پھلوں کی کمی سے تمہاری آزمائش کریں گے اور (اے پیغمبر) صبر کرنیوالوں کو خوش خبری دے دو۔"

أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُم مَّثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلِكُم مَّسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ ۗ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ۔ (البقرہ : ۲۱۴)

"کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم یوں ہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تم اُن واقعات سے دوچار نہیں ہوئے جو تم سے پہلے ایمان لانے والے لوگوں کو پیش آ چکے ہیں۔ اُن پر ہر طرح کی سختیاں گزریں، مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے، ہلا مارے گئے، حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اس کے مومن ساتھی پکار اُٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی ——— (اس وقت انہیں تسلی دی گئی کہ)

ہاں اللہ کی مدد قریب ہے۔"

لَتُبْلَوُنَّ فِي أَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ۔ (آل عمران : ۱۸۶)

"تمہیں جان و مال کی آزمائش میں ضرور مبتلا کیا جائے گا۔"

أَحَسِبَ النَّاسُ أَن يُتْرَكُوا أَن يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ۔ (العنکبوت : ۲)

"کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ انہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ صرف یہ کہنے سے کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور ان کو آزمائش کی بھٹی میں نہیں ڈالا جائیگا۔"

قرآن و حدیث ہمیں بتاتے ہیں کہ اس دُنیا میں اہلِ ایمان کو اس لیے مصائب میں مبتلا کر دیا جاتا ہے کہ اُن کے گناہ دُھل جائیں، وہ موت کے بعد سزا سے بچ جائیں اور آخرت کے عظیم تر انعامات سے بہرہ اندوز ہو سکیں۔

عن ابی هریرةؓ قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من یرد الله به خیرًا یصب منه (بخاری)

"ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ جب کسی شخص کے ساتھ بھلائی کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ بھلائی حاصل کرنے کے لیے مبتلائے مصیبت ہو جاتا ہے۔"

عن انسؓ قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اِذا اراد الله تعالیٰ بعبده الخیر عجّل له العقوبة فی الدنیا واِذا اراد الله بعبده الشرّ امسک عنه بذنبه حتی یوافیه بیوم القیٰمة - (ترمذی)

"انسؓ کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندہ کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو دنیا ہی میں جلد سزا

دے دیتا ہے اور جب وہ کسی بندہ کے ساتھ بُرائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے گناہوں کی سزا روک لیتا ہے تاکہ قیامت کے دن وہ اسے پوری پوری سزا دے۔"

کسی افتاد کو پُرسکون ذہن کے ساتھ صبر سے برداشت کرنا ہی سچے مسلمان کا نشان ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِينَ - (البقرہ: ۱۵۳)

"اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے۔"

وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِينَ صَبَرُوا أَجْرَهُم بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ - (النحل: ۹۶)

"اور اُن لوگوں نے جنہوں نے صبر سے کام لیا، ہم ضرور ان کے اعمال کا بہترین اجر دیں گے۔"

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ - (البقرہ:)

"اور صبر اور نماز سے مدد لو، بیشک یہ ایک سخت مشکل کام ہے مگر عاجز و خاکسار بندوں کے لیے (کچھ مشکل) نہیں۔"

إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ - (العصر: ۳)

"یقیناً انسان گھاٹے میں ہے سوائے اِن لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے اور جو ایک دوسرے کو حق (کی پیروی کرنے) اور صبر (سے کام لینے) کی تاکید کرتے رہے۔

عَنْ أَنَسٍ قَالَ مَرَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِامْرَأَةٍ

تبكي عِندَ قبرٍ فقال اتقي الله واصبري قالت اليك عني فانك لم تُصَبْ بمصيبتي ولم تعرفه فقيل لها انه النبي صلى الله عليه وسلم فاتت باب النبي صلى الله عليه وسلم فلم تجد عنده بوابين فقالت لم اعرفك فقال انما الصبر عِندَ الصدمة الاولى (بخاری ومسلم)

"انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک عورت کے پاس سے گزرے جو ایک قبر پر بیٹھی رو رہی تھی۔ آپ نے اُس سے فرمایا: "اللہ سے ڈر اور صبر کر۔" اس عورت نے حضورؐ کو نہ پہچانا۔ شدتِ غم سے پکار اُٹھی: "جس مصیبت میں میں مبتلا ہوں تو اس میں گرفتار نہیں ہوا، (تجھے اس کا کیا احساس)" اس سے کہا گیا کہ (بدبخت) وہ تو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تھے، چنانچہ وہ حضورؐ کے دروازے پر پہنچی، وہاں اسے کوئی حاجب و دربان نظر نہ آیا۔ حاضرِ خدمت ہو کر عرض کی: "اے اللہ کے رسولؐ، میں نے آپ کو پہچانا نہیں تھا" فرمایا: "صبر تو بس وہی ہے جو صدمہ کے آغاز میں کیا جائے۔"

عَنْ ابنِ مسعودٍ قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:

الصبر شطرُ الایمان - (ابونعیم)

"ابن مسعودؓ کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "صبر آدھا ایمان ہے۔"

مسلمانوں کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور انسانوں کی طرف سے عاید کردہ فرائض کو اس یقین و اعتماد کے ساتھ انجام دیں کہ اللہ تعالیٰ اُن کے ساتھ ہے اور حصولِ مقصد تک اس یقین و ایمان کے ساتھ ثابت قدم رہیں کہ —— ہمارے لیے

اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ (آل عمران ۷۳)

سچا مسلمان خالصتاً اللہ کی رضا کے لیے نیک کام کرتا ہے اس لیے کہ جو کام دُنیا کی خاطر کیے جائیں مذہب کی رُو سے اُن میں کوئی حُسن و خوبی نہیں ہے۔ بنابریں اگر دُنیا میں لوگ اُس کے انسانی فلاح و بہبود کے کاموں پر تحسین و آفرین کے پھُول نچھاور نہیں کرتے تو وہ ذرا بھی مایوس نہیں ہوتا:

اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا۔

(الدھر: ۹)

"کہتے ہیں کہ ہم تو محض اللہ کی رضا کے لیے تمہیں کھلاتے ہیں، نہ تم سے بدلے کے خواہاں ہیں نہ شکر گزاری کے۔"

جو شخص اپنے اللہ پر اعتماد کامل رکھتا ہے اور قرآن کریم اور سُنّتِ رسولؐ کی پیروی میں اپنے فرائض انجام دیتا ہے۔ اگر دنیا کی زندگی میں اس کی مساعی بارآور نہیں ہوتیں۔ تب بھی وہ کسی مایوسی اور نااُمیدی کا شکار نہیں ہوتا؛ اُسے اپنی ناکامی کا احساس تک نہیں ہوتا۔

مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ۔ (البقرہ: ۱۱۲)

"جو بھی اپنے آپ کو اللہ کی اطاعت میں سونپ دے اور عملاً نیک روش اختیار کرے اس کے رب کے ہاں اُس کے لیے اجر ہے۔"

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا۔ (الکھف: ۱۰۷)

"بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کی جائے قیام جنّتِ فردوس ہو گی۔"

لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى۔

"انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کے لیے وہ جدّوجہد کرتا ہے۔"

صحیح احادیث میں بھی آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اہلِ ایمان کو متنبّہ فرمایا کرتے تھے کہ وہ کسی شخص کی دنیوی کامیابی پر فریفتہ نہ ہوں، کسے خبر ہے کہ موت کے بعد اُس کی قسمت میں کیا لکھا ہے:

عن عمرؓ قال دخلتُ عَلٰى رَسولِ اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلّم فاذا هُوَ مضطجع علی رمالِ حصیرٍ لیس بینه وبینه فراشٌ قد اثّر الرمالُ بجنبه متکئًا عَلٰى وسادةٍ مِنْ اَدَمٍ حشوُهَا لیفٌ قلتُ یارسول الله ادعُ الله فَلْیُوَسِّعْ علی اُمَّتِكَ فَاِنَّ فارسَ والرّومَ قد وُسِّعَ علیهم وَهُمْ لا یَعْبُدُون اللّٰهَ فقالَ اَوَفی هٰذا انت یا ابن الخطاب اولٰئِكَ قومٌ عُجِّلَتْ لَهُمْ طیباتهم فِي الحیاةِ الدُّنیا وفی روایةٍ اَمَا ترضٰی ان تکونَ لهم الدُّنیا ولنا الاٰخرة (متفق علیه)

"عمرؓ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہوا آپؐ اُس وقت کھجور کے پتّوں کی چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ چٹائی کے اُوپر کوئی بوریا بستر نہ تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے پہلو میں نشان سے پڑ گئے تھے۔ حضورؐ کے سرہانے چمڑے کا تکیہ تھا جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔ میں نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسولؐ، اللہ سے دُعا فرمایئے، وہ آپؐ کی اُمّت کو بھی فراخ دستی و خوش حالی عطا فرمائے۔ فارس و رُوم کے لوگ کس قدر خوش حال ہیں، حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت نہیں کرتے۔" حضورؐ نے فرمایا: "خطّاب کے بیٹے، کیا تم بھی اسی

خیال میں ہو؟ اُن لوگوں کو تو دنیا ہی کی زندگی میں عیش و آرام کے سامان دیدیے گئے ہیں، کیا تم مطمئن نہیں ہو کہ اُن کے لیے دُنیا ہے ہمارے لیے آخرت ؟"

دماغی صحت کے سب سے بڑے دشمن دو ہیں، خوف اور پریشانی۔ مستقبل میں کیا ہو گا؟ انسان کے ذہنی توازن کو بگاڑنے کے لیے اس سے بڑھ کر پریشان کن سوال اور کوئی نہیں ہے، لیکن پختہ ایمان کے مسلمان فکر و تشویش میں ذرا بھی مبتلا نہیں ہوتے، اس لیے کہ ہم مستقبل کے پردے میں جھانک ہی نہیں سکتے۔ مستقبل صرف خدا ہی پر عیاں ہے ؛ بنابریں یہ فیصلہ کرنا ناممکن ہے کہ کون سی چیز ہمارے لیے اچھی اور قابلِ اطمینان ہو گی؟

وَعَسَىٰٓ اَنۡ تَكۡرَهُوۡا شَيۡـئًا وَّهُوَ خَيۡرٌ لَّکُمۡ‌ ۚ وَعَسَىٰٓ اَنۡ تُحِبُّوۡا شَيۡـئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّـكُمۡؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ وَاَنۡـتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۔ (البقرۃ : ۲۱۶)

"ممکن ہے کہ تمہیں ایک چیز ناگوار ہو اور وہی تمہارے لیے بہتر ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ اپنے اندر تمہارے لیے بُرائی کا سامان رکھتی ہو۔ ہر بات کا علم اللہ کو ہے اور تمہیں کوئی علم نہیں ؟"

رزق کے بارے میں فکر و تردد آج کی دنیا کا سب سے بڑا انسانی مسئلہ ہے۔ ایک کافر جب اس مشکل سے دوچار ہوتا ہے تو اس کے طرزِ عمل کا اندازہ مندرجہ ذیل مثال سے کیا جا سکتا ہے :

"سیبل اٹھارہ برس کی ایک بیوی اور دو چھوٹے چھوٹے بچوں کی ماں۔ تیسری مرتبہ پھر حاملہ ہو گئی۔ اُس کا شوہر ٹیڈ ایک معمولی مزدور تھا اور دن بھر خون پسینہ ایک کر کے تھوڑی سی رقم لے آتا تھا۔ سیبل نے بڑی دل شکستگی اور افسردگی کے عالم میں ٹیڈ سے کہا: اس بچے سے میں چھٹکارا پا کر رہوں گی خواہ مجھے جان ہی کیوں نہ دینی پڑے ؛ چنانچہ اس نے پڑوس کے ایک دوافروش سے مدد

طلب کی۔ دوافروش نے چند گولیاں اُس کے ہاتھ بیچ دیں۔ مقصد تو پورا نہ ہوا، البتہ وہ بیمار ہو گئی۔ اپنی ایک سہیلی کے مشورہ پر اُس نے ہنس کے چھلکے پر کے ذریعے اسقاط کی کوشش کی، مگر کچھ نہ بنا۔ ایسی متعدد چیزیں اس نے یکے بعد دیگرے استعمال کیں، لیکن تمام کوششیں رائیگاں گئیں۔ اپنی دھمکی پر عمل کرتے ہوئے اُس نے خودکشی نہ کی۔ بچہ اپنے وقت پر پیدا ہو گیا۔ وہ ایک ایسا نووارد تھا جس کی اس غربت زدہ گھرانے میں نہ تو باپ کو چاہ تھی اور نہ جذباتی حد تک مضطرب ماں کے دل میں اس کے لیے کسی قسم کی کوئی محبت یا مسرت [1]

اس کے برعکس ایک سچے مسلمان کا یقین و ایمان کس بات پر ہے ؟ ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے :

عن عمرؓ بن الخطاب قال سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول لو انکم توکلون علی اللّٰہ حق توکلہ لرزقکم کما یرزق الطیر تغدو خماصًا وتروح بطانًا۔

(ترمذی - ابن ماجہ)

"عمر بن خطابؓ کہتے ہیں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ اگر تم خدا پر ایسا بھروسہ کرو، جیسا کہ بھروسہ کرنے کا حق ہے تو وہ تمہیں اس طرح رزق دے گا جس طرح پرندوں کو دیتا ہے۔ وہ صبح کے

---

[1] *The Sex Life of the Modern American Teen-Ager*, Leland Glover, Belmont Books, New York, 1961, pp. 173-174.

وقت بھوکے نکلتے ہیں اور شام کو اپنے آشیانوں میں لوٹتے ہیں تو اُن کا پیٹ بھرا ہوتا ہے۔"

عن ابی ذرؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال انی لاعلم اٰیۃً لو اخذ الناس بھا لکفتھم وَ مَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا وَّیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ۔

(مسند امام احمد - ابن ماجہ)

"ابوذرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "مجھے ایک ایسی آیت معلوم ہے کہ اگر لوگ اس پر عمل کریں تو وہی ان کے لیے کافی ہو رہے (اور وہ یہ آیت ہے) مَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ ......الخ یعنی جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اُس کے لیے نجات کا راستہ پیدا کر دیتا ہے اور اُسے ایسی جگہ سے رزق عطا کرتا ہے جہاں سے اُس کو خیال و گمان بھی نہیں ہوتا۔"

عن ابن مسعودؓ قال اقرأنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اِنِّیْ اَنَا الرَّزَّاقُ ذُوالْقُوَّۃِ الْمَتِیْنِ - (ابوداؤد - ترمذی)

"عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ آیت سکھائی اِنِّیْ اَنَا الرَّزَّاقُ ....الخ یعنی بلاشبہ میں ہی رزق دینے والا اور صاحبِ قوت ہوں۔"

بزدل انسان کا اللہ تعالیٰ پر سچا ایمان و اعتقاد ہی نہیں ہوتا، کیونکہ وہ خالق سے نہیں مخلوق سے ڈرتا ہے۔ مسلمان صرف اللہ سے ڈرتا ہے۔ اُس کا ایقان ہے کہ ذاتِ خداوندی اُس کی حفاظت کے لیے کافی ہے۔ اللہ ہر وقت ہماری حفاظت کر رہا ہے اور چونکہ ہماری قسمت کا نوشتہ پہلے ہی سے طے کر دیا گیا ہے اس لیے ہمیں وقت مقررہ

سے پہلے کوئی شخص مار نہیں سکتا۔ اس عقیدہ پر یقین واذعان انسان کو جرأت و ہمت اور ذہنی طاقت سے نوازتا ہے۔

عن جابرؓ انہ غزا مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم قِبَلَ نجدٍ فلما قفل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قفل معہ فادرکتھم القائلۃُ فی وادٍ کثیر العضاۃ فنزل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتفرق الناس یستظلون بالشجر فنزل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تحت سمرۃ فعلق بھا سیفہ ونمنا نومۃً فاذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یدعونا واذا عندہ اعرابیٌ فقال ان ھذا اخترط علیَّ سیفی وانا نائمٌ فاستیقظت وھو فی یدہٖ صلتًا قال: مَنْ یمنعکَ منّی؟۔ قال: "اللہ"۔ فسقط السیفُ من یدہٖ فاخذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم السیفَ فقال: "من یمنعک منّی" فقال: کن خیرَ اٰخذٍ........ فخلی سبیلَہٗ۔ فاتی اصحابَہٗ فقال جئتکم من عند خیر الناس۔

"جابرؓ کہتے ہیں، انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں نجد کے قریب کسی مقام پر جنگ میں حصہ لیا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ واپس ہوئے۔ دوپہر کے وقت صحابہؓ ایک جگہ پہنچے جہاں بکثرت ببول کے درخت تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں پڑاؤ ڈال دیا۔ صحابہؓ درختوں کے سائے کی تلاش میں اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ببول کے ایک بڑے سے درخت کے نیچے قیام فرمایا اور اپنی تلوار درخت کے ساتھ لٹکا دی۔ تھوڑی دیر بعد ہمیں

نیند نے آلیا۔ اچانک ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سنی۔ حضورؐ ہمیں پکار رہے تھے اور آپؐ کے پاس ایک بدّو بیٹھا ہوا تھا۔ حضورؐ نے (ہمارے پہنچنے پر) ارشاد فرمایا: "میں سو گیا تھا۔ یہ شخص آیا اور میری تلوار سونت لی۔ میری آنکھ کھل گئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ننگی تلوار اس کے ہاتھ میں ہے اور کہہ رہا ہے: "تجھے میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟" میں نے کہا: "اللہ"۔ یہ سن کر تلوار اُس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ (ایک اور روایت میں ہے)۔ حضورؐ نے وہ تلوار اُٹھائی اور فرمایا: "اب بتا تجھے میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟" بدّو نے کہا: "آپؐ بہترین مواخذہ کرنے والے ہیں"...... پھر حضورؐ نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ اپنے لوگوں میں پہنچا تو کہنے لگا میں ایک بہترین انسان کے پاس سے آ رہا ہوں۔"

ایک سچے مسلمان کے ساتھ دنیا میں جو کچھ پیش آتا ہے اُس سے وہ مثبت اور تعمیری اثر قبول کرتا ہے۔ کوئی خیر و خوبی کی چیز ہوتی ہے تو اُس کے فوائد سمیٹتا ہے اور کوئی مصیبت ہوتی ہے تو صرف اُس کے مثبت پہلو کے متعلق سوچتا ہے، کیونکہ ہر تجربہ اپنے دامن میں ایک سبق رکھتا ہے۔ جب بھی وہ کسی ناگزیر المیہ سے دوچار ہوتا ہے صبر و توکّل کے ساتھ اللہ کی رضا کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے:

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۔ (التوبہ ۵۱:)

"کہو: ہمیں ہرگز کوئی (بُرائی یا بھلائی) نہیں پہنچتی، مگر وہ جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دی ہے۔ اللہ ہی ہمارا مولا ہے اور اہلِ ایمان کو اسی پر بھروسا کرنا چاہیے۔"

جو کچھ ہونا ہے ہو کر رہے گا۔ بعض لوگ اس سے بچنے کی کوشش کرتے اور

اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں، پھر جب اُفتاد آن پڑتی ہے تو غم غلط کرنے کے لیے بادہ و مے میں غرق ہو جاتے ہیں یا خودکشی کر لیتے ہیں۔ تقضائے مبرم سے فرار کی کوشش سے انسان کو ذہن و روح کی تباہی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

قنوطیت کی اسلام میں ممانعت ہے۔ یہ انسان کے اندر اُمید کی روشنی اور سعی و جہد کا جذبہ ختم کر دیتی ہے۔ دنیوی مصائب کو ختم کرنے کے لیے موت کی آرزو ناجائز ہے، کیونکہ زیادہ زندگی کی صورت میں مسلمان اپنے نیک اعمال میں اضافہ کر کے اپنے گناہوں کی تلافی اور نجات حاصل کر سکتا ہے، جب کہ موت اس موقع کو ہمیشہ کے لیے ختم کر کے رکھ دیتی ہے۔

اسلام کے پیروکاروں کے پاس مسرت سے بہرہ اندوز کرنے والی ہر شے ہے۔ لفظ "اسلام" کے معنی ہی "امن و سکون" اور "اطمینانِ قلب" کے ہیں۔ اللہ کی ذات پر (دل کا) اطمینان و سکون، اپنے آپ پر اطمینان، اپنے ہم جنسوں کے ساتھ امن و سکون اور آخرت کی زندگی میں ابدی امن و سکون ......

اسلام اور صفائی پسندی

آج مسلمان ممالک میں بے حد گندگی اور غلاظت پائی جاتی ہے۔ باہر سے آنیوالے لوگ مسلمانوں سے جو نفرت کرتے ہیں اس کی ایک بڑی وجہ یہ گندگی اور غلاظت بھی ہے۔ یہ چیز مسلمانوں کی ساری شہرت اور ساکھ پر پانی پھیر دیتی ہے۔ کسی بھی یورپی سیاح سے پُوچھیے۔ "دُنیائے اسلام کے مُلکوں اور عوام کے متعلق اُس کا کیا خیال ہے؟" آپ کو ہمیشہ ایک جواب مِلے گا: "وہ کتنے غلیظ ہیں!" افسوس ناک حقیقت یہ ہے کہ اُن کی یہ نکتہ چینی بسا اوقات اس قدر صحیح ہوتی ہے کہ خود یورپی نژاد نومسلم محض اسی وجہ سے ارتداد کے کنارے پہنچ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر میری ایک بڑی اچھی دوست ـــ ایک جرمن نومسلم ـــ بیگم فاطمہ ہیرن سَرکا ہیں۔ وہ اور ان کے شوہر اُن دنوں ایک مسلمان ملک میں اِسلامی زندگی بسر کرنے کی انتہائی کوشش کر رہے تھے۔ ۱۱؍ اگست ۱۹۶۴ء کو بیگم فاطمہ نے مجھے ایک خط میں لکھا:

"میرے شوہر اس ملک میں پھیلی ہوئی گندگی سے بے حد متنفر ہو چکے ہیں۔ ان کے دفتر کی دیواریں خصوصًا سیڑھیاں پان کی پیک سے لال سیاہ ہو رہی ہیں۔ لوگ اپنی پتلون کے بٹن باتھ روم میں نہیں اپنے میز

کی طرف واپس آتے ہوتے لگتے ہیں۔ جس ڈیوٹی پر میرے شوہر نماز کے لیے وضو کرتے ہیں دوسرے لوگ وہاں اپنے معمول کی دانت صاف کرنے بیٹھ جاتے ہیں اور پان کی سُرخی سے ارد گرد کی ہر چیز کو لال کر دیتے ہیں۔ اسی دوران میں نوکر جا کر پینے کا پانی بھرتے رہتے ہیں۔ جمعہ کے روز نہا دھو کر اور صاف ستھرے کپڑے پہن کر مسجد میں آنے کے بجائے گندے بدبودار کپڑوں میں جمع ہو جاتے ہیں ---------- پاکستان میں جس قسم کے حالات ہیں اُن کے پیشِ نظر میرے شوہر کی رائے یہ ہے کہ ہمیں اپنے ایمان کی سلامتی مطلوب ہے تو جلد سے جلد مُسلمانوں سے الگ ہو جانا چاہیئے۔ جرمنی میں وہ اپنی تبلیغی جدّ و جہد کے لیے کہیں زیادہ مفید ثابت ہو سکیں گے۔"

انہوں نے پاکستان کے مسلمان معاشرہ میں بُود و باش اختیار کرنے کی سر توڑ کوشش کی، مگر کامیاب نہ ہوتے اور اگلے سال دونوں میاں بیوی اپنی آبائی سرزمین کو لوٹ گئے۔ کس قدر اندوہناک بات ہے۔ آج کے مسلمان ممالک اپنی گندگی کی وجہ سے دنیا بھر میں بدنام ہیں، حالانکہ اسلام سے زیادہ کوئی دوسرا مذہب جسم اور ماحول کے پاک صاف ہونے کی ضرورت و اہمیت پر زور نہیں دیتا۔

عَنْ ابی مالک الاشعریؓ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم الطُّھُوْرُ شَطْرُ الایمان۔ (مسلم)

"ابو مالک الاشعری رضؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پاک صاف رہنا آدھا ایمان ہے۔"

عن جابرؓ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: مفتاح الجنّۃ الصلٰوۃ ومفتاح الصلٰوۃ الطُّھُور (مسند امام احمد)

"جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنّت کی کلید نماز ہے اور نماز کی کلید طہارت اور صفائی۔"

عن ابن عمرؓ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لا تقبل صلٰوۃ بغیر طھورٍ ولا صدقۃ من غلولٍ۔ (مسلم)

عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بغیر پاکیزگی یا وضو کے نماز نہیں ہوتی اور نہ مالِ حرام کی خیرات قبول ہوتی ہے۔"

عن ابن عمرؓ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا جاء احدکم الجمعۃ فلیغتسل۔ (متفق علیہ)

"عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص نماز جمعہ پڑھنے آئے تو چاہیئے کہ غسل کر کے آئے۔"

"عمرو بن سُلیمؓ کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جمعہ کے روز غسل کرنا ہر بالغ شخص پر فرض ہے، اُسے مسواک بھی استعمال کرنا چاہیئے اور مِل سکے تو خوشبو بھی۔ (بخاری)

اسلام کی ان تعلیمات کا مقابلہ اُس غلاظت سے کیجئے جو قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں مسیحیت کو پسند تھی:

(ابتدائی دَور کے) مسیحی جسم کی پاکیزگی کو رُوح کی آلودگی گردانتے تھے اور ان اولیاء اور بزرگوں کی سب سے زیادہ مدح و توصیف کی جاتی تھی جو

گندگی اور ٹیسل کپیل کا مکروہ مرقع ہوتے تھے۔ سینٹ اینتھاناسیوس بڑے
جوش وجذبے کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ سینٹ اینتھونی بوڑھا ضعیف ہوگیا
لیکن اس سے اپنے پاؤں دھونے کا گناہ کبھی سرزد نہ ہوا۔ سینٹ ابراہیم جو
مسیحی ہونے کے بعد پچاس برس تک زندہ رہا اتنا محتاط تھا کہ اس سارے عرصے
میں نہ تو اس نے اپنے ہاتھ دھوئے نہ پاؤں۔ ایبٹ الیگزنڈر ماضی کی تاریخ
پر جب بھی نگاہِ حزیں ڈالتا تو پکار اٹھتا تھا: "ہمارے آباء نے تو کبھی منہ تک
نہ دھویا تھا اور ہم ہیں کہ پبلک حماموں میں اکثر جانے لگے ہیں۱؎۔۔۔۔۔"

اسلام جسمانی صفائی اور حفظانِ صحت پر بہت زیادہ زور دیتا ہے۔ صفائی اور
طہارت نہ صرف دنیوی زندگی میں جسمانی صحت برقرار رکھنے، بلکہ آخرت کی زندگی میں
رُوح کی نجات کے لیے بھی ضروری ہے۔ رفعِ حاجت اور گہری نیند سے اُٹھنے کے بعد
نماز سے پہلے وضو نہایت ضروری ہے۔ جمعہ اور عیدین کی نماز سے پہلے اور جماع،
احتلام، حیض، بچے کی ولادت اور میت کو نہلانے کے بعد غسل کرنا واجب ہے۔ یورپ
اور امریکہ کے نام نہاد "ترقی یافتہ" ممالک میں بھی آج صفائی اور طہارت کے ان لازمی امور
پر عمل نہیں کیا جاتا۔

اسلام دانتوں اور منہ کی صفائی کی بہت زیادہ تاکید کرتا ہے۔

عن عائشۃ قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

السواک مطھرۃ للفم مرضاۃ للرب (بخاری)

"عائشہؓ کہتی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسواک منہ کو

۱؎ *Islam and the World*, Abul Hasan Ali Nadawi, pp. 117.

پاک صاف کرتا ہے اور پروردگار کی خوشنودی و رضا کا باعث ہے۔"

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
لولا ان اشق علی امتی لامرتھم بالسواک عند کل صلوٰۃ۔

(بخاری و مسلم)

"ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر یہ
خیال نہ ہوتا کہ میری امت مشکل میں مبتلا ہو جائے گی تو میں انہیں حکم دیتا کہ وہ
ہر نماز کے وقت مسواک کریں۔"

کھانا کھانے کے بعد کلی کرنا اور دانت صاف کرنا بھی سنّت ہے۔ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم پاک صاف منہ کو اس قدر اہمیت دیتے تھے کہ اپنی وفات سے پہلے
آپؐ نے جو آخری کام کیا وہ مسواک کا استعمال تھا۔ منہ کی صفائی کے متعلق اسلام کی تعلیمات
پر اگر ان نام نہاد "ترقی یافتہ" ممالک میں جہاں دانتوں کی خرابی اور گندی سانس عام
ہے، سختی کے ساتھ عمل کیا جائے تو بے خوف و خطر یہ پیشین گوئی کی جاسکتی ہے کہ دندان
سازوں کا کاروبار مندا پڑ جائے گا۔

مسلمانوں پر اپنے جسم کو پاک صاف رکھنا ہی فرض نہیں ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے
کہ اُس کا لباس ناپاک نہ ہو۔ اس مقصد کے لیے رفعِ حاجت کے بعد مٹی کے ڈھیلوں سے
استنجا کرنا لازمی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ عذابِ قبر کی ایک وجہ
یہ بھی ہے کہ آدمی اپنے کپڑوں کو بول و براز کے چھینٹوں اور نجاست سے بچانے کی احتیاط
نہ کرے۔

عن ابی ھریرۃ قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا اتی
الخلاء اتیتہ بماء فی تور او رکوۃ فاستنجی ثم مسح یدہ علی
الارض ثم اتیتہ باناء آخر فتوضأ (ابوداؤد)

"ابوہریرہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بیت الخلاء میں جاتے، میں آپ کے لیے پیالہ یا ڈولچے کی، چھاگل میں پانی لاتا۔ حضورؐ اس سے استنجا کرتے، پھر ہاتھ زمین پر رگڑتے، پھر میں پانی کا ایک اور برتن لاتا اور حضورؐ وضو فرماتے۔"

عن ابی هریرۃ قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم

تقبل صلوۃ من احدث حتی یتوضاء (بخاری و مسلم)

"ابوہریرہ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے وضو کی نماز قبول نہیں کی جاتی جب تک وہ وضو نہ کرے۔"

اس معمول سے تو مغربی ممالک کے لوگ بالکل ناآشنا ہیں۔ وہ "ٹائلٹ پیپر" استعمال کرتے ہیں جو اس مقصد کے لیے ناکافی ہے۔

نماز کے لیے جسم اور لباس کا پاک صاف ہونا ہی ضروری نہیں ہے بلکہ نماز کی جگہ کا بھی گندگی اور نجاست سے پاک ہونا چاہیئے۔ صرف ایسی نماز ہی اللہ کے نزدیک قابلِ قبول ہو سکتی ہے۔ اس حکم کی بنا پر لازمی ہو جاتا ہے کہ مسلمان اپنے گھر اور گلی کوچے صاف ستھرے رکھیں، اس لیے کہ اسلام کے نزدیک کل روئے زمین مسجد ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بول و براز کی حاجت ہو تو مناسب جگہ تلاش کر کے بیٹھو۔

عن جابرؓ قال کان النبی صلی الله علیه وسلم اذا اراد

البراز انطلق حتی لا یراہ احد۔ (ابوداؤد)

"جابرؓ کہتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم پاخانہ کو (جنگل میں) جانے کا ارادہ فرماتے تو ایسی جگہ تشریف لے جاتے کہ آپ کو کوئی نہ دیکھتا۔"

کس قدر شرمناک بات ہے کہ دورِ جدید کے مسلمان اپنے عمل سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تعلیمات کی تضحیک کرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں لاہور میں یہ منظر عام دیکھنے میں آتا

ہے کہ مرد (بلکہ بعض اوقات عورتیں بھی) بھرے پرے گلی کوچوں میں ساری دنیا کے سامنے پیشاب کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔

عن معاذؓ قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اتقوا

الملاعن الثلاثة البراز فی الموارد وقارعة الطریق والظل۔

(ابوداؤد)

"معاذؓ کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین چیزوں سے بچو جو لعنت پھٹکار کا موجب ہیں (۱) بول و براز کرنا دریا کے گھاٹ پر (۲) راستہ کے درمیان اور (۳) سایہ میں۔"

پبلک مقامات پر تھوکنے کی بھی حدیث میں مذمت کی گئی ہے۔

عن انسؓ قال رأی النبی صلی الله علیه وسلم نخامة

فی القبلة فشق ذلك علیه حتی رُئی فی وجهه فقام فحكه

بیده...... ثم اخذ طرف ردائه فبصق فیه ثم

رد بعضه علی بعض فقال او یفعل هكذا۔ (بخاری)

"انسؓ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں قبلہ کی جانب بلغم پڑا ہوا دیکھا تو آپ کو بے حد ناگوار ہوا، اتنا ناگوار کہ اس کے آثار چہرۂ مبارک پر ظاہر ہو گئے۔ آپ اُٹھے اور اپنے ہاتھ سے اُسے کھرچ ڈالا اس کے بعد آپ نے اپنی چادر کے کونے میں تھوکا اور اس کو مَل کر فرمایا کہ اس طرح کرنا چاہیئے۔"

حدیث میں تنبیہ کی گئی ہے کہ کوئی شخص اپنے پڑوسی کے گھر کے سامنے پھل وغیرہ کے چھلکے اور دوسرا کوڑا کرکٹ پھینک کر اُسے دُکھ نہ دے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سنت یہاں لاہور میں جیسے بالکل فراموش کی جا چکی ہے۔ یہاں گلی کوچے نہایت

گندے ہیں، جگہ جگہ غلاظت اور کوڑا کرکٹ کے ڈھیر اور ڈرم وغیرہ پڑے ہیں اور شہر والوں کی زندگی دو بھر کیے دے رہے ہیں۔

آج کل عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ صفائی، خصوصاً شہر اور گلی کوچوں کی صفائی جدید مغربی تہذیب کی ٹیکنالوجی اور سائنس کا خصوصی کارنامہ ہے۔ یہ محض ایک غلط مفروضہ ہے۔ اسلامی تہذیب نے سب سے پہلے اپنے علمبرداروں کو یہ عمرانی و تمدنی شعور عطا کیا۔ آج بھی دُور افتادہ مسلمان شہروں اور قصبات میں یہ شعور مفقود نہیں ہے۔ محمد اسد نے اپنی کتاب میں سعودی عرب کے ایک ایسے ہی شہر کا ذکر کیا ہے جہاں وہ ۱۹۳۲ء میں گئے تھے اور یہ وہ زمانہ تھا جب اس شہر کو جدید تہذیب کی ہوا تک نہ لگی تھی۔

"حائل بغداد یا مدینہ سے کہیں زیادہ عرب شہر ہے۔ یہاں غیر عرب ملکوں اور لوگوں کا کوئی عنصر نہیں تھا۔ یہ تازہ دوہے ہوئے دودھ کے پیالے کی طرح خالص اور بے آمیزش ہے۔ بازار میں کہیں غیر ملکی لباس نظر نہیں آتا۔ بس ہر طرف عرب عبائیں، کفیہ اور عقال دکھائی دیتے ہیں۔ گلی کوچے مشرق وسطیٰ کے کسی بھی اور شہر سے زیادہ صاف ستھرے ہیں۔ نجد کے شہر صفائی میں دُور دُور تک مشہور ہیں، حائل ان کو بھی پیچھے چھوڑتا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کے لوگ ہمیشہ آزاد رہے ہیں۔ انہوں نے مشرق کے دوسرے تمام لوگوں سے کہیں زیادہ اپنی خودداری کو قائم رکھا ہے اور اُسے ہاتھ سے جانے نہیں دیا[1]...."

دنیائے اسلام کے ممالک اپنی گندگی میں اس قدر بدنام کیوں ہیں؟ محمد اسد نے مندرجہ بالا اقتباس میں اس کے اہم ترین سبب کی نشاندہی کی ہے۔ غربت و افلاس کا فی الحقیقت اس عجیب و غریب صورتِ حال سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور

---

[1] *The Road to Mecca*, Muhammad Asad, p. 148.

صحابہ کرامؓ اس قدر عُسرت کی زندگی بسر کرتے تھے کہ آج کے غریب ان کے مقابلے میں متمول نظر آتے ہیں۔ غربت و افلاس میں بلاشبہ صاف ستھرا رہنا خاصا مشکل ہوتا ہے، لیکن عرب ایسے گرم اور بنجر ملک میں، جہاں پانی کی بے حد قلّت تھی اور موجودہ دَور کی سہولتوں مثلاً نل کے پانی وغیرہ سے کوئی واقف نہ تھا۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے قریبی ساتھی نہ تو کبھی بے وضو رہتے تھے اور نہ اُن کے گھر اور گلی کوچے گندگی اور کوڑا کرکٹ سے اَٹے ہوتے تھے۔ اگرچہ صدیوں کی غلامی نے مسلمانوں کو ان کے جاہ و جلال اور خودداری سے محروم کر دیا ہے لیکن اب جب کہ ہم آزادی و حریّت سے ہمکنار ہو چکے ہیں ہمارے پاس اپنے مذہب کی لازمی تعلیمات پر عمل پیرا نہ ہونے کا کوئی عذر باقی نہیں رہا۔

اِسلامی اور مسیحی آداب کا تقابل

• جدید طرزِ زندگی نے انسان کو اعلیٰ درجے کے راحت و آرام سے نوازا اور خوشگوار و کشادہ معیشت مہیا کی ہے۔ یہ معیشت اپنے طور پر دنیا کی ہمہ پہلو ترقی میں ممد ہوتی ہے۔ ہم پاکستان کے رہنے والوں نے بھی برطانوی اثرات کے تحت اپنے باپ دادا کے زمانے کی بہ نسبت ان معاملات میں کچھ نہ کچھ ترقی کی ہے .... لیکن ہم مشرق کے باشندے ابھی اس معیار پر نہیں پہنچے جس پر مشرقِ وسطیٰ کے لوگ، یعنی ایرانی، ترک حتیٰ کہ عرب تک پہنچ چکے ہیں .... ہم مغربی ممالک میں جاتے ہیں تو مغربی طرزِ زندگی سے ناواقفیت کی بنا پر سماجی طور پر وہاں کے لوگوں کی نظر سے گر جاتے ہیں .... وہاں اخبارات میں اس قسم کا نقد و تبصرہ ہوتا رہتا ہے کہ پاکستان سے آنے والے اپنے اعزاز میں منعقد ہونے والی سرکاری تقریبات میں ایسے طرزِ عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مغربی لوگوں کے ساتھ معاشرتی میل جول کی اہلیت سے عاری ہیں ..... جیسا دیس ویسا بھیس ایک فرسودہ نہیں بلکہ صحیح مقولہ ہے ..... (صفحہ ۲۳-۲۴)

ہمارا جب کسی مغربی ملک میں جانا ہو تو ہمیں چاہیئے کہ وہی لباس پہنیں جو اہلِ مغرب کا معمول ہے۔ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو اپنے آپ کو مضحک اور ان قوموں کی دل لگی اور خوش طبعی کا سامان بنا دیں گے ...... (صفحہ ۵۴)[1]

یہ ہے ان لوگوں کی ذہنیت جو یورپ کی محکومی سے ملنے والی میراث کی بدولت مغربی آدابِ زندگی کو جنہیں وہ خود بھی اپنا چکے ہیں، اس قدر بلند و برتر سمجھتے ہیں کہ ہماری تہذیب و ثقافت کو بھی انہی کی میزان پر تولنا چاہتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ کے لوگ بھی مسلمان ملکوں میں آمد و رفت رکھتے ہیں لیکن وہ جیسا دیس ویسا بھیس کے "صحیح مقولہ" پر کبھی عمل نہیں کرتے۔ وہ اپنے میزبانوں کی خاطر نہ تو اپنا لباس تبدیل کرتے ہیں اور نہ اپنے آداب بدلتے ہیں۔ بلکہ درحقیقت انہیں توقع ہوتی ہے کہ دوسرے تمام لوگ ان کے آداب اپنا لیں گے۔ اگر ہم مسلمان اپنی تہذیب و ثقافت کے بارے میں احساسِ کمتری میں مبتلا نہیں ہیں تو ہمیں بھی یہی طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیئے۔

مغربی آدابِ زندگی نہ صرف یہ کہ یکسر مختلف ہیں، تقریباً ہر اعتبار سے اسلامی تعلیمات کے متناقض بھی ہیں۔ وہ مسلمان جو جدید مغربی آداب کے مطابق رہتے سہتے (یا رہنے سہنے کی خواہش رکھتے) ہیں وہ اپنی ذہنی و جذباتی غلامی ہی کا اعلان نہیں کرتے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّتِ مطہرہ کی برملا خلاف ورزی بھی کرتے ہیں۔ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے، لہٰذا کسی دوسرے مرجع و ماخذ سے کوئی چیز مستعار لے کر اس کی "اصلاح" نہیں کی جا سکتی۔

مغربی فیشن اپنانے والے مسلمان یہ دلیل دیتے ہیں کہ اسلام ایک عالمگیر دین ہے۔

---

[1] *Pakistani Manners and English Etiquette*, A. F. M. Mohsin Ali, Pakistan Press Syndicate, Dacca, 1958.

وہ کسی خاص وضع قطع کے لباس کی تخصیص نہیں کرتا، بنا بریں ہم جس معاشرہ میں رہتے ہوں اُس کے مطابق ہمیں لباس پہننے کی کھلی چھٹی ہے۔ یہ ایک غلط مفروضہ ہے۔ مسلمانوں کو کس طرح کا لباس پہننا چاہیئے؟ قرآن و سُنّت دونوں اس باب میں صاف اور واضح ہدایات دیتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے۔

وَجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَأْسَكُمْ (النّحل)

"اور (اللہ نے) تمہیں ایسی پوشاکیں بخشیں جو تمہیں گرمی سے بچاتی ہیں اور کچھ دوسری پوشاکیں بھی دیں جو جنگ میں تمہاری حفاظت کرتی ہیں۔"

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ (الاعراف)

"اے اولادِ آدم، ہم نے تم پر لباس نازل کیا ہے کہ تمہارے جسم کے قابلِ شرم حصّوں کو ڈھانکے اور تمہارے لیے جسم کی حفاظت اور زینت کا ذریعہ بھی ہو اور بہترین لباس تقویٰ کا لباس ہے۔"

گویا اسلام کے نزدیک لباس کا مقصد شرم و حیا، جغرافیائی حالات کے مطابق آب و ہوا کی سختیوں سے جسم کی حفاظت اور تن زیبی ہے۔

مغربی لباس کا سب سے بڑا مقصد نیم برہنگی ہے اور باریک شفاف کپڑوں اور نہایت تنگ اور چُست لباس کے ذریعے جسم کے قابلِ شرم حصّوں کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرنا ہے۔

عن عائشۃؓ انّ اسماء بنت ابی بکرؓ دخلت علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعلیہا ثیابٌ رقاقٌ فاعرض عنہا وقال یا اسماء انّ المرأۃ اذا بلغت المحیض لن

يصلح ان يُّرى منها الّا هذا و هذا و اشار الى وجهه وكفيه ۔ (ابوداؤد)

"عائشہؓ کہتی ہیں کہ اسماء بنت ابی بکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں ۔ اُس وقت اُن کے جسم پر باریک کپڑے تھے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف سے منہ پھیر لیا اور فرمایا : اے اسماء ، جب لڑکی بالغ ہو جائے تو مناسب نہیں ہے کہ سوائے چہرے اور ہاتھوں کے اس کے جسم کا کوئی حصہ کھلا رہے۔"

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَ يَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ۔ (النور)

"اور مومن عورتوں سے کہہ دیجئے کہ وہ بھی اپنی نظریں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت و آرائش کی نمائش نہ کریں ، سوائے اس کے جو کسی طرح چھپ نہ سکے اور اپنے سینوں پر اوڑھنی اوڑھے رہیں۔"

اسلامی لباس صاف ستھرا ، اُجلا ، مذاقِ سلیم کے مطابق اور وضع قطع میں سادگی ، سنجیدگی اور وقار کا مظہر ہوتا ہے ۔ اس کے برعکس جو لوگ مغربی لباس اس لیے زیبِ تن کرتے ہیں کہ وہ "سمارٹ" اور "فیشن ایبل" نظر آئیں ۔ مغربی فیشن سراسر اسراف اور خود نمائی سے عبارت ہے ۔

عن ابن عمرؓ قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من لبس ثوب شهرة فى الدنيا البسه الله ثوب مذلة يوم القيامة ۔ (ابوداؤد)

"ابن عمرؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : جو شخص دنیا میں شہرت کا لباس (ایسا لباس جس سے تکبر اور غرور کا اظہار ہو) پہنے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اُسے ذلت کا لباس پہنائے گا۔"

عن ابن عمرؓ ان النبى صلى الله عليه وسلم قال من جرّ ثوبه خيلاء لم ينظر الله اليه يوم القيامة (بخاری)

"ابن عمرؓ کہتے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : جو شخص اظہارِ تکبر کے لیے اپنا کپڑا نیچے لٹکائے گا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کی طرف نہیں دیکھے گا۔"

عن عمرو بن شعيب عن ابيه عن جده قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم كلوا واشربوا وتصدقوا والبسوا مالم يخالط اسراف ولا مخيلة ۔

(احمد ، نسائی ، ابن ماجہ)

"عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : کھاؤ ، پیو اور صدقہ خیرات کرو اور پہنو جب تک کہ اسراف اور تکبر کی آمیزش نہ ہو۔"

حدیث ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کس قسم کا لباس زیادہ پسند تھا۔

عن ام سلمة قالت كان احب الثياب الى رسول الله صلى الله عليه وسلم القميص ۔ (ترمذی ، ابوداؤد)

"ام سلمہؓ کہتی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام کپڑوں میں قمیص سب سے زیادہ پسند تھی۔"

عن عبادة رضی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

علیکم بالعمائم فانہا سیماء الملائکۃ وارخوھا خلف ظھورکم

(بیہقی)

عبادہؓ کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم لوگ پگڑی
باندھا کرو اس لیے کہ یہ فرشتوں کی علامت ہے اور اس کا شملہ اپنی پُشت
کی طرف چھوڑ دو۔"

عن ابی الدرداءؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

ان احسن مازرتم اللہ فی قبورکم و مساجدکم البیاض۔

(ابن ماجہ)

"ابو درداءؓ کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ بہترین
کپڑا جسے پہن کر تم اپنی قبروں اور مساجد میں اپنے اللہ سے ملو سفید کپڑا
ہے۔"

کھانے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت مسلمانوں کو اس
بارے میں بھی مفصّل ہدایات دیتی ہے۔ اور یہ ہدایات سب کی سب جدید مغرب
میں مروّج آداب سے متصادم ہیں۔

کھانے سے پہلے ہر شخص کو یہ جائزہ لینا چاہیے کہ جو غذا وہ کھانے چلا ہے،
حلال ہے یا حرام۔ اگر حرام ہے تو بالکل نہیں کھانا چاہیے، اس لیے کہ حرام غذائیں
کھانے والے شخص کی نماز قبول نہیں ہوتی۔"[1]

[1] *Al Hadis*, Maulana al Haj Fazlur Karim, Calcutta, 1938-1940, Vol. II, p. 118.

مغربی کھانے میں مختلف قسم کے الکحلی مشروبات شامل ہیں اور خنزیر کا گوشت نہ
صرف الگ طور پر مزے سے کھایا جاتا ہے بلکہ دوسرے کھانوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔
چونکہ یورپ کے لوگ جانوروں کو ذبح نہیں کرتے اس لیے متدین یہودیوں کے ذبیحے کے علاوہ
مغرب میں ملنے والا ہر قسم کا گوشت حرام ہوتا ہے۔ متدین یہودیوں کے سوا اہلِ مغرب میں
حلال و حرام کا امتیاز کلیتہً جاتا رہا ہے۔ وہ لذّتِ کام و دہن کی خاطر جو جی چاہتا ہے بے تکلّف
کھاتے ہیں۔

کھانا، جیسا کہ اب دستور بن چکا ہے، میزوں پر نہیں، فرش پر بچھے
ہوئے دسترخوان پر چُننا چاہیے۔ کھانے والا دسترخوان پر سہولت سے بیٹھ
سکتا ہے۔ چاہے آلتی پالتی مار کر بیٹھے یا ایک زانو ہو کر یا دونوں پاؤں پر۔
لیکن کسی چیز (مثلاً کرسی کی پُشت) کے ساتھ ٹیک لگا کر نہیں کھانا چاہیے۔
پھر کھانا کھانے کی نیّت کرنی چاہیے، کیونکہ آپ لذّتِ کام و دہن کی خاطر نہیں
بلکہ اپنے جسم کو اس قابل بنانے کے لیے کھا رہے ہیں کہ وہ دینی فرائض ادا کر
سکے۔ ایک ایک برتن میں کئی لوگوں کو شریک ہونا چاہیے اس لیے کہ ساتھ مل
کر کھانے میں اللہ تعالیٰ برکت عطا کرتا ہے۔ کھانا شروع کرنے سے پہلے اللہ
کا نام لینا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ کسی بھی کام کا آغاز کرتے وقت اللہ تعالیٰ
کا ذکر اسلام کا بنیادی تصوّر ہے۔[1]

مندرجہ ذیل احادیث رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت کے مطابق کھانے کے
آداب مفصّل بیان کرتی ہیں:

عن عمر بن ابی سلمۃ قال کنت غلاما فی حجر رسول

[1] *Al Hadis*, op. cit., Vol. II, pp. 118.

الله صلی الله علیہ وسلم وکانت یدی تطیش فی الصحفۃ فقال لی رسول الله صلی الله علیہ وسلم سم الله وکل بیمینک وکل مما یلیک (متفق علیہ)

"عمر بن ابی سلمۃؓ کہتے ہیں کہ میں بچہ تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر پرداخت تھا۔ (کھانا کھاتے وقت) میرا ہاتھ رکابی کی طرف تیزی سے بڑھتا (جیسا کہ بچوں کی عادت ہوتی ہے)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک دفعہ) فرمایا: بسم اللہ پڑھو، دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور اپنے آگے سے کھاؤ۔"

عن ابی عمرؓ قال قال رسول الله صلی الله علیہ وسلم لا یاکلن احدکم بشمالہ فلیأکل بیمینہ ولا یشربن بھا فان الشیطان یاکل بشمالہ ویشرب بھا۔ (مسلم)

"ابن عمرؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی شخص بائیں ہاتھ سے نہ کوئی چیز کھائے نہ پیئے، کیونکہ شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا اور پیتا ہے۔"

عن کعب بن مالکؓ قال کان رسول الله صلی الله علیہ وسلم یاکل بثلثۃ اصابع ویلعق یدہ قبل ان یمسحھا (مسلم)

"کعب بن مالکؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ (وسلم) تین انگلیوں سے کھایا کرتے تھے (یعنی انگوٹھے، انگشتِ شہادت اور بیچ کی انگلی سے) اور ہاتھ پونچھنے یا دھونے سے پہلے اس کو چاٹ لیا کرتے تھے۔"

عن جابرؓ ان النبی صلی الله علیہ وسلم امر بلعق الاصابع والصحفۃ وقال انکم لا تدرون فی ایّۃ البرکۃ (مسلم)

"جابرؓ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انگلیوں اور رکابی کو چاٹنے کا حکم دیا اور فرمایا: تم نہیں جانتے کس انگلی کے نوالے میں برکت ہے۔"

عن نُبَیْشَۃؓ قال قال رسول الله صلی الله علیہ وسلم من اکل فی قصعۃ ثم لحسھا تقول لہ القصعۃ اعتقک الله من النار کما اعتقتنی من الشیطان۔ (رزین)

"نبیشہؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص پیالے میں کھائے اور پھر اس کو چاٹ لے تو پیالہ اس کو مخاطب کرکے کہتا ہے: اللہ تعالیٰ تجھے دوزخ سے بچائے جس طرح تو نے مجھے شیطان سے بچایا۔"

عن ابی ھریرۃؓ قال اُتی رسول الله صلی الله علیہ وسلم بلحم فرفع الیہ الذراع وکانت تعجبہ فنھس منھا۔ (ترمذی - ابن ماجہ)

"ابوہریرہؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں (پکا ہوا) گوشت لایا گیا اور اس میں سے آپ کو دستی دی گئی، جو آپ کو بہت پسند تھی، آپ نے اُسے دانتوں سے نوچ نوچ کر کھایا۔"

عن عائشۃؓ قالت قال رسول الله صلی الله علیہ وسلم لا تقطعوا اللحم بالسکین فانہ من صنع الاعاجم وانھسوہ فانہ اھنأ وامرأ۔ (ابوداؤد - بیہقی)

"عائشہؓ کہتی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گوشت کو چھری سے کاٹ کر نہ کھاؤ اس لیے کہ یہ طریقہ عجمی لوگوں کا ہے بلکہ دانتوں سے کھاؤ کہ دانتوں سے کھانا لذت بخش بھی ہے اور ہاضم بھی۔"

جن لوگوں نے جدید مغربی طریقۂ خورد و نوش کو اپنا لیا ہے، جس میں کرسیاں، میزیں،

چھریاں، کانٹے اور چمچے استعمال کیے جاتے ہیں، وہ مندرجہ بالا احادیث کو مکروہ اور غیر مہذب قرار دیں گے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت کے لیے ان کے دلوں میں نفرت کے سوا اور کچھ نہ ملے گا۔ جدید دور کے "بفے" جہاں مہمان اپنی رکابیاں بھر لیتے ہیں اور گھر میں ہر کہیں کھڑے کھڑے کھاتے ہیں اسلامی آداب کے بالکل منافی ہیں۔ اسلام مطالبہ کرتا ہے کہ روٹی کا ایک ایک ٹکڑا کھاؤ۔ ایک لقمہ کا ضیاع بھی گناہ ہے۔ اس کے برعکس جدید مغربی آداب کے مطابق تمام کی تمام چیز کھا جانا معیوب ہے۔ تہذیبی شائستگی کا کمال یہ سمجھا جاتا ہے کہ آدمی تھوڑا بہت کھانا ضائع ہونے کے لیے رکابی میں ضرور چھوڑ دے۔

"نوکر کھانا کھلانے کی خدمت اشاروں پر انجام دیتے ہیں۔ اگر آپ سُوپ کا چمچہ رکھ دیتے ہیں تو یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ نوکر سُوپ کی رکابی اٹھالے خواہ آپ نے ابھی سُوپ ختم ہی نہ کیا ہو۔۔۔۔۔۔ میزبان مرد یا عورت ہر مہمان کو اشارہ سے جگہ پر بٹھاتی ہے۔ شوہر اور بیوی کو ساتھ ساتھ نہیں بٹھاتے۔ عورت کو بالعموم دو مردوں کے درمیان جگہ دی جاتی ہے ۔۔۔۔۔۔ اگر ڈنر بڑا ہو تو میزبان خاتون کے اشارہ پر عورتیں اُٹھ جاتی ہیں، مرد وہیں بیٹھے رہتے ہیں اور سگریٹ پیتے اور گپ شپ اُڑاتے ہیں۔ اُدھر عورتیں اپنی محفل الگ جا لیتی ہیں یا پاؤڈر روم میں جا کر غازہ ملتی ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد میزبان کے اشارہ پر، مرد ڈرائنگ روم میں عورتوں کے ساتھ پھر شریک ہو جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لنچ یا ڈنر محفلِ طعام سے زیادہ ایک سوشل تقریب ہے؛ چنانچہ رخصت ہوتے وقت لوگ میزبان کا شکریہ دعوتِ طعام کے لیے

ادا نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں: "شکریہ، خوب اچھا وقت گزرا۔"[1]

میاں بیوی اور نہایت قریبی رشتہ داروں کے سوا، مسلمان مرد اور عورتیں ہمیشہ الگ الگ کھاتے ہیں۔ کسی باعمل مسلمان کے لیے اس رواج سے بڑھ کر اذیت ناک کوئی چیز نہیں کہ کسی ڈنر میں ایک اجنبی عورت کو دو اجنبی مردوں کے درمیان بٹھا دیا جائے۔

اب ذرا مغربی آدابِ اکل و شرب کا مقابلہ سنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم سے کیجیے۔

"اگر اتفاق سے کھانے کا کوئی لقمہ رکابی میں سے دستر خوان پر گر پڑے تو اسے اُٹھا کر کھا لو، کیونکہ اگر ضائع کر دیا گیا تو اُسے شیطان کھالے گا۔ اگر وہ مٹی میں اَٹ گیا ہے تو کسی ایسی جگہ رکھ دو جہاں سے کوئی کُتا، بلی یا پرندہ اُٹھا لے۔ خوب پیٹ بھر کر نہ کھاؤ، بلکہ ایک تہائی پیٹ خالی چھوڑ دو۔ کھانے کے بعد اپنی اُنگلیاں اور رکابی چاٹ لو، کیونکہ اس میں برکت پوشیدہ ہے ۔۔۔۔۔۔ پھر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرو جس نے آپ کو کھلایا اور پلایا ہے۔"[2]

جدید مغربی تہذیب کو حفظانِ صحت پر مبنی صفائی پسندی پر بے حد ناز ہے۔ اہلِ مغرب مسلمانوں پر غلیظ ہونے کا الزام لگاتے ہیں، لیکن خود یہ مغربی کس قدر صاف ستھرے ہیں؟ آیئے اس کا بھی ذرا قریب سے جائزہ لے لیں۔

"ایک اور مشکل جدید اور مفیدِ صحت ہاتھ دھونے کا باسن ہے۔ اہلِ مغرب اسے ہاتھ منہ دھونے اور کلی وغیرہ کے لیے استعمال کرتے ہیں ۔۔۔۔۔۔ وہ

---

[1] *Pakistani Manners and English Etiquette*, op. cit., pp. 35-36

[2] *Al Hadis*, op. cit., Vol. II, p. 119

اس باسن کو گرم پانی سے بھر دیتے ہیں ۔ اسی میں ہاتھ منہ دھوتے اور بلغم وغیرہ
تھوکتے ہیں ۔ اگرچہ جدید مفیدِ صحت پانی مہیا کرنے کا سلسلہ خاصا ترقی
یافتہ ہے ، تاہم سرد ممالک میں اہلِ مشرق کو (اس سلسلے کا عادی نہ ہونے کی
وجہ سے) یا تو ٹھنڈا یخ پانی برداشت کرنا پڑتا ہے یا پھر گرم گرم پانی سے
وہ اپنا ہاتھ منہ جھلس لیتے ہیں ۔ جب تک وہ (اہلِ مشرق) گرم اور سرد
پانی سے بھرے ہوئے اس باسن کو استعمال کرنے کے عادی نہیں ہوتے
یہ صورتِ حال برقرار رہے گی[1]

کسی باعمل مسلمان کے لیے اس مشورہ سے بڑھ کر نامعقول بات اور کوئی نہیں ہو سکتی ۔ سُنّت کی رُو سے ایک مرتبہ نہانے دھونے میں استعمال شدہ پانی دوبارہ کام میں نہیں لایا جا سکتا ۔ مغربی طرز کا باتھ مسلمانوں کے نزدیک غلاظت کا گڑھ ہے ۔

بیڈ روم کے ساتھ ہی باتھ روم ہوتا ہے ۔ اس کمرے میں نہ صرف
نہاتے ہیں بلکہ رفعِ حاجت بھی یہیں کی جاتی ہے .... اس میں ایک
بڑے سائز کا باتھ ٹب ہوتا ہے جس میں گرم اور ٹھنڈے پانی کی
ٹونٹیاں لگی ہوتی ہیں ۔ ہر شخص اپنی پسند کے مطابق مناسب ٹمپریچر کا
پانی ٹب میں بھر لیتا ہے .... پھر اس ٹب میں بالکل برہنہ داخل
ہو جاتے ہیں اور گردن تک پانی میں بیٹھ یا لیٹ جاتے ہیں ، صابن ملنے
کے بعد یا تو پانی اپنے اوپر ہاتھ سے ڈالتے ہیں یا ہاتھ اسفنج سے اسی (گندے)
پانی میں اپنا جسم "صاف" کرتے ہیں ۔ تازہ پانی کے لیے ٹب کو خالی کرنا

[1] *Pakistani Manners and English Etiquette*, op. cit., p. 44.

اور پھر اس کے بھرنے کا انتظار کرنا پڑتا ہے ۔ اس دوران میں یا تو آدمی سرد
ہو جائے گا یا پانی کے ٹمپریچر میں فرق ہو گا اور یہ صورتِ حال بھی آرام دہ
نہیں ہو گی[2]

جدید مغربی باتھ روم غالباً مغرب کے دوسرے تمام طور اطوار سے بڑھ کر نامعقول ہے ، کیونکہ جہاں لوگ نہاتے ہیں وہیں بیت الخلاء بھی ہوتا ہے ، جسے سُنّت نے بالکل ممنوع قرار دیا ہے ۔ ایک مکروہ رواج کھڑے ہو کر پیشاب کرنا ہے ۔ مغربی طرز کے بیت الخلاء میں آدمی کے لیے اور کوئی چارۂ کار نہیں ہوتا اور کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کی اسلام نے ممانعت کی ہے ۔

پھر کموڈ یا ٹائلٹ ہے جو مشرقیوں (مسلمانوں) کے لیے سب سے بڑی
مشکل ہے ۔ رفعِ حاجت کے بعد اہلِ مغرب استنجا کے لیے ٹائلٹ پیپر استعمال
کرتے ہیں ۔ پانی کو ہاتھ تک نہیں لگاتے ۔ مشرقی مسلمانوں کے نزدیک یہ ایک
نہایت مکروہ اور غلیظ عادت ہے ۔ وہ جب تک پانی سے طہارت نہیں کر لیتے
اپنے آپ کو صاف ستھرا نہیں سمجھتے ، لیکن اگر وہ مغربی باتھ روم میں پانی استعمال
کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو مصیبت میں مبتلا ہو جاتے ہیں ۔ فرش پر بیٹھ
کر وہ ایسا نہیں کر سکتے ، کیونکہ فرش کسی حالت میں بھی گیلا نہیں ہونا چاہیے ۔
علاوہ بریں وہاں لوٹا یا مگ بھی نہیں ہوتا ۔ ایسی بڑی احتیاط کے ساتھ
مغربی اطوار کا خوگر ہونا چاہیے ۔ انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ باتھ رُوم میں
خصوصاً کموڈ کے سلسلے میں کسی قسم کی بدنظمی انہیں ہوٹل والوں یا لینڈ لیڈی
کی نظر سے گرا دے گی ۔ وہ انہیں وحشی نہیں تو غیر مہذب ضرور قرار دیں

[2] *Ibid.*, pp. 43-44.

گے۔ بہتر یہ ہے کہ وہ ان بدحواس کر دینے والے مسائل سے بچ نکلنے کی
کوشش کریں، یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو "جدید بانے" اور اپنے مشرقی
اطوار کو ترک کرنے میں کامیاب ہو جائیں لے

اسی طرح اسلامی ہدایات کو چھوڑے بغیر نہ سہی، کم از کم پامال کیے بغیر مغربی طریق
زندگی کو اپنایا نہیں جاسکتا۔ اغیار کی نقالی کے اسی جنون کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کا ارشاد ہے ——— مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ۔ جس (مسلمان)
نے کسی قوم (یعنی کفار) کی نقالی کی اُس کا شمار انہی میں ہوگا۔

لے *Ibid.*, pp. 45-47.

اسلام اور عرب تہذیب

ایک سودا جس میں ہمارے تجدد پسند مبتلا ہیں یہ ہے کہ وہ اپنے مخاطبین کو ہر ممکن طریقے
سے باور کرانا چاہتے ہیں کہ اسلامی طرز حیات کا عرب تہذیب و ثقافت، خصوصاً عربی زبان
سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کے خیال میں قرآن کریم کی کلاسیکی عربی کی اشاعت اور عربی کا
مسلمان ملکوں کی سرکاری زبان قرار دینا کسی اعتبار سے بھی اسلام کی غرض وغایت کی تکمیل میں ممد
نہیں ہو سکتا۔ غالباً وہ انگریزی اور لاطینی حروفِ ہجی کو مفید ترین گردان کر ترجیح دیں گے،
کیونکہ انگریزی آخر ایک عالمگیر زبان ہے اور اسلام ایک عالمگیر مذہب۔ یہ ہے انداز تجدد پسند
ذہن کے کام کرنے کا۔

بعض حضرات تو اس سلسلے میں غلط طور پر غلط مبحث سے کام لیتے ہیں۔ انہیں یہ ماننے
میں تامل ہے کہ نو مسلم عربی ناموں کو اپنانا پسند کرتے ہیں۔ ایک پکا تجدد پسند ہی ایسا طرز عمل
اختیار کر سکتا ہے۔ دلیل کے طور پر وہ قرآن کریم کے انگریزی مترجم محمد مارماڈیوک پکتھال (۱۸۷۵ء
۱۹۳۶ء) ایسے مشہور نو مسلموں کا نام لیتے ہیں اور بڑے اصرار کے ساتھ کہتے ہیں کہ وہ ایک
مخلص مسلمان تھے، اس کے باوجود انہوں نے اپنا انگریزی نام برقرار رکھا اور صرف "محمد" کا اضافہ
کیا۔ مارماڈیوک پکتھال کے مخلص اور سچے مسلمان ہونے میں کسے شک ہو سکتا ہے؛ قطع نظر

اس کے کہ انہوں نے اپنے لیے کونسا نام پسند کیا، دنیائے مغرب میں ان کی اہم اسلامی خدمات پر شاذ ہی حرف گیری کی جاسکتی ہے۔ تاہم یہاں سوال جائز اور مباح کا نہیں مرجح اور مستحسن کا ہے۔ اگر چہ شریعت کی رُو سے غیر عربی نام برقرار رکھا جاسکتا ہے، لیکن مستحسن یہ ہے کہ نو مسلم اپنا پُورا نام مسلمانوں کا سا رکھے اور کوئی ایسا نشان باقی نہ رہنے دے جس سے اس کی سابقہ غیر اسلامی زندگی کا پتہ چلتا ہو۔ ٹھیک یہی بات لباس کے متعلق بھی کہی جاسکتی ہے۔ مغربی لباس اگر معقول اور شائستہ ہو جیسا کہ موجودہ تنگ "ٹیڈی" لباس سے پہلے رائج تھا، تو اس کی پوشش سے اسلام کی کسی تعلیم کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ بے شک وہ جواز کی حد تک قابلِ قبول ہے، لیکن کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے اظہارِ محبت اور اتباعِ سنّت کی خاطر یہ زیادہ مستحسن نہ ہوگا کہ ہم وہ لباس زیبِ تن کریں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کو پسند تھا۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ حدیث میں مسلمانوں کو غیر مسلموں کے طور اطوار اور لباس کی نقالی نہ کرنے کی تنبیہہ کی گئی ہے تو اس عمل کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے صرف سُنّت کو سراہا اور اس کے اتباع کی ہدایت کی ہے اور یہ سنّت چھوٹے چھوٹے امور پر بھی حاوی ہے۔ مثلاً ایک طباق میں بہت سے لوگوں کا مل کر کھانا، فرش پر بچھی ہوئی چٹائیوں اور بالوں کے کمبلوں پر بیٹھنا اور سونا، داڑھی رکھنا، جُبّے اور پگڑیاں پہننا اور عربی زبان بولنا۔ بے شک یہ اعمال نماز، روزے، حج اور زکوٰۃ کی طرح فرض نہیں ہیں۔ ان کا اہتمام نہ کرنے سے آدمی گناہ گار نہیں ہوتا، لیکن انہیں ساتویں صدی کے وحشی اور ان گھڑ بدوؤں کے لیے موزوں قرار دے کر ان کا تمسخر اور تحقیر اور جدید مغربی اطوار کو فوقیت دینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی سُنّت کی تحقیر و تضحیک کے مترادف ہے۔ بھر وہ شخص اپنے آپ کو ایک اچھا مسلمان کیسے سمجھ سکتا ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے اعمال کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔

تنقیح طلب امر یہ ہے: یہ لوگ اسلام کے عرب اجزاء کی اہمیت کو گھٹانے کی

جو کوشش کر رہے ہیں، اس کا محرک کیا ہے؟ یہی عرب خصوصیات اسلام کو امتیازی وجود اور تہذیب عطا کرتی ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جس پر تجدّد پسند نہایت شدومد سے اعتراض کرتے ہیں۔ تجدّد پسند تحریک کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کو حتی الامکان زیادہ سے زیادہ توڑ کھسوٹ دیں، مگر ایسے انداز سے کہ غافل مسلمان غضب ناک ہونے نہ پائیں؛ چنانچہ وہ اسلام کے بدن سے ہڈیوں تک گوشت نوچ لینے کی سعی میں مصروف ہیں (ان کا بس چلے تو ہڈیاں بھی نہ چھوڑیں)۔ وہ اسلام کے ان تمام تصورات پر یلغار کر رہے ہیں جو اسے دوسرے مختلف نظام ہائے حیات سے الگ تہذیبی استقلال اور ٹھوس امتیازی خصوصیت عطا کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا اصرار ہے کہ اسلام چند عمومی اصولوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ان کے نزدیک اسلام رواداری، اخوت، خیر خواہی اور امنِ عالم کا نام ہے۔ اسلام سوشلزم، نیشنلزم، فلاحی ریاست، لبرلزم، عقلیت پسندی (Rationalism) نظریۂ عملیت (Pragmatism)، انسان دوستی (Humanism) اور مادّی ترقی ہے۔ تجدّد پسندوں کا اسلام اتنا لچکدار اور لامحدود ہے کہ وہ کوئی بھی چیز بن سکتا ہے اور ہر چیز ہے۔ اور جب وہ کوئی بھی چیز بن سکتا ہے تو گویا کچھ بھی نہیں رہتا؛ چنانچہ ٹھیک یہی وہ مقصد ہے جس کے لیے یہ تجدّد پسند جدّوجہد کر رہے ہیں۔

اِسلام اور فنّی کاوِش

معترضین اسلام پر ایک الزام عموماً یہ عاید کرتے ہیں کہ وہ بُت شکن، قدیم رسوم وعقائد کا دشمن، مذہب واخلاق میں کٹّر اور فنونِ لطیفہ کا سخت مخالف ہے۔ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا یہ ارشاد مروی ہے کہ اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے؛ چنانچہ ہمیں ہر کام بہ حُسن وخوبی انجام دینا چاہیئے۔ بنابریں اسلام فن کا بہ نفسہ مخالف نہیں بلکہ وہ صرف اُس کے غلط استعمال کا مخالف ہے۔ حُسن وجمال، خواہ قدرتی ہو یا مصنوعی، اس کی پیاس کم و بیش ہر انسان کی فطرت میں ہے۔ اسلام اس فطری آرزو کا گلا گھونٹنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ اُس کو بہترین راستے پر لگاتا اور مسخ ہونے اور کج روی سے باز رکھتا ہے۔ ہر تہذیب کا فن اُس کی اپنی مخصوص قدروں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اِسلامی تہذیب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ چونکہ مغربی قدریں اِسلامی قدروں کے بالکل منافی ہیں اور ایسے نظریات کی اشاعت کرتی ہیں جو ہمارے نظریات سے اصولاً متصادم ہیں اس لیے کوئی سچا مسلمان اپنے دین و ایمان کو مجروح کیے بغیر مغربی فنونِ لطیفہ کا قدرشناس نہیں بن سکتا۔ لہٰذا جو مسلمان ہندو کلاسیکل رقص، مغربی سنگت ناچ (ballet) یا امریکن جاز سے لُطف و مسرّت حاصل کرتا ہے، اس کے دین میں لازماً کوئی سخت نقص ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو فن کی

نوعیت اس قدر عالمی نہیں ہے جس قدر کہ بالعموم سمجھی جاتی ہے۔

اسلام کا اصرار ہے کہ فنی کاوش کا مقصد وحید اپنے عقیدہ اور نظامِ حیات کی نشر و اشاعت ہونا چاہیے۔ وہ "فن برائے فن" کے تصور کو بڑی سختی سے مسترد کرتا ہے۔ فن فکر و شعور کے بجائے جذبات سے بحث کرتا ہے، چنانچہ اس مقصد کے لیے بے حد مفید اور مؤثر ثابت ہوتا ہے۔ نعت رسول کے چند شعر لاکھوں دلوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات اور حضورؐ کی تعلیمات سے عقیدت و محبت کا گرم جوش جذبہ پیدا کر سکتے ہیں جب کہ حقائق پر مبنی سوانح انسان کو اس قدر متاثر نہیں کر پاتی۔ دوسری طرف بالفرض اگر اسلام کا کوئی دشمن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں گستاخی اور دریدہ دہنی سے کام لیتے ہوئے ایک نہایت فصیح نظم کہتا ہے تو وہ تاثر کے اعتبار سے کسی عام مناظرے اور مباحثے کی بہ نسبت کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوگی۔ فنی نقطۂ نظر سے دونوں کاوشیں مساوی معیار کی ہو سکتی ہیں، لیکن اوّل الذکر فن کے صحیح استعمال کا نتیجہ اور مؤخر الذکر اس کے بگاڑ کا مظہر ہوگی۔

اسلام کے معترضین فنونِ لطیفہ کے سلسلے میں درحقیقت غلط فہمی کا شکار ہیں۔ فنکار کے مقام کے متعلق دونوں معاشروں کا تصور بنیادی طور پر مختلف ہے۔ جب اسلامی تہذیب کا آفتاب نصف النہار پر تھا فن عجائب گھروں میں رکھی جانے والی تصویروں اور مجسموں کے لیے مخصوص نہ تھا۔ فی الحقیقت مسلمان شہر "فنی عجائب گھر" نام کی کسی چیز سے آشنا نہ تھے۔ مسلمانوں کا فن اُن کی عام روزمرّہ زندگی کے ہر پہلو کی نمائندگی کرتا تھا۔ اس فن کا اظہار ان کی پبلک عمارتوں کے طرزِ تعمیر، نجی مکانات، لباس، اسلحہ حتیٰ کہ کھانے پکانے کے برتنوں تک سے ہوتا تھا۔ روزمرّہ زندگی کا فنی پہلو جدید تہذیب میں تقریباً ناپید ہے۔ مادی فلسفوں کا نتیجہ حسن و خوبی سے نفرت کی صورت میں نکلا۔ پھر صنعتی اور مشینی زندگی نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ مغربی فن عملاً "قرونِ وسطیٰ" کے اواخر اور نشاۃِ نو کے

اوّلین دور سے بتدریج زوال پذیر ہے۔

اگر کسی شخص کو اسلامی فنون کے حقیقی حسن کے بارے میں کوئی شک ہے تو وہ صرف عربی اور لاطینی حروفِ تہجی کا موازنہ کرے۔ فنی نقطۂ نظر سے وہ تسلیم کرے گا کہ عربی خطاطی کے حسین و جمیل شاہکاروں کا کوئی جواب نہیں ہے۔ اسلام میں فن کا کیا مقام ہے؟ اگر کسی کو اس کے متعلق کوئی شبہ ہے تو وہ قاہرہ کی جامع ابن طولون، قرطبہ کی جامع الکبیر اور عالمِ اسلام میں تعمیر شدہ ایسی ہی ہزاروں مسجدوں کا مقابلہ فنِ تعمیر کے ان "اسٹرا ماڈرن" نمونوں سے کرے جو ہمارے شہروں کو روز افزوں بدنما بناتے چلے جاتے ہیں۔ ان نئی عمارتوں سے بڑھ کر ویران، یک رنگ اور افسردہ کوئی دوسری چیز نظر نہ آئے گی۔ جدید فنِ تعمیر میں نہ حسن و جمال ہے نہ تنوع۔ بس ایک سپاٹ سا سلسلہ ہے جو منڈی سے اسمبلی تک چلا گیا ہے۔ اہلِ مغرب کی روزمرّہ زندگی میں فن کو کوئی مقام حاصل نہیں ہے۔ مثلاً لباس کو لیجئے۔ مغربی لباس میں "فیشن" اور "اسٹائل" تو پایا جاتا ہے، مگر دلکشی اور لطافت سے عاری ہے۔ مردوں کے کپڑے غیر متنوع بھونڈے پن کا لاثانی مظہر ہوتے ہیں۔ رہا عورتوں کا لباس تو وہ خاص طور پر بازاری (commerciaiized) صنعت کے لیے بنایا گیا ہے۔ ان کا مقابلہ سعودی عرب اور مراکش وغیرہ کے روایاتی عرب لباس، فلسطینی عرب خواتین کی، ہاتھوں سے کاڑھی ہوئی پوشاکوں اور پاکستان کی مسلم خواتین کے مختلف قسم کے لباسوں سے کیجئے۔ مغربی لباس کے برعکس کس قدر لطیف، باوقار، معقول، خوبصورت اور دلکش ہیں۔ ان لباسوں کے علاوہ انتہائی نفیس خطاطی سے مزیّن قرآن کریم کے خوبصورت ترین نسخے، نمدے اور قالین، پارچات، سفال گری، پیتل کے آرائشی کام اور کانچ کے سامان سب مسلمانوں کی روایاتی دستکاری کے وہ نمونے ہیں جن سے اسلام کی روحانی اقدار کا زندہ جاوید اظہار ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے اہلِ مغرب ان سب کو حقیر گردانتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ محض گھٹیا فنون ہیں۔ ان کے خیال میں حقیقی اور اعلیٰ فن کا اظہار صرف تصویروں اور مجسموں

ہی کے ذریعے ہو سکتا ہے اور اسلام ان کی ممانعت کرتا ہے۔

کلاسیکل موسیقی کے موجد باخ اور بیتھوون کو، اوپرا میں وارڈی اور ویگنر کو، ڈرامٹک تھیٹر میں قدیم یونانی المیوں اور ولیم شیکسپیر کو، لٹریری فکشن میں دستووسکی، تھیکرے اور ہارڈی کو، مجسمہ سازی میں میکل اینجلو اور مصوری میں لیونارڈو اور ریمبرنٹ کو امریکہ اور یورپ میں نہایت عزت و تعظیم کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ لوگ "عظیم اساتذۂ فن" کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ ان کی فنی کاوشوں کی انتہائی قدردانی بجائے خود ایک مذہب بن چکی ہے۔ جو شخص ان لوگوں کی مدح و توصیف سے قاصر رہتا ہے گنوار اور غیر مہذب گردانا جاتا ہے۔

مغرب میں اعلیٰ پایہ کی موسیقی سمفونی اور اوپرا کی سمجھی جاتی ہے۔ رقص میں بلند ترین مقام سنگت ناچ (ballet) کو حاصل ہے جو سوویٹ یونین میں ارتقا کی بلندیوں پر پہنچ چکا ہے۔ تھیٹر میں ٹریجیڈی، جس کا خلاصہ قدیم یونانی ڈرامہ نگاروں نے کیا اور شیکسپیر کو اور لٹریچر میں ناول کو جو انسانی کردار کی گہری عکاسی کرتا ہے، مقام بلند و عظیم حاصل ہے۔ کلاسیکی موسیقی، رقص اور تھیٹر کی دنیا میں دو قسم کے فن کار ہوتے ہیں، نغمہ نگار اور اداکار۔ انتہائی باکمال اور معزز اداکار، رقاص اور غنائی تمثیل کی مغنی عموماً عورتیں ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس نغمہ نگار بلا شرکت غیرے مرد ہوتے ہیں۔ ان "فنونِ لطیفہ" کے کسی شعبے کے لیے اپنی زندگی وقف کر دینے کو انتہائی معزز اور شریف پیشہ سمجھا جاتا ہے اور ایسا کرنے والے کو بے حد عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ مسلّمہ "فنی عبقریت" کے حامل افراد (بالعموم نغمہ نگار) مرنے کے بعد "غیر فانی اُستادانِ فن" کی صف میں شامل کر دیے جاتے ہیں۔ کلاسیکی ناول نگار بھی حیاتِ جاوید سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔ ان کی کتابیں بار بار زیورِ طباعت سے آراستہ کی جاتی ہیں۔ انہیں "عظیم ادب" قرار دیا جاتا ہے۔ اُن کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جاتے ہیں۔ سکول میں ہر

طالب علم سے ان کے مطالعہ کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ سمفونی اور غنائی موسیقی کے موجدین کے ایجاد کردہ راگ ہر بڑے شہر کے بڑے بڑے کنسرٹ ہالوں میں بار بار گائے جاتے ہیں، اس طرح انہیں زندۂ جاوید بنا دیا جاتا ہے۔ انتہائی معظم گویوں اور سازندوں کی آواز گراموفون میں بھر کر، نیز ان کے بہترین مجسمے اور تصویریں تیار کر کے مشہور فنی عجائب گھروں میں بطور یادگار نہایت احتیاط کے ساتھ محفوظ رکھ دی جاتی ہیں۔

مسلم ممالک میں مغرب کی ثقافتی اقدار کا اثر اس قدر غالب اور قوی ہے کہ ہمارے جدید تعلیم یافتہ طبقے کے اکثر چیدہ افراد کے نزدیک ہماری "پسماندگی" کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ہمارے دیسی فنونِ لطیفہ آج تک ارتقا کی ان بلندیوں پر پہنچ نہیں پاتے۔ ہماری "ناقص" ثقافت کو "مالامال کرنے" اور "تازہ روح بخشنے" کے لیے یہ لوگ ضروری سمجھتے ہیں کہ یورپ کی ان مخصوص فنی صورتوں کو تحریک کے حساب سے درآمد کیا جائے۔ "ترقی" کے نام پر یہ لوگ شور مچاتے ہیں کہ مغربی طرز کے ثقافتی ادارے قائم کیے جائیں۔ مقصد یہ ہے کہ موسیقی، رقص، تھیٹر، سینما، لٹریری فکشن، مصوری اور مجسمہ سازی کو حتی الامکان زیادہ سے زیادہ سرکاری سرپرستی میسر ہو۔ اگر کوئی شخص ان غیر اسلامی سرگرمیوں پر اعتراض کرنے کی جرأت کرتا ہے تو اس پر "رجعت پسند جنونی" کی تہمت لگا دی جاتی ہے۔ یہاں یہ سوال خصوصیت سے پیدا ہوتا ہے کہ یہ "فنون" غیر اسلامی کیوں ہیں؟

قدیم یونان کے عہد ہی سے اہل مغرب کے نزدیک "عظیم فن" کا اکتساب بجائے خود ایک مقصد رہا ہے۔ "فن برائے فن" کی ضرب المثل اور جان کیٹس کی نظم کا مشہور اقتباس

"Truth is beauty and beauty, truth and that is all ye need to know."

(صداقت حُسن ہے اور حُسن صداقت، تمہیں اس کے سوا اور کچھ جاننے کی ضرورت نہیں ہے) اسی نقطۂ نظر کی عکاسی کرتا ہے۔ پس مغربی ذہن کے نزدیک فنی اقدار اپنی حد تک مستقل اور مکمل ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ حُسن اور صداقت کا

آپس میں کوئی ربط و تعلق بھی ہو۔ فن کار کی نجی زندگی خواہ کتنی ہی غیر اخلاقی اور فاسقانہ کیوں نہ ہو، فن کے شیدائیوں کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا؛ چنانچہ اگر کوئی فن کار گاگوین کی طرح دُختِ رَز کا والہ و شیدا ہو کر اپنے بیوی بچّوں کو بھوکوں مرنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے اور خود طوائفوں سے آتشک کا مرض پال کر مر جاتا ہے، تو پرستارانِ فن کی نظر میں اُس کے اس کردار کی کوئی اہمیت نہیں ہے، کیونکہ یہ سب کچھ وہ "فن" کی خاطر کرتا ہے۔ اس کے عبقریانہ تخلیقی کارناموں کے آگے اس کی تمام کوتاہیاں اور معائب معدوم ہو جاتے ہیں۔

فنی کاوش کا مغربی معیار، فیصلہ کُن اہمیت کے حامل کسی حقیقی موضوع کو مشکل ہی سے پرکھتا ہے؛ چنانچہ جنسی کج رویوں کی نہایت مکروہ انداز میں عکاسی کرنے والی فلموں کو سنسر کرنے کی مخالفت محض اس بنا پر کی جاتی ہے کہ وہ اپنی بے نظیر فوٹو گرافی، فصیح مکالموں اور ماہرانہ اداکاری کی بدولت ایسی عظیم فنی شاہکار بن جاتی ہیں کہ انہیں حرف گیری اور تنقید سے لازماً محفوظ اور بالاتر رہنا چاہیے۔ بالفاظِ دیگر غیر معمولی ظاہری "حُسن"، کسی قسم کے اخلاقی اطمینان کو غیر متعلق اور فضول قرار دیتا ہے۔ مغربی ثقافتی اقدار زیرِ بحث "فنونِ لطیفہ" اور بیہودہ تاجرانہ تفریح کے درمیان واضح خطِ امتیاز کھینچتی ہیں۔ یورپ اور امریکہ کے حُسن شناس حسّاس لوگ کسی کیلنڈر پر ایک کمرشل فن کار کی بنائی ہوئی کسی لڑکی کی برہنہ تصویر دیکھ لیتے ہیں تو اُسے بدنماقی اور سفلہ پن کا مرقع گردانتے اور اُس کی مذمت کرتے ہیں، لیکن اسی نوعیت کے کسی کلاسیکل یونانی مجسمہ کے متعلق ان کا ردِّ عمل مختلف ہوتا ہے۔ کیلنڈر کی برہنہ تصویر اور وینس ڈی میلو کا برہنہ مجسمہ اگرچہ ایک ہی موضوع کی ترجمانی کرتے ہیں، لیکن مؤخر الذکر کو حُسن کا لاجواب اور کامل نمونہ قرار دے کر اس کی گویا پرستش کی جاتی ہے۔ مسلمان ذہن اس قسم کا کوئی امتیاز روا نہیں رکھتا۔

یہاں اسلام اور مغرب کی ثقافتی اقدار کا سب سے بڑا بنیادی فرق عیاں ہو جاتا ہے۔ کوئی فنی شاہکار کس قسم کا تصوّر پیش کرتا ہے؟ یہ سوال مغربی ذہن کے نزدیک پرِکاہ کے برابر بھی

اہمیت نہیں رکھتا، بشرطیکہ وہ فصیح زبان، ہم آہنگ خطوط، دلکش رنگوں یا عمیق اور مؤثر جذبات کے ظاہری ساز و سامان سے آراستہ پیراستہ ہو۔ دو ٹوک الفاظ میں یوں کہنا چاہیے، مغربی ذہن جس چیز کو نادرِ روزگار فنی کاوش قرار دے کر نگاہِ احترام سے دیکھتا ہے وہ درحقیقت مادّہ پرستی اور تاریک خیالی (Paganism) ہے جسے حواس کی تسکین کی خاطر نہایت لطیف انداز میں بنا سنوار کر اور بیش بہا جامہ پہنا کر پیش کیا گیا ہے۔ ان فنی کاوشوں کی اصلی مادّہ پرستانہ فطرت کا نمایاں ثبوت اس حقیقت سے ملتا ہے کہ ان سے وابستہ گہری جذباتی نفسوریت جلد ہی بگڑ کر سفلہ پن اور فحاشی کے تحت الثریٰ میں پہنچ جاتی ہے۔ اس کی ایک عمدہ مثال قدیم یونان اور روم کی ثقافتوں کے تقابل میں ملتی ہے۔ یہ دونوں ثقافتیں اگرچہ کفر کی تاریک خیالی (Paganism) اور مادّہ پرستی میں یکساں ڈوبی ہوئی ہیں، تاہم یونانیوں نے اپنی فنی کاوشوں کو انتہائی دلکش جامہ پہنانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ اس کے برعکس رومی اس اہتمام کی زحمت زیادہ مدت گوارا نہ کر سکے۔ یہی بات یورپی نشاۃِ ثانیہ اور عصرِ حاضر کا موازنہ کرتے وقت صادق آتی ہے۔ عصرِ حاضر کوئی بیتھوون، ریمبرانٹ یا شیکسپیئر پیدا نہیں کر سکا، کیونکہ مغربی معاشرہ مادّہ پرستی کے زیرِ اثر اس قدر بگڑ چکا ہے کہ ظواہرِ حُسن کی تشنگی اور طلب تک ختم ہو چکی ہے؛ چنانچہ فن کار اپنے فن کا اظہار انتہائی خالص برہنہ بیہودگی کی صورت میں کرتے ہیں۔

کوئی غیر ملکی جب لاوور (پیرس) یا میٹرو پولیٹن (نیو یارک) ایسے مشہور عجائب گھروں کی سیر کو جاتا ہے تو وہاں اسے ایک عبادت گاہ کا سا ماحول نظر آتا ہے۔ ہر ناظر کو بچپن ہی سے تعلیم دی جاتی ہے کہ وہ ان مقامات میں انتہائی بیش بہا، بے بدل اور کامل نمونہ کے طور پر محفوظ کردہ تصویروں اور مجسموں کا احترام کرے؛ چنانچہ جب وہ وینس ڈی میلو یا مونا لیزا کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تو اس کے رُعب و جلال سے دم بخود اور ساکت و صامت ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ بُت پرستی نہیں تو اور کیا ہے؟ انسان کے ہاتھوں کی اس صنّاعی کا یہ مبالغہ آمیز جلال و

احترام خالص بُت پرستی کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور بُت پرستی کی کوئی شکل و صورت بھی ہو، اسلام اُسے برداشت نہیں کرسکتا۔

"یقیناً آپ میں سے کچھ لوگوں کو وہ بحث یاد ہوگی، جو چند سال پہلے انگلستان کے اخبارات میں چھڑی تھی۔ موضوع یہ تھا: فرض کیجیے، اپنی نوعیت کا ایک یکتا، او ربے بدل یونانی مجسمہ کمرے میں رکھا ہے۔ اسی کمرے میں ایک زندہ بچہ بھی موجود ہے۔ کمرے کو آگ لگ جاتی ہے۔ دونوں میں سے صرف ایک چیز بچائی جاسکتی ہے۔ آپ کے نزدیک کس کو بچانا چاہیے؟ مراسلہ نگاروں، اصحاب فکر و دانش اور اچھے مرتبہ کے حامل افراد کی بہت بڑی تعداد کی رائے یہ تھی کہ مجسمہ کو بچانا چاہیے اور بچہ کو جل کر بھسم ہوجانے کے لیے چھوڑ دینا چاہیے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ بچے تو روزانہ ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں پیدا ہوتے رہتے ہیں، لیکن قدیم یونانی آرٹ کا اس شاہکار کی جگہ کوئی اور نہ لے سکے گا۔ فنی شاہکاروں کے اس قدر احترام کی وجہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور نوعِ انسان کی تخلیقی غرض و غایت پر عدم یقین ہے۔ ان لوگوں کا طرزِ استدلال کچھ اس طرح کا ہوتا ہے۔ یہ بہترین چیزیں ہیں جو انسان کی صدیوں کی کاوش کا حاصل ہیں۔ حُسن زوال پذیر ہے اس لیے ہمیں ماضی کی ان کاوشوں سے چمٹا رہنا چاہیے جو مثالی نوعیت کی ہیں اور باقی بچ رہی ہیں۔ اس نقطۂ نظر کو کوئی مسلمان اپنا نہیں سکتا۔ یہ بُت پرستی کی تازہ ترین ترقی یافتہ صورت ہے۔ مسلمان اللہ کی راہ میں اپنی زندگی کو ہر چیز سے بے مایہ سمجھتا ہے، لیکن وہ کسی دوسری انسانی زندگی کو، جو بظاہر کتنی ہی حقیر کیوں نہ ہو، انسانی ہاتھوں کے بنائے ہوئے فنی کام پر قربان نہیں کرے گا۔ اسلامی تہذیب کا مقصد انسانی زندگی کے زوائد کو دلکش و لطیف بنانا نہیں ہے بلکہ خود انسانی زندگی کو سنوارنا اور سربلند کرنا ہے [۱]۔"

---

[۱] *Islamic Culture*, Muhammad Marmaduke Pickthall, Ferozsons, Lahore, p. 3.

جہاں تک ڈرامے کا تعلق ہے اسلام کے نزدیک کسی دوسرے شخص کا بہروپ بھرنا انسان کی شخصیت کو بگاڑنے کے مترادف ہے اور کوئی شریف و باعصمت خاتون تو ایکٹرس بن کر مجمع عام میں آنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔ ایک اور مہلک نقصان، جو بظاہر بہت کم نظر آتا ہے، وہ انفعالیت ہے جسے یہ سب فنون، خصوصاً تھیٹر، سینما اور لٹریری فکشن جنم دیتے ہیں۔ ان تمام نام نہاد "تخلیقی" فنون پر زور ایک نئی غیر حقیقی زندگی کو تخلیق کرتا ہے۔ انسان تصویر دیکھتے یا ناول پڑھتے وقت ایک خیالی دُنیا میں کھو جاتا ہے۔ یہ خیالی دُنیا جو فن کار اپنی کہانی کے ذریعے ناظر تک منتقل کرتا ہے، اس کے لیے جذباتی طور پر اپنی حقیقی زندگی سے زیادہ اطمینان بخش ہوتی ہے۔ اسی قسم کا انفعالی میلان تیز مخدرات کی طرح اُس کے دل و دماغ کو متاثر کرتا اور اس کی عادات میں رچ بس جاتا ہے۔ اس کے عادی کی طلب روز بروز بڑھتی جاتی ہے حتیٰ کہ اس کے بغیر وہ زندگی کو برداشت ہی نہیں کرسکتا، چنانچہ وہ اپنی فرصت کے اوقات اسی تصور کی دنیا میں بسر کرتا ہے، وہ نہ صرف خود شیخ چلی کے سے منصوبے باندھتا ہے بلکہ دوسروں سے توقع کرتا ہے کہ وہ بھی اُس کے لیے خیالی پلاؤ پکائیں گے۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سینما بلاشبہ بدترین معاشرتی بُرائی کا سرچشمہ ہیں۔

اسلام عبادات کے ساتھ ساتھ اپنا سارا زور مؤثر، مثبت اور تعمیری امور پر صرف کرتا ہے تاکہ فرد کی رُوح کا تزکیہ اور معاشرہ کی اخلاقی و رُوحانی فضا کی بتدریج اصلاح و تطہیر ہوسکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم مسلمان مشیلینجلو یا لیونارڈو ڈاونچی کے مقابلے میں عمر بن الخطابؓ، علی ابن ابی طالبؓ، عمر بن عبدالعزیزؒ، صلاح الدین ایوبیؒ اور اورنگ زیب عالمگیرؒ کو پسند کرتے ہیں۔ اسلام کی حقیقی اقدار کے مطابق اعلیٰ ترین آرٹ یہ ہے کہ آخرت کی زندگی کی تیاری کی خاطر انسان کی حقیقی زندگی میں اس کے کردار کی تکمیل لگاتار اور سخت جدوجہد کی جائے اور جو مشغلہ انسان کی توجہ اس مقصد سے ہٹاتا ہے اُس کو مسترد کردیا جائے۔

مُسلمان عورت
معاشرہ میں اُس کا کردار

جو لوگ جدید تہذیبی اقدار کی برتری کے قائل ہیں۔ اُن کے نزدیک مسلمان عورت کا معاشرتی مرتبہ نہایت پست ہے اور یہ معاشرتی پستی نکاح میں ولایت، تعددِ ازدواج، طلاق اور پردہ یا اختلاطِ مرد و زن سے مکمل اجتناب کی اسلامی تعلیمات پر مبنی ہے۔ چنانچہ تمام اسلامی ممالک میں "تحریکِ اصلاحِ دین" چل رہی ہے۔ مسلمان معاشرہ اپنے آغاز ہی سے جن بنیادوں پر قائم ہے یہ تحریک انہیں "غیر اسلامی" قرار دے کر مسترد کرتی ہے اور غیر مسلم ممالک میں مروج قوانین کو نافذ کرنا چاہتی ہے۔ ہم اس مقالہ میں یہ ثابت کریں گے کہ عورتوں کے متعلق اسلامی تعلیمات درحقیقت برتر و فائق ہیں اور ان میں تحریف و تصرف کا مطلب یہ ہے کہ ہم عظیم مفاسد کو دعوت دے رہے ہیں۔

جدید نسوانی تحریک کے ترجمان اس تصور پر تڑپ اُٹھتے ہیں کہ بیچاری مسلمان لڑکی کو اپنا شریکِ حیات منتخب کرنے کا بھی حق حاصل نہیں ہے۔ اُس کے والدین یا سرپرستوں کی نگاہِ انتخاب جس شخص پر بھی پڑ جائے بیچاری لڑکی مجبور ہے کہ اُسے اپنے شوہر کے طور پر قبول کرلے ایسی مسلمان لڑکی سے وہ بڑی ہمدردی اور دل سوزی جتاتے ہیں۔ اس کی تصویر ایک ایسی مجبور و مظلوم لڑکی کی سی کھینچتے ہیں جو اپنے ظالم و جابر باپ کے پنجۂ جبر میں گرفتار ہے اور شخصی حقوق

کی سرے سے مستحق ہی نہیں ہے۔

اسلامی نظام پر ایک اعتراض اکثر یہ کیا جاتا ہے کہ لڑکی کے شوہر کا انتخاب والدین کرتے ہیں، حالانکہ یہ انتخاب خود اُسے کرنا چاہیے تھا۔ تاہم سب ملکوں اور قوموں میں یہ امر متفق علیہ ہے کہ جب کوئی نوجوان لڑکی کسی ایسے شخص کو اپنا شوہر منتخب کرتی ہے جسے اس کے والدین ناپسند کرتے ہیں، تو وہ درحقیقت ایک ایسی مصیبت کو دعوت دیتی ہے جس کا آخری نتیجہ اس خاندان کی تباہی کی صورت میں نکل سکتا ہے۔ دوسری طرف مسلمان والدین اپنی بیٹی سے شرعاً یہ مطالبہ نہیں کر سکتے کہ جس شخص کو وہ پسند نہیں کرتی، اُس کے ساتھ لازماً اپنی زندگی گزارے۔ ایسی صورت جب بھی پیش آتی ہے وہ اُسے اپنے گھر بلا لیتے ہیں۔ ترکی میں جہاں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی جان پہچان اور ملاقاتوں کا حلقہ اس قدر وسیع ہو چکا ہے کہ بالعموم شادی کی نوبت پہنچ جاتی ہے، میرے ایک دوست کی بیٹی نے اپنے باپ سے کہا کہ وہ فلاں بیٹے سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ باپ نے جواب دیا "بہت اچھا، لیکن یہ بات خوب اچھی طرح سمجھ لو کہ اگر تم ایک پرانی روایت کو توڑو گی تو اُس پر منحصر تمام پرانی روایات ٹوٹ جائیں گی۔ تم جس شخص سے شادی کرنا چاہتی ہو میرے نزدیک وہ تمہارا شوہر بننے کے لائق نہیں ہے ——— اور یاد رکھو مردوں کے بارے میں جتنا کچھ میں جانتا ہوں تم نہیں جانتیں ——— اگر اس سے تمہارا نباہ نہ ہو سکا اور طلاق کی نوبت پہنچ گئی تو میں تمہیں اپنے گھر میں داخل ہونے نہ دوں گا، کیونکہ مجھ پر تا زیست کوئی پابندی عاید نہیں ہوتی۔ ہاں تم میرے پسند کے آدمی کے ساتھ شادی کرو اور یہ شادی ناکام ہو جائے تو میں شرعاً تمہیں اپنے سایۂ عاطفت میں لینے کا پابند ہوں۔ میری استطاعت جتنی کچھ ہے لو اور اپنا راستہ پکڑو۔ لڑکی نے

باپ کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور اُس کے علم اور تجربے کو اپنا رہنما بنانے کا فیصلہ کر لیا[1]

تعددِ ازدواج کا اسلامی اصول بھی مخالفین کے ناروا حملوں کا سب سے زیادہ ہدف بنا ہوا ہے۔ یہ گویا مسلمان عورت کی پستی کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔ نیز اسے سراسر جنسی آوارگی اور شہوت پرستی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہمارے تجدد پسند مصلحین تو اس پر بڑی ہی ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور اس کو صرف پس ماندہ معاشروں کے لیے موزوں قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس کو زیادہ سے زیادہ انتہائی مستثنیٰ اور شاذ حالات میں بس برداشت کیا جا سکتا ہے ——— اس سلسلے میں ہمیں یہ حقیقت خوب ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ہمارے متجددین کی اس معذرت خواہانہ تعبیر کی بنیاد نہ قرآنِ کریم میں ملتی ہے نہ حدیث میں، بلکہ یہ سراسر مغرب کی تہذیبی اقدار سے مرعوبیت اور ذہنی غلامی کا نتیجہ ہے۔ تعددِ ازدواج سے مغربی دنیا کی نفرت کا سبب وہ مبالغہ آمیز انفرادیت ہے جو جدید معاشرہ پر بُری طرح مُسلّط ہے۔ اتنی بُری طرح کہ اُس کے نزدیک بدکاری تعددِ ازدواج سے کہیں کم نفرت انگیز اور شنیع فعل ہے۔

"تعددِ ازدواج پر پابندی کے حق میں بلاشبہ قوی تر دلیل یہ ہے کہ کوئی عورت یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی دوسری عورت اس کی مستقل رقیب اور اس کے شوہر کی خلوتوں کی شریک بن جائے ......(مریم جمیلہ کی) دلیل ایک عام مسلمان عورت کی نظر میں اپنا سارا وزن کھو دیتی ہے، کیونکہ وہ اپنے شوہر کی دوسری بیوی ہیں اور سب جانتے ہیں کہ تعددِ ازدواج کی

---

[1] *Islamic Culture*, Muhammad Marmaduke Pickthall, op. cit., pp. 147-148.

صورت میں زیادہ تر تکلیف دوسری نہیں پہلی بیوی کو اٹھانا پڑتی ہے ......
تاہم تعدد ازدواج ضروری ہے .... نہ صرف بدکرداری اور مردوں کے آزاد جنسی میلان کی روک تھام کی خاطر بلکہ بڑی حد تک اس لیے بھی کہ معصوم عورتیں حریص اور موذی اشخاص کے حوالے نہ ہونے پائیں۔ اگر کسی مرد نے ایک اور عورت سے شادی رچانے کا فیصلہ کر لیا ہے تو قانون چاہے کچھ بھی کہے وہ اس فیصلے کو عملی جامہ پہنا کر رہے گا......... جو لوگ تعدد ازدواج کی مکمل ممانعت کا مطالبہ کرتے ہیں وہ دانستہ یا نادانستہ چاہتے ہیں کہ نئی بیوی کر نیوالا شخص پہلی بیوی کو [illegible] کے تمام بچوں سمیت) اپنے گھر سے نکال دے۔ ورنہ انہیں یہ مطالبہ کرنا چاہیئے تھا کہ نہ صرف تعدد ازدواج کو مکمل طور پر ممنوع قرار دیا جائے بلکہ طلاق کی اجازت بھی کسی حالت میں نہ دی جائے اور مردوں کو اپنی پہلی بیویوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جائے۔ عیسائیت نے عصرِ حاضر کے آغاز سے پہلے یہی ضابطہ تجویز کیا تھا اور یہ کوئی راز نہیں ہے کہ یہ قانون انتہائی تباہ کن ثابت ہوا[1]

یہ بات بے حد سنجیدہ اور شرمناک ہے کہ اکثر مسلمان ممالک میں عائلی قوانین ایسے انداز میں مسخ کیے جا رہے ہیں کہ ان جدید قوانین کے تحت ہمارے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام رض، اور بڑے بڑے ائمہ و مشائخ معاذ اللہ مجرم نظر آتے ہیں۔ کیونکہ ان سب نے ایک سے زیادہ بیویاں کی تھیں۔

---

[1] "Polygamy from the Woman's Point of View," Anwar Ali Khan Soze, *The Radiance Views Weekly*, New Delhi, February 8, 1967, pp. 13-14

طلاق سے متعلق اسلامی قانون کی تردید و تکذیب بھی تعدد ازدواج ہی کی طرح بڑے شد و مد سے کی جاتی ہے۔ شریعتِ اسلامی نے مرد کو یہ جو اجازت دی ہے کہ وہ اپنی بیوی کو از خود طلاق دے سکتا ہے ہمارے متجددین اسے عورت کی ذلت و پستی کا ایک اور ثبوت قرار دیتے ہیں۔ ان کا اصرار ہے کہ طلاق یا معاہدۂ نکاح کی یک طرفہ تنسیخ ناقابل عفو برائی ہے۔ اس طرح ایک مرد کو چھوٹی چھوٹی اور بے کار باتوں پر اپنی بیوی کو بے دھڑک طلاق دینے کی اجازت دے دی گئی ہے۔ بنا بریں ان کا مطالبہ ہے کہ طلاق کو واجب التعزیر جرم قرار دینا چاہیئے اور صرف حرام کاری یا ناقابلِ علاج دیوانگی ہی کی صورت میں اس کی اجازت ہونی چاہیئے اور وہ بھی اس وقت جب عدالت اُس کو باضابطہ اور جائز قرار دے۔ شریعتِ اسلامی میاں بیوی میں ناچاقی اور ایک دوسرے سے سخت بیزاری کی صورت میں بڑا ہی شائستہ، قابلِ عزت اور باوقار راستہ تجویز کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ جب میاں بیوی ایک دوسرے کی رفاقت سے تنگ آ چکے ہوں اور باہمی اختلاف کی وجہ سے زندگی عذاب بن گئی ہو تو انہیں امن و امان کے ساتھ ایک دوسرے سے الگ ہو جانا چاہیئے۔ اس کے برعکس ہمارے متجدد مصلحین مُصر ہیں کہ میاں بیوی کے مزاج میں چاہے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو انہیں ازدواجی بندھن میں بندھے رہنے پر قانوناً مجبور کرنا چاہیئے؛ چونکہ دنیا کا کوئی قانون کسی مرد اور عورت کو آپس میں محبت کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا اس لیے جب انہیں ایک دوسرے کی ذات میں تسکین و مسرت نہیں ملے گا تو وہ اسے کسی اور جگہ ڈھونڈنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ ایسے انمل بے جوڑ جوڑے کے سامنے نجات کا صرف ایک راستہ رہ جاتا ہے۔ وہ یہ کہ عدالت کے دروازے پر دستک دے اور اُس سے کذب و دروغ، تہمت تراشی اور افترا پردازی کے ذریعے چھٹکارا پانے کا پروانہ حاصل کرے۔ گویا اُسے باقاعدہ اپنی رُسوائی کا سامان کرنا ہو گا جس کا نتیجہ مرد اور عورت دونوں کی اخلاقی تباہی کی صورت میں نکلے گا۔ کسی معقول سبب کے بغیر طلاق چونکہ

کوئی بدکردار مرد ہی دے سکتا ہے اس لیے عورت دوسرا نکاح کرنے اور آسودہ زندگی کا از سرِ نو آغاز کرنے میں آزاد ہوتی ہے ۔ لیکن ہمارے تجدد پسند مصلحین ایک ایسا قانون بنانے کی تگ و دو میں مصروف ہیں جو عورت کو اس مرد کے چنگل میں ہمیشہ گرفتار رکھے اور وہ تا دمِ آخر اس کی بدسلوکی کا شکار ہوتی رہے ۔

پردہ یا اختلاطِ مرد و زن سے مکمل اجتناب کا اسلامی اصول بھی جدید تعلیم یافتہ افراد کے زبردست حملوں کا ہدف بنا ہوا ہے ۔ وہ مُصر ہیں کہ پردہ کو "غیر اسلامی" قرار دے کر موقوف کیا جائے ، مخلوط درس گاہیں کھولی جائیں ، عورتوں کو رائے دہی اور حکومت میں شمولیت کا حق دیا جائے ، گھر سے باہر نوکری تلاش کرنے کی حوصلہ افزائی کی جائے اور پبلک زندگی میں پوری طرح حصہ لینے کی اجازت دی جائے ۔ ان کے نزدیک آزادیِ نسواں کے عروج کی علامت یہ ہے کہ بے پردہ لڑکیاں وردی میں ملبوس ، پرچم ہاتھ میں لیے اور قوم پرستانہ نعرے لگاتی ہوئی دارالحکومت کی سڑکوں پر سرکاری سرپرستی میں پریڈ کریں ، زنانہ انتخاب میں عورتیں پولنگ بوتھ پر جائیں اور ووٹ ڈالیں ، کھلے عام حسن کے مقابلے منعقد ہوں ، جن میں منصف مقابلے میں شریک نیم برہنہ لڑکیوں کا معائنہ ٹھیک اسی انداز میں کرتے ہیں جس طرح کسی میلے میں انعامی مویشیوں کا کیا جاتا ہے ، عورتیں مردوں کا لباس پہن کر جنگوں میں شریک ہوں اور کارخانوں میں کام کاج کریں ۔ جدید تہذیب میں ایک عورت اسی وقت لائق عزت و احترام سمجھی جاتی ہے جب وہ مردوں کے سے فرائض کامیابی سے انجام دے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے حسن و جمال کی زیادہ سے زیادہ نمائش کرے ۔ نتیجہ یہ ہے کہ دورِ جدید کے معاشرہ میں دونوں اصناف کے فرائض پوری طرح گڈمڈ ہو چکے ہیں ۔ اسلامی تعلیمات ایسی بگڑی ہوئی غلط اقدار کو کبھی برداشت نہیں کر سکتیں ۔ اسلام میں عورت کا فرضِ منصبی بیلٹ بکس نہیں ہے بلکہ گھر اور خاندان کی خبرگیری ہے ۔ اس کی کامیابی کا معیار یہ ہے کہ وہ اپنے شوہر کی کتنی وفادار ہے اور کس قدر لائق بچے اس کی گود میں پروان چڑھتے ہیں ۔ ایک مسلمان خاتون سے

عزلت اور گوشہ نشینی کی توقع کی جاتی ہے ۔ پردہ اس مقصد کے لیے ناگزیر ذریعہ ہے ۔ مرد تاریخ کے اسٹیج پر ایکٹر ہیں اور عورتوں کا کام پردہ کے پیچھے اور عوام کی نگاہوں سے مخفی رہ کر ان کی مدد کرنا ہے ۔ یہ کام شاید جوش آفریں بھی کم ہے اور حقیر و فرومایہ بھی ہے لیکن ہمارے نظامِ حیات کے تحفظ کے لیے نہایت ضروری ہے ۔

مُسلمان عورت کی آزادی اور اسلام

آج تمام مسلمان ملکوں میں پردہ کے خلاف پراپگنڈے کی مہم بڑے جوش و خروش سے جاری ہے۔ شاید ہی کوئی ملک اس مہم سے پاک ہو۔ ہر جگہ پُر زور انداز میں کہا جا رہا ہے کہ پردہ رجعت پسندانہ اور اصلاح و ترقی کا مخالف ہے اور اگر ملتِ اسلامیہ اقتصادی اور معاشرتی ترقی سے ہمکنار ہونا چاہتی ہے تو "عورت کی آزادی" ناگزیر اور لازمی ہے۔

مثلاً پاکستان ٹائمز لاہور کی اشاعت مورخہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۶۰ء میں تہران یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر محمد مقدم سے مندرجہ ذیل بیان منسوب کیا گیا ہے:

"کوئی ملک اُس وقت تک زمانۂ جدید کے رنگ میں رنگا نہیں جا سکتا جب تک اس کی عورتوں کو آزادی نہیں ملتی۔ مشرق میں جہاں جدیدیت کی رو تاخیر سے پہنچی ہے، لوگ ابھی تک فرسودہ اور روایاتی طرزِ فکر کی زنجیریں کاٹنے میں متامّل ہیں۔ جب تک ہم دنیا کے دوش بدوش نہیں چلتے "زندہ قوم" کی حیثیت سے اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتے۔ ایشیا اور افریقہ کے ترقی پذیر ممالک میں عورتوں کا کردار واضح ہے۔ انہیں ملک کی معاشرتی، تہذیبی اور سیاسی زندگی میں مزید شریک ہونا چاہیئے۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ "جدیدیت سے

وابستہ بُرائیوں کا جو تصور بعض لوگوں کے ذہن میں پایا جاتا ہے، اس کے مقابلہ میں یہ بُرائیاں درحقیقت بہت کم ہیں۔

اگست ۱۹۷۶ء میں پاکستان کونسل برائے قومی سالمیت نے لاہور میں "پاکستان کی بیس سالہ زندگی میں آزادیٔ نسواں" کے موضوع پر ایک مذاکرہ منعقد کیا تھا وہ بھی اس نقطۂ نظر کی نمایاں مثال تھا۔

اگر ہم مسلمان ہونے کے مدعی ہیں اور اسلام کو اپنے ملک کی نظریاتی بُنیاد قرار دینے پر مُصِر ہیں تو کیا یہ معلوم کرنا ہمارا فرض نہیں کہ اسلام اس معاملے میں ہمیں کیا تعلیم دیتا ہے؟

جہاں تک عورتوں کے نظریۂ مساوات کا تعلق ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ مرد عورتوں کے نگران و محافظ ہیں، اس بنا پر کہ اللہ نے اوّل الذکر کو مؤخر الذکر پر فضیلت دی ہے اور وہ عورتوں پر اپنا مال و دولت صرف کرتے ہیں۔ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ۔(سورۃ النساء۔ ۳۴)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مسلمان عورت روزی کمانے کی پابند نہیں ہے الّا یہ کہ وہ بیوہ یا مطلقہ ہو اور نہ تو اس کی کوئی جائداد ہو اور نہ ایسا مرد رشتہ دار جو اس کی ضروریات بہم پہنچا سکے۔ قرآن کریم یہ تعلیم دیتا ہے کہ شوہر اپنی بیوی کا آقا بھی ہے اور مونس و غم خوار رفیقِ حیات بھی۔ اُس کا فرض ہے کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ عدل و انصاف، محبت اور لُطف و عنایت سے پیش آئے۔ دُوسری جانب عورت کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے شوہر کی وفادار اور اطاعت شعار ہو اور اس کے اعتماد پر پُورا اُترے۔ قرآنِ کریم شوہر کو بیوی پر کسی حد تک فوقیت ضرور عطا کرتا ہے، لیکن اس تفوق کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ظالم و جابر بن جائے، بلکہ اس کا مقصد خاندان کا تحفظ اور اُسے فساد اور بگاڑ کا شکار ہونے سے بچانا ہے۔ جن خاندانوں میں بیوی معاشی طور پر آزاد ہوتی ہے، ان میں شوہر اپنے گھرانے کی سرداری سے خود بخود محروم ہو جاتا ہے، اور جب گھر میں

ماں کی شخصیت غالب ہو تو بچوں کے دل میں باپ کی عزت و وقعت باقی نہیں رہتی۔

سورۃ النّور میں مسلمان مردوں کو نامحرم عورتوں اور مسلمان عورتوں کو نامحرم مردوں پر نظر ڈالنے کی ممانعت کی گئی ہے اور مرد و زن دونوں کو یکساں حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں۔ عورتوں کو چاہیئے کہ وہ دوپٹہ اوڑھیں اور اس کے پلّو اپنے سینے پر ڈال لیں، اپنی زینت و آرائش کو اپنے شوہروں اور محرم مردوں کے سوا کسی اور پر ظاہر نہ ہونے دیں۔ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ؕ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ (النور۔ ۳۰-۳۱)

سورۃ الاحزاب میں اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات اور کنایۃً مسلمان خواتین کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ اپنے گھروں میں مقیم رہیں اور زمانۂ جاہلیت کی طرح اپنا بناؤ سنگار نہ دکھاتی پھریں۔ وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى (۳۳) اور کہتا ہے کہ مسلمان خواتین گلی کوچوں میں ایسے انداز سے نہ چلیں کہ لوگوں کی نگاہیں ان پر مرکوز ہو جائیں۔ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ۔(النور۔ ۳۰-۳۱) وہ بے تکلف گفتگو صرف محرم رشتہ داروں، شوہروں اور زر خرید غلاموں سے کر سکتی ہیں۔ اسی سورۃ میں اہلِ ایمان کو ازواجِ مطہراتؓ کا شایانِ شان احترام کرنے کا حکم دیا گیا

ہے اور کہا گیا ہے کہ اُن سے کوئی بات کہنی ہو تو پردے کے پیچھے سے کہیں۔ وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ (الاحزاب - ۵۳)

نیز جب مسلمان عورتیں کسی کام سے باہر نکلیں تو ایک بڑی سی چادر سے اپنا جسم ڈھانپ لیں اور گھونگھٹ نکال لیں۔ یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ۔ (الاحزاب - ۵۹)

قرآن کریم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات کو اور کنایتہً تمام مسلمان عورتوں کو حکم دیتا ہے کہ جب نامحرم مردوں سے بات کی ضرورت آپڑے تو نرمی اور لوچ سے بات نہ کریں کہ دل کا کھوٹا شخص غلط توقعات نہ باندھ لے بلکہ دو ٹوک، صاف اور سچی تلی بات کریں۔ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَیَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا۔ (الاحزاب - ۳۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان عورتوں کو تلقین کی ہے کہ وہ اپنے شوہروں یا محرم مردوں کے سوا کسی اور مرد سے تنہائی میں نہ ملیں، نہ اپنے خاندان سے الگ تنہا رہیں نہ قریبی رشتہ داروں کے بغیر لمبے سفر پر جائیں۔ صحیح احادیث عورتوں کو مسجد میں با جماعت نماز پڑھنے سے روکتی ہیں اور کہتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول ترین نماز وہ ہے جو عورت اپنے گھر کی تنہائی میں ادا کرتی ہے۔ یہ ہے اسلام کا طرزِ عمل عبادتِ الٰہی کے متعلق پھر وہ کیسے برداشت کر سکتا ہے کہ عورتیں سیکرٹری، بنکوں کی کلرک، فضائی میزبانیں، ریسٹورانوں میں خدمت گار، ماڈل، مغنیات، رقاصائیں یا فلم، ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر اداکار بنیں۔ سورۂ نور کی ابتدائی ۲۴ آیات میں ان لوگوں کو دُنیا و آخرت میں سخت سزا دینے کا اعلان کیا گیا ہے جو ناجائز جنسی تعلقات اُستوار کرتے اور مسلمان معاشرہ میں بے حیائی کو فروغ دیتے ہیں۔ اسلام "دو پیمانوں" کا قائل نہیں ہے۔ قرآن و حدیث ناجائز جنسی تعلقات کے خوگر مرد و زن کے درمیان کوئی امتیاز روا نہیں رکھتے۔ وہ دونوں کو یکساں نوعیت کی

شدید سزا کا مستوجب قرار دیتے ہیں۔ قرآن کریم اور سنتِ رسولؐ کی اس شہادت سے بڑھ کر بھی کوئی اور ناقابلِ تردید شہادت اس بات کی ہو سکتی ہے کہ اسلام پردہ کا حامی ہے؟ مسلمان عورتوں کی نقل و حرکت کو محدود کرنے والے اسلامی احکام میں درحقیقت خود عورتوں ہی کا مفاد مضمر ہے۔ ان کا مقصد وحید خلطِ ماتقدم اور مردوں کو بے جا فائدہ اٹھانے سے روکنا ہے۔ اس سلسلے میں اسلام دنیا کے تمام مذاہب میں بے نظیر و لاثانی ہے۔ وہ نہ صرف بدکرداری کا قلع قمع کرتا ہے بلکہ اہلِ ایمان کو ان معاشرتی معمولات میں مبتلا ہونے سے بھی روکتا ہے جو انسان کو بدکرداری کی راہ پر لے جاتے ہیں۔

تحریکِ آزادیٔ نسواں کے پہلے نقیب کیمونزم کے بانی کارل مارکس اور اینجلز تھے۔ انہوں نے اپنے کیمونسٹ منشور (۱۸۴۸ء) میں اعلان کیا کہ شادی، گھر اور خاندان ایک لعنت کے سوا کچھ نہیں، ان کی وجہ سے عورت دائمی غلامی میں گرفتار ہو گئی ہے۔ انہوں نے عورتوں کو خانگی غلامی سے "نجات" دلانے پر زور دیا اور کہا کہ انہیں صنعتی کارخانوں میں ہمہ وقتی ملازمت کے ذریعے مکمل اقتصادی آزادی سے ہمکنار کرنا چاہیے۔ ان کے بعد آزادیٔ نسواں کے دوسرے حامیوں نے زور دیا کہ مردوں کی طرح عورتوں کو بھی ناجائز جنسی تعلقات قائم کرنے کی آزادی ہونی چاہیے۔ اس مقصد کے لیے مخلوط تعلیم رائج کی جائے، گھر سے باہر مردوں کے دوش بدوش عورتوں کو ملازمت دی جائے، مخلوط تفریحی اور معاشرتی تقریبات، جن میں شراب خوری، نشہ بازی اور رقص کی محفلیں بھی شامل ہیں، منعقد کی جائیں، مانع حمل ادویہ، آلات، اسقاط اور نس بندی اور آپریشن کے ذریعے بانجھ پن کے اعمال عام کیے جائیں تاکہ عورتیں غیر مطلوب حمل سے محفوظ رہ سکیں۔ بچوں کی، جن میں بہت سے ناجائز ہوں گے، پرورش کے لیے ریاست کی نگرانی میں نرسریاں اور سرکاری اقامتی درس گاہیں کھولی جائیں ———— یہ ہے "عورت کے حقوق" کے اس جدید تصور کا خلاصہ۔

تہران یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے گوگرگ سکول آف ہوم اکنامکس (لاہور) میں حاضرین

کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ تجدد پسندی کے جلو میں جو برائیاں آ رہی ہیں وہ ضرورت سے زیادہ مضطرب قدامت پرستوں اور رجعت پسندوں کے تصور سے کہیں کم ہیں۔ لیکن کیا یہ اندیشے فی الواقع بے بنیاد ہیں؟ مغرب میں آزادیٔ نسواں کے جو نتائج رونما ہوتے ہیں، نگاہِ غائر سے ہم اس کا جائزہ لیتے ہیں۔

ممتاز امریکی مؤرخ اور مشہور کالم نویس میکس لرنر لکھتا ہے:

"ہم ایک ایسے معاشرہ میں رہتے ہیں جس میں بدکاری وبا کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ سب سے زیادہ زور حواس اور شہوانیت کی آزادی پر دیا جاتا ہے تمام قدیم ضوابط ٹوٹ کر رہ گئے ہیں۔ زمانۂ قریب تک کلیسا، حکومت، خاندان اور قوم فیصلہ کن حیثیت رکھتے تھے۔ کس چیز کا اظہار کھلے عام کیا جا سکتا ہے اور کس کا نہیں؟ اس کی ہدایت انہی اداروں کا کام تھا، لیکن اب یہ ادارے معاشرہ کی اکثریت کے آگے مغلوب ہو چکے ہیں۔ یہ اکثریت کسی امتیاز اور رکاوٹ کے بغیر ہر ایک شے کے دیکھنے اور ہر بات کے سننے کا مطالبہ کرتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔
امریکہ بھر کے آرٹ ہاؤس اور ہمسایہ ممالک کے تھیٹر (I, A Woman) میں سویڈن کی ایک نوجوان ایکٹریس کے، جس کے جسم پر بہت کم کپڑے ہوتے ہیں، مشتعل تماشائی دیکھنے کے لیے اس طرح بھر جاتے ہیں کہ تل دھرنے کو جگہ نہیں رہتی۔ اطالوی ڈائریکٹر مثلاً انگیلو انطونیونی تو (Blow-up) میں مکمل عریانی کے مناظر پیش کر کے اخلاق و قانون کی ساری حدیں توڑ دیتا ہے۔ فلم (Barbarella) سراسر ترغیب و تشویق کے گرد گھومتی ہے۔ فرانسیسی ہیروئن جین فونڈا، کپڑے کی ایک دھجی بڑے مضحک انداز میں چپکائے عشقیہ زندگی کا مظاہرہ کرتی ایک عریاں منظر سے دوسرے عریاں منظر کی طرف بڑھتی ہے۔ فلم (Portrait of Jason) اس حیا باختگی اور فحش کلامی کے آزادانہ اظہار کا گوناگوں مرقع ہے، جو آج تقریباً ہر امریکی فلم کا طرۂ امتیاز بن چکی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ یسوعی عالمِ دین فادر والٹر جے اونگ کہتا ہے: "ہم آزادی کے جس عالم میں رہتے چلے ہیں اس کا ماضی میں ہم نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا[1]۔۔۔"

اور مسلم ممالک کے مسلمانوں پر اس انحطاط کے کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں؟ آزادیٔ نسواں اور اخلاقی بگاڑ کا ایک انتہائی طاقتور سرچشمہ سینما کی صنعتِ آذری ہے۔

"ہیرا منڈی کی ہر لڑکی تھیٹر اور فلم کی زندگی اختیار کرنے کی اُمنگ اپنے دل میں رکھتی ہے۔ وہ سب فلم کی رانیاں بننا چاہتی ہیں۔ اس امنگ کو پورا کرنے کی خاطر وہ ہر قربانی دینے کو تیار ہیں۔ ان کی ایک خاص بڑی تعداد اپنے آپ کو فلم پروڈیوسروں اور ڈائریکٹروں کی ہوس رانیوں کے حوالے کر کے بے نیلِ مرام ختم ہو جاتی ہے۔ فلم کے کھیل میں بالعموم یہی عورتیں آسان ترین شکار ہوتی ہیں۔ ان میں سے اکثر جزوی کردار ادا کرنے سے آگے بڑھنے نہیں پاتیں۔ فلموں میں ایکسٹرا گرلز کی ایک بڑی تعداد اسی ذریعے سے آتی ہے۔ صرف چند لڑکیاں اس میدان میں اونچا مقام حاصل کر سکی ہیں۔
۔۔۔۔۔۔۔۔ شہر کے اکثر ہوٹل لطف اندوزی کا مرکز بن چکے ہیں۔ بعض ہوٹلوں کے خدمت گار لڑکیاں فراہم کرنے کا کاروبار کرتے ہیں۔ بہت سے ریسٹوران بے پردگی کے مقامات ہیں۔ یہ عورتیں شہر کے بس اسٹاپوں پر مل سکتی ہیں۔ شہر کے سینما گھر بھی مشہور و معروف شکارگاہیں ہیں۔ سینما گھروں کے بکس تماشا دیکھنے ہی کے لیے نہیں اکثر اس مقصد کے لیے بھی

“Our Anything Goes Society—Where is it Going?”
'eaders Digest, April 1968, Asia edition.

استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان سرگرمیوں پر پولیس کی نگرانی خاصی ڈھیلی ہے۔*
کیا کرسٹن کیلر اور ماریلن منرو ایسی عورتوں کی فوج تیار کرنا بھی ہمارے قومی ترقیاتی پروگرام کا کوئی حصّہ ہے؟

عورت بیوی اور ماں کی حیثیت میں جو کردار ادا کرتی ہے پریس، ریڈیو اور سینما کے ذریعے ہونے والا آزادیٔ نسواں کا پروپگنڈا اُسے نہایت حقیر گردانتا ہے۔ جو خواتین گھر کے کام کاج اور بچوں کی پرورش میں اپنا وقت صرف کرتی ہیں۔ یہ پروپگنڈا اُسے قوم کی نصف افرادی قوت کا ناقابلِ عفو اقتصادی ضیاع قرار دیتا ہے۔ مسلمان ممالک میں سرکاری سرپرستی میں سرعت سے پھیلتی ہوئی مخلوط تعلیم، جس کے نتیجے میں اختلاطِ مرد و زن کے تباہ کن اثرات مترتب ہو رہے ہیں، بہت سے معاشرتی مفاسد کی ذمّہ دار ہے۔ مخلوط تعلیم کی بنیاد اس مغالطے پر ہے کہ مرد و زن کے درمیان فطرتاً کوئی فرق و امتیاز نہیں ہے اور دونوں کو گھر سے باہر یکساں نوعیت کے کاموں کی تربیت دی جانی چاہیئے تاکہ وہ ہمہ وقتی ذریعۂ معاش اختیار کرنے کے قابل ہو سکیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ مخلوط درسگاہوں میں تعلیم پانے والی لڑکیاں ازدواجی زندگی اور امومت کی ذمّہ داریاں سنبھالنے کی تربیت شاذ و نادر ہی پاتی ہیں، تاہم یہی پروپگنڈا بڑے شدّ و مد سے یہ بھی کہتا ہے کہ آزاد عورت کی بنیادی ذمّہ داری اپنے گھر کی دیکھ بھال ہے گویا بالفاظِ دیگر مغرب زدہ عورت کو دوہرا بوجھ اُٹھانا ہوگا۔ گھر سے باہر کسبِ معاش کے ساتھ ساتھ اُسے اپنے شوہر اور بچوں کے فرائض بھی انجام دینا ہوں گے اور اپنا گھر بھی یکہ و تنہا صاف ستھرا رکھنا ہوگا۔ کیا اسے انصاف کہہ سکتے ہیں؟

---

*"Focus on Prostitution," *The Pakistan Times*, Lahore, March 29-30, 1968.

مغربی قوانین کی پیروی میں جو نئے عائلی قوانین اکثر مسلمان ممالک میں نافذ کیے جا چکے ہیں کیا ان سے فی الواقع ہماری خواتین کی حالت سُدھر گئی ہے؟ اس نوعیت کے قوانین شادی کی کم سے کم عمر متعین کرتے وقت تو بے شک بڑے فکر و تردد سے کام لیتے ہیں، لیکن وہ معیّنہ مدّت سے کم عمر کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان ناجائز جنسی تعلقات اُستوار کرنے پر پابندی لگانا بالکل بھول جاتے ہیں۔ اکثر مسلمان ممالک میں، قرآن و سنّت کی رُوح کے یکسر برعکس، تعددِ ازدواج کو محدود سے محدود تر کیا جا رہا ہے، بلکہ ہمارے متجددین اسے کلیتہً ممنوع قرار دیتے چلے ہیں، لیکن وہ اس سوال کا سامنا کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ کیا کسی عورت کے لیے یہ بہتر ہے کہ کوئی دوسری عورت اُس کی سوکن بن کر اُس کے شوہر کی محبت میں شریک ہو تاہم وہ خود بھی اپنے گھر میں بحفاظت تمام زندگی بسر کرے اور اُس کے بچوں کو بھی اپنے باپ کا پیار حاصل رہے یا یہ بہتر ہے کہ اُس کا شوہر اُس عورت سے چوری چھپے ناجائز تعلقات قائم کرنے پر اس لیے مجبور ہو جائے کہ ملک کا قانون اُسے اپنے شوہر کی جائز بیوی بننے سے روکتا ہے۔ اِلّا یہ کہ وہ اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے دے اور بچوں سمیت گھر سے باہر نکال دے۔ ایک عورت جس کا اپنے شوہر کے ساتھ نباہ مشکل ہو گیا ہو کیا اُس کے لیے یہ بہتر نہیں ہے کہ شوہر اُسے اپنے طور پر طلاق دے دے اور وہ دونوں امن و سکون کے ساتھ ایک دوسرے سے الگ اور دوسرا نکاح کرنے کے لیے آزاد ہو جائیں؟ یا کیا یہ بہتر ہے کہ وہ عدالت سے رجوع کریں اور شوہر بیوی سے نجات پانے کے لیے اُس پر بدکاری کا الزام عاید کرے یا اُسے مخبوط الحواس اور پاگل قرار دے تاکہ تیسرے فریق (عدالت) کو یقین ہو جائے کہ طلاق ناگزیر ہو چکی ہے۔ اس کا نتیجہ بجز اس کے اور کیا ہوگا کہ کھُلے عام تہمت طرازی کی جائے گی اور بے چاری عورت کا دامنِ عصمت و کردار ہمیشہ کے لیے داغدار اور زندگی تباہ ہو جائے گی۔

امرِ واقع یہ ہے کہ "آزادیٔ نسواں" کے علم برداروں کو عورت کی ذاتی مسرت و بہبود

سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مذاکرہ لاہور میں ایک خاتون مقررہ مسز ستنام محمود نے جو خود "اپوا" کی پُرجوش حامی ہیں، بڑی صاف گوئی کے ساتھ اعتراف کیا کہ اگرچہ مغربی خواتین مادّی فراوانی، مکمل معاشرتی آزادی اور مساوات سے بہرہ ور ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ مسرت سے محروم ہیں۔ انہوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ اگر ہمارا مقصد ذہنی سکون کا حصول ہے تو نام نہاد "آزادی" کا دامن اس مقصد سے تہی ہے اور اس راہ پر چل کر ہم گوہرِ مقصود سے بہرہ یاب نہیں ہو سکتے۔ بیگم قیصرہ انور علی نے، جو ایک آزمودہ کار سماجی کارکن اور "اپوا" کا ستون ہیں، اس بات پر شدید مایوسی ظاہر کی کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین اپنے مذہبی و ثقافتی پس منظر اور قومی زبان سے بالکل ناواقف ہیں۔ حالانکہ وہ اس حقیقت کو سرے سے نظرانداز کر گئیں کہ اس نامبارک ارتقاء میں ان کی اپنی تنظیم کی سرگرمیاں کارفرما رہی ہیں۔

مسلمانوں کو یہ حقیقت پیشِ نظر رکھنی چاہیئے کہ آزادیٔ نسواں کی تحریک دراصل اغیار کی ایک انتہائی ناپاک سازش ہے۔ اس طرح وہ گھر، خاندان اور بالآخر پورے معاشرہ کو تباہ کر دینا چاہتے ہیں۔ "عورتوں کے حقوق"، "آزادی" اور "ترقی" وغیرہ کے فرسودہ نعرے اس تحریک کے حقیقی عزائم کو چھپانے کے لیے محض ایک پردہ ہیں۔ مسلمان ممالک میں آزادیٔ نسواں کی تحریک کے وہی تباہ کن نتائج برآمد ہوں گے جو دوسرے ملکوں میں ہو چکے ہیں۔ ان ملکوں میں ناجائز جنسی تعلقات وبا کی صورت اختیار کر چکے ہیں، انسانوں کی اخلاقی پستی کا یہ عالم ہے کہ جنگل کے وحشی جانور تک شرما جائیں۔ گھر اور خاندان بلکہ پورے معاشرہ کا ڈھانچہ تباہ ہو چکا ہے۔ کم سِن مجرموں، جرائم، تشدد سے معمور فضا، بے چینی اور لاقانونیت کا دَور دورہ ہے۔ ماضی کی گود میں سو جانے والی تہذیبوں کی تاریخ گواہی دیتی ہے کہ جب بھی کسی معاشرہ میں بدی اور فسق و فجور کا طوفان اُمڈا ہے، اُس کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔

مُسلمان ماں کے فرائض

مسلمان ماں کا اوّلین فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کو قرآن و سُنّت پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کرے۔ عجمی مسلمان ممالک کی اکثر مسلمان خواتین اگرچہ قرآن کریم کی تلاوت روزانہ صبح سویرے بڑے اخلاص و عقیدت کے ساتھ کرتی ہیں، لیکن انہیں کچھ خبر نہیں ہوتی کہ وہ جو کچھ اپنی زبان سے ادا کر رہی ہیں اس کے معانی کیا ہیں اور یہ کتابِ عظیم اُن کے لیے اپنے دامن میں زندگی کا کون سا پیغام رکھتی ہے۔ بے شمار مسلمان لڑکیاں، خصوصاً وہ جو جدید تعلیم سے بہرہ ور ہیں، زیادہ تر مذہب کی طرف میلان رکھتی ہیں۔ وہ قرآن و حدیث اور دوسرے اسلامی لٹریچر کا مطالعہ بھی کرتی ہیں، مگر اس طرح گویا اسلام محض ایک عظیم الشّان مجرّد فلسفہ ہے۔ وہ سینما کی فحش فلمیں دیکھتی اور ریڈیو پر گائے جانے والے بیہودہ اور بازاری گیت کچھ ایسے ذوق و شوق سے سُنتی ہیں کہ بے خیالی، بلکہ بسا اوقات نیند، میں خود بھی گانے لگتی ہیں۔ وہ نیم عُریاں چُست لباس پہن کر مخلوط مجالس میں شریک ہوتی ہیں۔ انہیں خیال تک نہیں آتا کہ ان حیاسوز باتوں سے اجتناب کرنا چاہیئے۔ مسلمان ماؤں کا فرض ہے کہ وہ اپنی نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کی رہنمائی کریں۔ انہیں بتائیں کہ ان کے سکول یا کالج کے ساتھی اس قسم کے کام کرتے ہیں تو اس سے ان کے درست اور حق ہونے کا جواز نہیں مل جاتا۔ مسلمان خواتین کو

یہ ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ قرآن و حدیث کے مطالعہ کا مقصد یہ ہے کہ اُن کی تعلیمات کو اپنی زندگی میں نافذ کیا جائے۔ اکثر مسلمان گھرانے قرآن کریم کو خوبصورت ریشمی غلاف میں لپیٹ کر اُونچے طاق میں رکھ دیتے ہیں جہاں وہ پڑے پڑے گرد و غبار میں اَٹ جاتا ہے۔ کسی کو خیال تک نہیں آتا کہ اللہ کی یہ عظیم کتاب بزبانِ خاموش فریاد گناں ہے۔ وہ شب و روز ان سے مطالبہ کرتی ہے کہ مجھے اس طاق سے اُٹھاؤ، پڑھو اور میری ہدایات پر چلو، لیکن اس کی اس خاموش فریاد پر کسی کو کان دھرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔

مائیں زنانہ رسائل میں آئے دن پڑھتی رہتی ہیں کہ مدتوں کی مسلمہ اخلاقی اور دینی قدروں کے خلاف نوجوان بچوں کی پُرجوش بغاوت، ان کا احمقانہ بیہودہ طرزِ عمل، چھوٹی چھوٹی بے دلیہ اور بیکار باتوں کی طرف بے محابا کشش، ہر روایاتی چیز سے شدید نفرت اور انقلابی تبدیلیوں، یعنی مغربی الحاد اور مادہ پرستی کو اپنانے کی بے تابانہ خواہش دراصل جدید نوخیز نسل کی فطری حیاتیاتی حقیقت ہے۔ ماؤں کو چاہیئے کہ وہ اس حقیقت کو بے چون و چرا تسلیم کر لیں۔ نیز یہ بھی مان لیں کہ نئی نسل کے عام رجحانات کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے کے سوا اب کوئی چارہ نہیں رہا۔ یہ مشورہ سراسر فریب کاری پر مبنی ہے۔ یقیناً کوئی بات بھی ناگزیر نہیں ہے۔ تجدد پسندوں کے پراپگنڈے کے برعکس حالات اس قدر مایوس کن نہیں۔ امرِ واقع یہ ہے کہ ہماری جانب سے بھرپور جد و جہد ہونے ہی نہیں پائی۔ درحقیقت یہ ردِ عمل ہے اُس تعلیم کا جو ہمارے نوجوان گھروں، سکولوں اور کالجوں میں پاتے ہیں اور ان باتوں کا جنہیں وہ رسائل و جرائد میں پڑھتے اور سنتے ہیں۔ اگر انہیں مغربی طور اطوار کے بجائے اسلامی طرز کی تعلیم دی جاتی تو ان کے جذبات، خیالات اور طرزِ عمل کا انداز ہی اور ہوتا۔ اس مطلوبہ تغیر کو لانے میں خواتین فیصلہ کن کردار ادا کر سکتی ہیں، کیونکہ وہ اگر چاہیں تو اپنے نوخیز بچوں کی زندگی پر نہایت گہرا اثر ڈال سکتی ہیں۔

پردہ کے اسلامی احکامات مسلمان خاتون سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ باوقار انداز میں خلوت گزیں رہے، زیادہ تر وقت اپنے گھر میں گزارے اور صرف ناگزیر ضروری کام سے باہر

نکلے۔ وہ اپنے قرابت داروں اور سہیلیوں کے ہاں بھی کبھی کبھار جا سکتی ہے۔ ایک ماں اپنے نوخیز بچوں کے لیے اعلیٰ نمونہ بن کر ان کی زندگی پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ جو خاتون ہر وقت گھر کے کام کاج، اپنے بچوں کی دیکھ بھال اور ان کی تعلیم و تربیت نیز نماز روزہ اور تلاوت وغیرہ ایسے اعمالِ صالح میں ہمہ تن مشغول رہتی ہے وہ اپنے بچوں کو بہترین اسلامی فضا بہم پہنچاتی ہے۔ ایسی فضا اُن لاتعداد ناگوار اثرات کے ازالہ میں بڑی ممد ثابت ہوگی جن سے وہ بیرونِ خانہ دوچار ہوں گے۔ ماؤں کو چاہیئے کہ وہ اپنے بچوں کو زندگی کے بالکل ابتدائی مرحلے ہی سے اسلامی تعلیم دینے کا اہتمام کریں۔ احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ صحابہ کرامؓ اپنے بچوں کو دُودھ چھڑانے سے پیشتر ہی قرآن کی چھوٹی چھوٹی سورتیں یاد کرانے لگتے تھے۔ بچہ جونہی بول چال شروع کرے اُسے کلمہ طیبہ، بسم اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر، انشاء اللہ اور ماشاء اللہ ایسے کلمات سکھانے چاہیئیں۔ جب وہ کھڑا ہونے اور چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے تو ماں کو کوشش کرنی چاہیئے کہ بچہ اُس کے نقشِ قدم پر چلے۔ بچے اپنے بڑوں کی نقل بڑے ذوق و شوق سے اُتارتے ہیں۔ ماؤں کو چاہیئے کہ ان کی حوصلہ افزائی کریں اور کوشش کریں کہ جب وہ نماز پڑھنے کھڑی ہوں تو بچے ان کی نقل اُتاریں۔ جب بچہ سات سال کا ہو جائے تو اُسے نماز پڑھنے کی تلقین کریں۔ دس برس کی عمر کو پہنچ جائے اور نماز نہ پڑھے تو باقاعدہ گوشمالی کریں۔ اس طرح بچے بچپن ہی سے اپنے خدا اور اُس کے بندوں کے فرائض ادا کرنے کے عادی ہو جائیں گے۔ ان تمام فرائض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ بچوں پر اُن کی عمر اور ذہنی استعداد کے مطابق ان فرائض کی اہمیت واضح کریں۔ انہیں گذشتہ اور موجودہ عہد کے مسلمان اکابر کے ایمان افروز اور جوش انگیز حالات سُنائیں۔ ان کے دل میں نیکی کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ جب بچے خود پڑھنے کے قابل ہو جائیں تو انہیں چھوٹی چھوٹی اسلامی کتابیں لا کر دیں اور پڑھنے کا شوق دلائیں۔ بڑے اور بالغ بچوں کو نہ صرف ریڈیو اور ٹیلیویژن کے اخلاق سوز پروگرام اور فحش فلمیں دیکھنے سے روکیں بلکہ اُن پر اِن کے مفاسد بھی آشکارا کریں۔

اگر کسی گھر میں ریڈیو یا ٹیلی ویژن ہے تو ماں کو چاہیئے کہ وہ اسے تلاوتِ قرآن، خبروں، حمد و نعتوں اور صحت مند تعلیمی پروگرام تک محدود رکھے۔ فحش اور بیہودہ گیت سننے کی اجازت کسی صورت بھی نہ دے۔ بچوں پر ایسے گیتوں کے بدترین اخلاقی اثرات مترتب ہوتے ہیں۔ بچہ پڑوس کے ریڈیو یا ٹیلی ویژن سے سنے ہوئے گیت کبھی گانے لگے تو اُسے فوراً خاموش کر دے اور بتائے کہ اگر لوگ ایسے فحش گیت گاتے ہوئے سُن لیں تو کتنی شرم کی بات ہے۔

مسلمان ماں اپنے بچوں کو کسی انگلش میڈیم کرسچن مشنری سکول یا کونونٹ میں ہرگز نہ بھیجے، ان درس گاہوں میں بچوں کو ان کے دین و ملت اور تہذیبی میراث سے بالکل بیگانہ کر دیا جاتا ہے، تاہم سرکاری درس گاہوں کے بارے میں بھی کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیئے۔ ان کی حالت بھی اطمینان بخش نہیں ہے۔ اگر ہو سکے تو دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ گھر پر عربی، قرآن اور حدیث کی تعلیم دینے کا انتظام بھی کرے۔ بصورتِ دیگر بچوں کو مسجد کے مکتب میں بھیجے حتی الامکان خود بھی ان کی تعلیم اور ذہنی و فکری تربیت کی طرف توجہ دے۔ ممکن ہو تو بچوں کی تمام نصابی کتابیں غور سے پڑھے اور انہیں بتائے کہ ان کتابوں میں بہت سی باتیں نہ صرف نادرست ہیں بلکہ جھوٹ اور نقصان رساں بھی ہیں، جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مزید برآں انہیں بالوضاحت موثر انداز میں یہ بھی بتائے کہ یہ باتیں غیر اسلامی کیوں ہیں؟

مسلمان ماں کو چاہیئے کہ وہ اپنا گھر صاف ستھرا رکھے اور اُسے حتی المقدور پرکشش اور جاذب توجہ بنائے۔ یہاں لاہور میں مجھے بہت سے پاکستانی گھر دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اکثر حتیٰ کہ طبقۂ اوسط کے گھر بھی تاریک اور گندے ہیں۔ میں ایسی متعدد خواتین سے واقف ہوں جن کے گھروں میں کوڑے کرکٹ کا انبار لگا رہتا ہے خصوصاً باورچی خانے اور صحن تو بڑے ہی گندے ہوتے ہیں۔ یہ خواتین شاید خود جھاڑو دینے کی زحمت اُٹھانے کے بجائے گندگی میں رہنا زیادہ پسند کرتی ہیں۔ اسلامی تعلیمات لڑکیوں کو صاف ستھرا اور سلیقہ پسندی و شائستگی سے رہنا سکھاتی ہیں۔ عورتیں اپنے گھر کی صفائی کرنے اور جھاڑو بہارو دینے سے نہ تو شرمائیں اور نہ

اسے کسرِ شان سمجھیں۔ نیز خدمت گاروں پر انحصار کر کے نہ رہ جائیں کہ وہی صاف کریں گے۔ اگر اللہ نے خوش حالی عطا کی ہے تو گھر کی آرائش پر روپیہ بیکار ضائع نہ کریں۔ غیر ضروری فرنیچر مثلاً مغربی طرز کے صوفوں، سنگھار میزوں اور چھوٹی موٹی آرائشی چیزوں سے احتراز کریں۔ دیواروں پر اسلامی طغروں کی نمائش سے دوگونہ مقاصد پورے ہو سکتے ہیں۔ گھر کی زیبائش بھی ہو سکتی ہے اور اس بات کا اظہار بھی کہ یہ ایک مسلمان گھر ہے۔ اہلِ خاندان اور دوستوں کی تصاویر چوکھٹوں میں لگا کر دیواروں پر آویزاں نہ کریں کہ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلامی تعلیم کا تقاضا ہے کہ لڑکیاں صحت کے بنیادی اصولوں، فوری طبی امداد اور اصولِ تغذیہ سے واقف ہوں۔ بہت سی مسلمان عورتیں اصولِ تغذیہ سے بالکل بے خبر ہیں۔ وہ نہیں جانتیں کہ بچوں کو مکمل غذا مہیا کر دی جاتی ہے۔ حالانکہ صحیح غذا دستیاب بھی ہو سکتی ہے اور وہ اپنے بچوں کو دے بھی سکتی ہیں۔ اَن پڑھ اور شعور و احساس سے تہی دامن عورت ان اسلام دشمن اثرات کا معقول سدِباب نہیں کر سکتی جو اُس کے بچوں کو شب و روز نقصان پہنچا رہے ہیں۔ عاقل و فہیم، تعلیم یافتہ اور پُرجوش مسلمان خواتین ہی اُس کام سے عہدہ برآ ہو سکتی ہیں جس سے وہ آج دوچار ہیں۔

اِسلامی معاشرہ کے لوازمات

اگر ہم واقعی مسلمان ہیں اور اپنے دین کی سالمیت کو عزیز رکھتے ہیں تو ضروری ہے کہ اپنی دینی و تہذیبی انفرادیت کو پُوری قوّت کے ساتھ برقرار رکھیں اور اُس پر ذرا بھی آنچ نہ آنے دیں۔ تہذیبِ جدید کا نظریۂ الحاد، اس کی مادّہ پرستی اور اُس کے قوانین اور اداروں کو، جو ان تمام چیزوں کے لیے سخت تباہ کُن ہیں جنہیں ہم عزیز رکھتے ہیں، نہ صرف مسترد کر دیں بلکہ اسلامی نظامِ حیات کی تعمیری اور مثبت اقدار پر مسلسل زور دیں اور انہیں اپنی زندگی میں عملاً نافذ کریں۔ تہذیبِ جدید کی تباہ کاریوں سے اپنی دینی و تہذیبی زندگی کو محفوظ رکھنے کا اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ تہذیبِ جدید کے مقابلے میں مثبت نظریاتی بُنیادوں کا وجود اجنبی اثرات کو ہمیشہ کے لیے ملیامیٹ کر دے گا۔ یہ کام سرانجام دیتے وقت ہمیں اپنی صفوں میں شامل مفاد پرستوں کے ساتھ زندگی اور موت کی کشمکش کرنا پڑے گی۔ اس لیے کہ یہ مفاد پرست ہماری مساعی کو ناکامی سے دوچار کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں گے۔ ہم ان سطور میں جو راہِ عمل تجویز کر رہے ہیں یہ لوگ اسے ہمیشہ تضحیک و استہزاء کا نشانہ بناتے ہیں۔ اسے قطعاً ناقابلِ عمل اور محض خوش خیالی کا حاصل گردانتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ صنعتی ترقی کے اِس دَور میں پُوری دنیا ایک دوسرے کی اس طرح دست نگر ہو چکی ہے کہ کوئی قوم جدید تہذیب سے دامن کش رہ کر اپنا وجود

قائم رکھنے کی توقع نہیں رکھ سکتی۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جدید دنیا میں کسی حکومت کا تیرہ صدی قبل کے آسمانی قانون پر عمل پیرا ہونا ناممکن ہے۔ وہ بار بار بڑے شد و مد سے کہتے ہیں کہ اسلامی شریعت آثارِ قدیمہ بن چکی ہے اور خلافت کی حیثیت عجائب گھر میں رکھی جانے والی کسی نادر شے سے زیادہ نہیں ہے۔

ان کا یہ طرزِ استدلال سخت قابلِ گرفت ہے۔ جو لوگ "حقیقت پسندی" (realism) اور "عملیت" (practicality) کو ہر چیز پر مقدم رکھتے ہیں، کیا کبھی انہوں نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا کی ہے کہ اگر ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اندازِ طبیعت بھی یہی ہوتا تو حضور اور آپ کے مٹھی بھر اصحابؓ اپنے عہد کی عظیم ترین شاہنشاہی طاقتوں سے نبرد آزمائی کو ناممکن جان کر حصولِ مقصد سے مایوس ہو جاتے۔ اس منطق پر عمل کیا جاتا تو کبھی جنگِ بدر نہ لڑی جاتی۔ غربت زدہ مسلمان اس قدر قلیل التعداد تھے کہ وہ اسلحہ میں غرق تین ہزار قریشی سواروں کے مقابلے میں صرف تین سو آدمی میدان میں لا سکے، جن کے پاس نہ پورے ہتھیار تھے نہ سواری کے جانور۔ کیا یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ وہ "حقیقت پسند" (realist) ہی تھے جنہیں کعبہ میں رکھے ہوئے بتوں کی تباہی کا خطرہ تھا، وہ انہیں صرف اس لئے ہی کا نہیں پورے عرب کی آمدنی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ جو لوگ "عملیت" کے دلدادہ اور اس کی مدح و توصیف میں مصروف ہیں انہیں اپنی منطق کی رُو سے حضرت علی رضؓ کے مقابلے میں امیر معاویہؓ کی دنیوی کامرانی کا قصیدہ سرا ہونا چاہیئے اور حضرت حسینؓ کو ایک سرپھرا شخص قرار دینا چاہیئے، کیونکہ کربلا میں اُن کی کامیابی کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔ فی الحقیقت مسلمانوں اور کافروں کے کردار کا امتیازی نشان یہی ہے کہ کافر اپنے اعمال کی بنیاد موقع پرستی اور مصلحت کو بناتے ہیں اور مسلمان دنیوی نتائج کی پروا کیے بغیر وہی کچھ کرتے ہیں جو حق کا تقاضا ہوتا ہے۔

شریعت کا تفوق تسلیم کیے بغیر اسلامی معاشرہ وجود ہی میں نہیں آ سکتا۔ شریعتِ الٰہی کی نظر میں چونکہ حاکم و محکوم دونوں برابر کی رعایا ہیں اس لیے ایک صحیح اسلامی ریاست میں

ظلم و استبداد کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ شریعت کے فیض ثمرات سے پوری طرح بہرہ اندوز ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی تعبیر ہمیشہ اُس کے ظاہری مفہوم تک محدود رکھی جائے۔ نہ کسی قسم کی رعایت سے کام لیا جائے اور نہ زمانے کی نام نہاد تبدیلی کے پردے میں کسی مصلحت کا شکار ہوا جائے۔

یہاں اجتہاد (شریعت کی تعبیر میں آزادانہ رائے کا استعمال) اور تقلید (فقہائے متقدمین کی رائے پر انحصار) کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ عالمِ اسلام جس زوال و انحطاط اور جمود کا شکار ہے اُس کا ذمہ دار بالعموم "تقلید" کو گردانا جاتا ہے۔ یہ گویا آج کل کی ایک رسم بن چکی ہے، لیکن یہ ایک گمراہ کن رائے ہے۔ اس مغالطہ کا بے نقاب کرنا نہایت ضروری ہے۔ تقلید درحقیقت اِن افسوسناک حالات کا سبب نہیں نتیجہ تھی۔ صلیبی جنگوں اور منگولوں کے حملوں کے دوران میں بے شمار علمی مراکز تباہ ہو گئے، لیکن اس دور کے ممتاز فقہا اور علماء اتنے دور اندیش ضرور تھے کہ اس کے نتائج و عواقب ان کی نگاہ سے اوجھل نہ رہے۔ وہ سمجھ گئے کہ اگر نا اہل، غیر مجاز اور جاہل لوگوں کو شریعت میں من مانی تحریف کرنے کی چھٹی دیدی گئی تو معاشرہ مکمل انتشار کا شکار ہو کر پراگندہ ہو جائے گا، چنانچہ وہ اجتہاد کے نام نہاد تجربے کا حصہ بننے کے بجائے تقلید پر زور دینے لگے۔ آج کل جدید تعلیم یافتہ رہنما، جنہیں اسلامی اقدار کی قدر و اہمیت کا یا تو سرے سے احساس ہی نہیں ہے یا ہے تو نہ ہونے کے برابر، اسلامی شریعت کو مسخ کرنے کی خاطر حقِ اجتہاد کا دعوی کر رہے ہیں، چنانچہ وہ اِس مقصد کے پیشِ نظر مسلمہ ائمہ کی فقہ کو مسترد کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ فقہ آج کی دنیا میں مناسب و موزوں نہیں رہی۔ اس سلسلے میں وہ حدیث کی صحت کو بھی مشکوک گردانتے ہیں۔ اس طرح چاہتے ہیں کہ انہیں مغربی بدعات کو رواج دینے کے زیادہ سے زیادہ مواقع مل جائیں۔ اسے یہ تجدد دین اجتہاد قرار دیتے ہیں۔

اجتہاد بلاشبہ اسلامی فقہ کا ایک بنیادی اور ناگزیر اصول ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس کے جواز کی توثیق فرمائی ہے۔ بنابریں اصولی اعتبار سے اس کو مسترد نہیں کیا جا

سکتا۔ دراصل قابلِ مذمت وہ ناجائز طریقِ عمل اور اندازِ تعبیر ہے جو اجتہاد کے نام پر اختیار کیا جاتا ہے۔ اجتہاد صرف وہی جائز ہے جو:

۱۔ صرف ان معاملات میں کیا جائے جن کے متعلق قرآن و سُنّت کی واضح نصوص موجود نہ ہوں۔

۲۔ قرآن و سنّت سے متصادم نہ ہو۔

۳۔ قرآن و سُنّت کے صحیح اُصولوں پر پردہ ڈالنے کے لیے کوئی غلط استدلال نہ کیا جائے۔

ہمارے متجددین ان تمام شرائط کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ خصوصاً آخری شرط تو بُری طرح پامال ہو رہی ہے۔

> جدید حالات کی روشنی میں شریعت پر نظرِ ثانی کی کوشش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی مداومت اور حکمی کا شائبہ تک باقی نہ رہے گا، جو ایک مسلمان کے نزدیک شریعتِ الٰہی کے تصوّر کا لازمی اور ناگزیر جزو ہے۔ اس لیے کہ شریعت پر نظرِ ثانی اگر آج ضروری قرار پاتی ہے تو چند عشروں کے بعد پھر ضروری ہو جائے گی، کیونکہ اُس وقت "جدید حالات" بدل چکے ہوں گے۔ اس طرح یہ سلسلہ جاری رہے گا حتّٰی کہ اس عملِ پیہم کے نتیجے میں اسلامی شریعت کا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔ اگر یہ عمل درست اور بجا ہے تو پھر ہمیں یہ دعویٰ کرنے کا کیا حق ہے کہ شارع نے اسلامی شریعت کو ابدی شریعت بنایا ہے؟ اس صورت میں کیا یہ کہنا زیادہ درست نہ ہوگا کہ چونکہ یہ شریعت حالات کو اپنے مطابق ڈھالنے کے بجائے خود ان کی تابع ہے اس لیے شریعتِ الٰہی نہیں ہو سکتی[1]

---

[1] *Principles of State and Government in Islam*, Muhammad Asad, University of California Press, Berkeley, 1961, .PP. 2-3, 102-103.

تعلیم اسلامی معاشرہ کا اہم ترین فرض ہے۔ احیائے اسلام کا کام جمہورِ اُمّت کی تائید کے بغیر ناممکن ہے۔ جب تک نوخیز نسل کو اپنے مذہب کی افادیت کا پُورا پُورا احساس و شعور نہ ہو، کامیابی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

یہ کام کس طرح سرانجام پا سکتا ہے؟

اوّل ہمیں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ ہمارے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا صحیح مقام مسجد ہے۔ ہماری ہر مسجد کو ایک مدرسہ ہونا چاہیے۔ دوم ہر تعلیمی سطح پر عربی کو لازم قرار دیا جائے اور اسے دیگر مضامین پر فوقیت دی جائے۔ مسلمان بچّے نہ صرف قرآن پڑھنا اور حفظ کرنا سکیں بلکہ اس کے معانی بھی پوری طرح سمجھیں۔ ذریعۂ تعلیم عربی ہو۔ عربی کو محض ایک ضمنی مضمون کی نہیں نقطۂ ماسکہ کی حیثیت حاصل ہو اور پُورا نصابِ تعلیم اس کے گرد گھومے۔ تمام مضامین کی تعلیم کا قرآن کریم کے ساتھ گہرا ربط ہو اور دینی و دنیوی تعلیم کے درمیان تفریق و امتیاز کو ختم کیا جائے۔ اس طرح پُورے نصابِ تعلیم میں ہم آہنگی اور سالمیت پیدا کی جائے۔ یورپی زبانوں، ادب، فلسفہ اور قانون کی تعلیم صرف یونیورسٹی کے اعلیٰ مدارج تک محدود رکھی جائے۔ ہمیں اپنے بچّوں اور نوجوانوں کو کسی صورت میں جدید تعلیم کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑنا چاہیے، کیونکہ جلد متاثر ہونے والے اور ناپختہ ذہنوں کے لیے اس سے بڑھ کر سمِ قاتل اور کوئی نہیں۔ دوسری طرف اربابِ اختیار اور ذی اثر اصحاب کا جدید تہذیب سے پُوری طرح آگاہ ہونا نہایت ضروری ہے تاکہ وہ اس کے اثرات کا توڑ موثر طریقے سے کر سکیں۔

ہمارے نوجوانوں میں اپنے ماضی کا واضح فہم و ادراک اور حال کے ساتھ اُس کا گہرا ربط ہونا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے ہمیں اسلامی تاریخ کے متعلق انقلابی طرزِ عمل اختیار کرنا ہوگا۔ قرونِ وسطیٰ کے یورپ کو یونانی فلسفہ معتزلہ (عقلیت پرستوں) کے ذریعے ملا تھا۔ ہمارے منتخب طبقے کی بھاری اکثریت اسے انسانیت کے فکری ارتقا میں اسلامی تہذیب کا بہت بڑا حصّہ قرار دیتی ہے۔ الکندری، الفارابی، ابنِ سینا اور ابنِ رُشد ایسے یونانی فلسفے کے فضلاء کی مدح و توصیف میں

زمین و آسمان کے قلابے ملائے جاتے ہیں، جس کے وہ فی الواقع مستحق نہیں ہیں۔ اسلامی تاریخ کا صحیح تر خطوط پر مطالعہ ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دیتا ہے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ، صلاح الدین ایوبیؒ اور اورنگ زیبؒ عالمگیر کے کارنامے اتنے جلیل القدر کیوں ہیں۔ جدید مغربی تہذیب کی تخلیق میں اسلام کے کردار کے متعلق شیخی بگھارنے کے بجائے ہمیں اس حقیقت سے باخبر ہونا چاہیئے کہ مسلمانوں کی وساطت سے یونانی فلسفہ کا قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں پہنچنا محض ایک اتفاقی امر تھا اور اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ اسلام کا ماخذ خطا سے منزہ خدائی الہام ہے بنابریں وہ ایک مکمل، خودنگر اور انسان کے خود ساختہ فلسفہ سے مطلقاً آزاد دین ہے۔ ماضی یا عصرِ حاضر کی کسی تہذیب کے مقابلے میں اس کی صحت کو جانچنے پرکھنے کی سعی لاحاصل ہے، نیز یہ دعویٰ بھی بے سود ہے کہ اسلام نے قرونِ وسطیٰ کے یورپ کی تشکیل میں اہم حصہ لیا ہے اور یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ اسلامی تہذیب عظیم تر تہذیب ہے۔ اسلام اپنی زندگی اور عظمت کے لیے کسی کا محتاج نہیں ہے، نہ وہ کسی اور تہذیب کا تابع ہے۔

ہمارے حکمرانوں کا یہ دینی فریضہ ہے کہ وہ اپنی شخصی حیثیت میں نظامِ تعلیم کی ترقی میں دلچسپی لیں، اس کی اخلاقی تائید کریں اور دل کھول کر مالی امداد دیں، تاہم درس گاہوں کو ریاست کے براہِ راست تسلط سے بالکل آزاد ہونا چاہیئے اور انہیں خود مختار بنیادوں پر پھلنے پھولنے کی اجازت ہونی چاہیئے۔ متمول افراد کو ترغیب دینی چاہیئے کہ وہ زکوٰۃ اور رضا کارانہ صدقات کے ذریعے درس گاہوں کی مالی امداد کریں۔ زکوٰۃ، رضا کارانہ صدقات، عطایہ اور اوقاف کی امداد کے بل پر ابتدائیہ مدارس سے لے کر یونیورسٹی تک کی تعلیم مفت دی جا سکے گی۔ ابتدائی تعلیم ہر بچے کے لیے لازمی قرار دی جائے، البتہ ثانوی اور یونیورسٹی کی تعلیم صرف ان نوجوانوں تک محدود رہے جو اپنی فطری دلچسپی اور ذہنی صلاحیت کی بنا پر اس سے خاطر خواہ استفادہ کر سکیں۔ والدین کو ہر قسم کی مراعات اور سہولتیں فراہم کی جائیں تا کہ وہ اپنے بچے مدرسوں میں بھیجیں، تاہم قانونی جبر سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ یہ فیصلہ کرنا بنیادی طور پر ریاست کی نہیں، ماں باپ کی ذمہ داری

ہے کہ وہ اپنے بچوں کی تربیت کن خطوط پر کرے۔

اسلامی معاشرہ کا ایک اور اہم فرض خاندان کا تحفظ ہے۔ باہمی شفقت اور ذمہ داری پر مبنی مضبوط خاندانی روابط ایک صحت مند معاشرہ کے لیے ناگزیر اور لازمی ہیں۔ بزرگوں کی سعادت مندانہ اطاعت، ان کا احترام اور لحاظ و مروّت نہایت ضروری ہے۔ اس کی ہر ممکن طریقے سے حوصلہ افزائی کی جانی چاہیئے۔ انتہائی موثر طریقہ یہ ہے کہ تقدیسِ شباب اور جوانی کی پوجا کا مسلک ختم کر دیا جائے۔ عورتیں جب صحت مند خانگی زندگی کے تحفظ کی عظیم ذمہ داری کی اہمیت اور اس کے بجا لانے میں عزت و وقار محسوس کریں گی تو مردوں کا کردار ادا کرنے کی خواہش مند نہیں رہیں گی، پھر وہ کاروبار اور سیاست کے میدان میں مردوں کے مقابلے کو اپنے انسانی وقار کا مسئلہ نہ سمجھیں گی نہ ساتر اور حیادار لباس پہننے کی مُعتقِن، کھلے عام بے پردگی کے مظاہرے اور جسمانی نمائش کو قانوناً روکنے پر چراغ پا ہوں گی۔

اسلامی معاشرہ کے لیے لازمی ہے کہ اختلاطِ مرد و زن کو روکے اور بلوغت کے بعد لڑکوں اور لڑکیوں کو علیحدہ کر دے۔ غیر اخلاقی کتابوں، اخبارات و رسائل، کتابوں اور تجارتی اشتہارات میں تصویروں کی اشاعت پر پابندی عائد کرے، نشہ آور مشروبات کی فروخت کو ممنوع قرار دے اور ناجائز جنسی تعلقات پر حد نافذ کرے۔ اسلام کی اخلاقی قدروں کے لیے سینما کی موجودہ صنعت سے بڑھ کر زہر ہلاہل اور کوئی شے نہیں ہے اس لیے ضروری ہے کہ تمام غیر ملکی فلموں کی درآمد بند کر دی جائے اور اندرونِ ملک میں اخلاق کش، حیا سوز اور فحش فلمیں تیار کرنے پر پابندی لگا دی جائے۔ سینما اور ٹیلی ویژن کو صرف دینی اور تعلیمی مقاصد تک محدود رکھنا چاہیئے۔

ہمیں قومیت پرستی کی برائی کے خلاف زبردست جنگ لڑنا ہو گی اور عالم اسلام میں پھیلی ہوئی اُمتِ مُسلمہ کے باہمی روابط مضبوط کرنا ہوں گے۔ مختلف مسلمان ملکوں کا سیاسی اتحاد فوراً ممکن نہ ہو تو پاسپورٹ، ویزا، درآمد و برآمد پر محصول اور چنگی وغیرہ ختم کر کے آزادانہ

تجارت اور بے روک ٹوک سفر کو فروغ دے کر اس کا راستہ ہموار کیا جا سکتا ہے۔

مسلمان ممالک میں جو اقلیتیں سکونت پذیر ہیں انہیں مذہبی و ثقافتی آزادی حاصل ہوگی اور ان کے حقوق کا تحفظ قانونِ شریعت کے مطابق پوری دیانت داری سے کیا جائیگا۔

جب تک ہم غیر ملکی تہذیب کی نقالی کے تباہ کن نتائج کا اعتراف کر کے اسے ختم کرنے کی ہر ممکن تدبیر نہیں کریں گے، قوتِ حیات سے بہرہ مند نہیں ہو سکتے۔ اگر کسی شخص کا یہ خیال ہے کہ مغربی لباس اور بود و باش کا انداز اختیار کرنے سے اجتناب قومی زندگی کے لیے فیصلہ کن اہمیت نہیں رکھتا تو اسے ہمارے مشہور مورخ ابن خلدون (۱۳۳۲ - ۱۴۰۶ء) کی مندرجہ ذیل رائے کو غور سے سُننا چاہیئے۔

"مفتوح اقوام ہمیشہ فاتح قوموں کے لباس، امتیازی نشان، رسم و رواج اور معمولات کی اتباع کی خواہش مند ہوتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ لوگ ہمیشہ ان لوگوں کو بہترین اور کامل نمونہ سمجھتے ہیں، جو اُنہیں شکست دے کر محکوم و مطیع بنا لیتے ہیں۔ فاتحین کی عظمت و عزت اُن کے دل میں گھر کر جاتی ہے، یہی جذبۂ احترام انہیں ان فاتحین کا رنگ ڈھنگ اختیار کرنے پر مائل کرتا ہے، یا پھر وہ اپنی شکست کے حقیقی اسباب و عوامل کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اُنہیں یقین ہو جاتا ہے کہ اِن فاتحین کی کامرانی کا سبب ان کی انتہائی کاملیت ہے۔ ایک لمبا عرصہ گزرنے پر یہ یقین گہری جڑیں پکڑ لیتا ہے، چنانچہ وہ فاتحین کے طور اطوار اور عادات و خصائل کی نقالی کرنے لگتے ہیں۔ یہ نقالی غیر شعوری طور پر بھی کی جا سکتی ہے اور اس غلط اعتقاد کی بنا پر بھی کہ فاتحین کی فتح یابی ان کی برتر عصبیت، قومی استحکام اور جسمانی قوت کی بنا پر نہ تھی، بلکہ مفتوح قوم کے رسم و رواج اور کمتر عقائد اس کے ذمہ دار تھے، وہ اس خیالِ خام میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اس طرح نقالی کر کے شکست کے اسباب و عوامل کا ازالہ ہو جائے گا۔۔۔

درحقیقت ہر وہ مُلک جس کے پڑوسی زور آور فاتح ہوتے ہیں، اپنے ان پڑوسیوں کی نقالی کی کوشش کرتا ہے جیسا کہ ہم سپین کے مسلمانوں کو دیکھتے ہیں۔۔۔۔۔ وہ لباس اور زیب و زینت وغیرہ میں اپنے عیسائی پڑوسیوں کی نقالی کرتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ یہاں تک بڑھ گئے ہیں کہ اُن کے گھروں اور دکانوں میں مجسمے اور تصویریں تک موجود ہیں۔ نگاہِ غائر سے دیکھیں تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ لوگ احساسِ کمتری میں مبتلا ہو چکے ہیں"[1]

ابنِ خلدون نے صرف ایک پیرے میں ایک عبقری کی سی بصیرت کے ساتھ اُس مرض کی ٹھیک ٹھیک نشاندہی کر دی ہے جس میں ہم مبتلا ہیں۔ مداوا ظاہر ہے۔ اگر ہمیں اپنے مذہب اور اُس کی میراث پر واقعی فخر و ناز ہے تو لازم ہے کہ اس کا اظہار ہماری ظاہری وضع قطع سے بھی ہو۔ اگر ہم اپنے دشمنوں کی نظیر بننا نہیں چاہتے تو ہمیں اُن کی مشابہت بھی اختیار نہیں کرنی چاہیئے۔ اگر ہم اپنے آپ کو مسلمان کے طور پر پیش کرنے سے شرماتے ہیں تو مسلمان کہلانے کے مستحق یقیناً نہیں ہیں۔

"کوئی نہایت کم مایہ ماہرِ نفسیات ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ امور چونکہ خارجی نوعیت کے ہیں اس لیے ذرا اہمیت نہیں رکھتے۔ انسان کے جسم کے بعد اُس کے کپڑے اور گھر اس کی روح سے قریب ترین اشیاء ہیں اور اُس پر بے اندازہ اثر ڈالتی ہیں۔ اسلامی تہذیب کے ماحول میں انسان کی رُوح کے لیے اپنے آپ کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنا نہایت آسان تھا۔ لیکن، کسی معقول سبب کے بغیر، اللہ کی عطا کردہ اس تہذیب کو بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے، چنانچہ ہم اکثر مسلمان ممالک میں دیکھتے ہیں کہ مردوں نے داڑھیاں صفاچٹ کروا دی ہیں، عمامے اتار دیے ہیں اور ایسا لباس پہننا شروع کر دیا ہے جو

---

[1] مقدمہ ابنِ خلدون جلد اوّل ص ۲۶۶

وضو کرنے میں سخت مخل ہوتا ہے اور نماز پڑھتے وقت انسان کی حرکات و سکنات کو عجیب بے ڈھنگا اور مضحکہ خیز بنا دیتا ہے۔ رہے ان کے گھر، تو ان میں کوئی چیز ایسی نہیں ملتی جس سے خدا یاد آتے، اگرچہ وہ خدا فراموش امور سے معمور ہوتے ہیں۔ ...... عمامہ مسلمان کی داخلی عظمت کا خارجی نشان ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمامہ کی مدح و توصیف بیان فرمائی اور مردوں کو داڑھی رکھنے کی تاکید کی ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ڈھیلے ڈھالے ملبوسات جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم زیب تن کیا کرتے تھے، صحیح معنی میں اسلامی ہیں کیونکہ صرف یہی ایک ایسا لباس ہے جس میں نماز پڑھتے وقت دقت نہیں ہوتی .... مدینہ طیبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مسکن مسجد نبوی ہی کا ایک اضافی حصّہ تھا اور بارہ صدیوں سے زائد عرصہ تک ہر مسلمان کا گھر قریب ترین مسجد کا اضافی حصّہ بنا رہا ہے۔ لوگ اپنے گھروں میں داخل ہوتے وقت جوتے اُتار لیتے تھے۔ فرش پر پاک چٹائیاں اور قالین بچھے ہوتے تھے۔ وہ گھروں میں بھی اسی ادب و احترام کے ساتھ بیٹھتے تھے جس طرح مساجد میں۔ دیواروں پر آویزاں طغرے خدا کی یاد دلاتے اور اسمائے حسنیٰ، آیاتِ قرآنی اور ارشاداتِ رسولؐ پر مشتمل ہوتے تھے۔ یہ ہے اسلامی تہذیب کا جوہر .... متذکرہ بالا امور میں آج تغیر و تبدل کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ پھر مسلمانوں کے گھر آج بھی مسجد کا اضافی حصّہ کیوں نہ ہوں۔ ایسے ماحول ہی میں اسلام فی الواقع پھل پھول سکتا ہے۔[1]"

اسلامی حکومت کے سایہ میں دنیا کے شب و روز کس نوعیت کے ہوں گے؟

جب لوگ اللہ تعالیٰ کی فرماں روائی اور اس کے قانون کی برتری کو تسلیم کر لیں گے، زندگی کی تمام باطل اقدار کا خود بخود خاتمہ ہو جائے گا۔ لوگ اپنے جیسے انسانوں کے نہیں اپنے خالق و مالک اللہ کے غلام ہوں گے۔ بالفاظِ دیگر وہ ہر قسم کے ظلم و استبداد سے آزاد ہو جائیں گے۔ انسان کے مرتبہ و مقام کا فیصلہ اُس کی دنیوی کامرانیوں سے نہیں سیرت و کردار سے کیا جائے گا۔ نسلی امتیاز یا طبقاتی نفرت کی کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ نماز روزہ، حج اور زکوٰۃ انسانوں کے مابین شفقت و محبت، اعتماد اور ذمّہ داری کے بندھن مضبوط کر دیں گے۔ خوشحال لوگ اپنی دولت کو اللہ تعالیٰ کا عطیہ سمجھ کر اُس سے بہرہ اندوز ہوں گے، جس میں غریب کا بھی قانوناً جائز حصّہ ہوگا۔ یہ دنیا تصنع یا فریب سے پاک ہوگی۔ عورتیں مردوں کی مشابہت اختیار کرنے کی کوشش نہیں کریں گی نہ سن رسیدہ لوگ اپنے بڑھاپے پر نادم و متأسف ہوں گے۔ چونکہ دنیا کو محض ایک عارضی جائے قیام سمجھا جائیگا اس لیے لوگ ہر آن ابدی نجات کی فکر میں محو رہیں گے اور اللہ کے ذکر اور فکرِ آخرت سے غافل کرنے والی تمام باتوں کو برائی سمجھ کر ان سے احتراز کریں گے۔ شبینہ کلب، رقص گاہیں، ناٹک گھر، شراب خانے، قمار خانے اور چکلے ویران اور کاروبار نہ ہونے کی وجہ سے بند ہو جائیں گے۔

اسلامی معاشرہ یوٹوپیا نہ ہوگا، کیونکہ بے عیبی اور کاملیت اس خاکدان ارضی سے تعلق نہیں رکھتی۔ بعض لوگ تحریص کا شکار ہو کر قانون کی خلاف ورزی کریں گے، تاہم جرائم محدود ہو جائیں گے اور وبا کی طرح اخلاقی تباہ کاری پھیلنے کے بجائے اِکّے دُکّے افراد ہی ان کے مرتکب ہوں گے۔ کسی چیز کے غلط یا صحیح ہونے کے متعلق ذہنوں میں کوئی الجھن نہ ہوگی۔ اسلامی معاشرہ میں لوگ بلاشبہ مصائب و آلام سے بھی دوچار ہوں گے۔ اس لیے کہ انبساط و سرور کے ساتھ ساتھ غم بھی دنیوی زندگی کا جزو لاینفک ہے۔ اسلامی معاشرہ میں دکھ درد بھی ہوگا، قحط، بیماری اور موت بھی ہوگی، لیکن قنوطیت اور زندگی سے بیزاری نہ ہوگی۔ خودکشی کے واقعات اس معاشرہ کے لیے بالکل بیگانہ ہوں گے۔ ہر شخص زندگی کے مفہوم اور مقصد سے آگاہ ہوگا اور کسی ریب و تشکک میں مبتلا نہ ہوگا۔

---

[1] الحاج ابوبکر سراج الدین (سابق ڈاکٹر مارٹن لنگز) نومسلم انگریز بحوالہ مسلم نیوز انٹرنیشنل لندن جنوری ۱۹۶۳ء صفحہ ۱۹۔

(۳)

اِسلام ــــــ میدانِ عمل میں

علماء کون ہیں ؟

آج کل سبھی مسلمان ممالک میں ایک مخصوص گروہ علماء کے خلاف ناپاک پراپگنڈے میں مصروف ہے ۔ یہ لوگ بڑے پُرفریب انداز میں عالمِ اسلام کے علماء کا مقابلہ قرونِ وسطیٰ کی یورپی مسیحی دنیا کے پادریوں سے کرتے ہیں ، اور عامتہ المسلمین کو متنفر کرنے کے لیے ان کی بڑی بھیانک تصویر کھینچتے ہیں ۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ علماء عیش وعشرت کی زندگی گزارتے اور اپنے عقیدت مندوں کا استحصال کرتے ہیں ۔ انہوں نے مسلمانوں کو معاند فرقوں میں بانٹ رکھا ہے جو سب کے سب باہمی سر پھٹول اور جنگ وجدل میں معروف ہیں ۔ یہ لوگ ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ عالمِ اسلام ، اپنی ساری تاریخ میں جن مفاسد سے دوچار رہا ہے ان کی ذمہ داری علماء پر عاید ہوتی ہے ۔ اُن کے نزدیک ہم مسلمانوں کی پسماندگی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہم نے دین کی تعبیر وتشریح کا حق واختیار علماء کو دے رکھا ہے ۔ اس سارے ارہستہ سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کی نجات اس میں ہے کہ اسلام کی ان تمام تعبیرات کو مسترد کر دیں جو بیراوّعا پسند علماء پیش کرتے ہیں ، ان ملاؤں سے چھٹکارا پائیں اور اسلام کا ایک بالکل جدید قالب خود تیار کریں ۔

علماء کون ہیں ؟ کیا وہ پروہت ہیں ؟ کیا وہ ایک موروثی حکمران ذات ہے جس میں غیر ذات

کا کوئی آدمی شامل نہیں ہو سکتا؟ ان سب باتوں کا جواب یقیناً نفی میں ملے گا۔ ہر وہ مسلمان جو عربی زبان، قرآن، حدیث اور اسلامی فقہ کا ناگزیر مطلوبہ علم حاصل کر لیتا ہے عالم کے مرتبہ پر فائز ہو جاتا ہے۔ لیکن آج ہم ایک بے حد الم ناک صورتِ حال سے دوچار ہیں۔ ایک گروہ جو خالص انگریزی تعلیم یافتہ افراد پر مشتمل ہے، جس کی ایک بڑی تعداد نے مسیحی مشنریوں کے جاری کردہ سکولوں اور کالجوں میں پڑھا ہے؛ جو نہ صرف اسلامی تعلیم کی تحصیل اور اُس کی اہمیت کا منکر ہے بلکہ جس کا قلب اس کے لیے اپنے دامن میں نفرت کے سوا اور کچھ نہیں رکھتا، وہ مُصِر ہے کہ اُسے اسلام اور اُس کے قوانین کی ازسرِ نو تعبیر کا حق حاصل ہے۔ اُن لوگوں کا استدلال یہ ہے کہ اسلام ملاؤں کا اجارہ نہیں ہے۔ یہ ایک نہایت بودا استدلال ہے۔ اگر کسی کام کے لیے علمی مہارت اور تربیت درکار ہے تو اُسے، ضروری شرائط پر پُورا اُترنے والے لوگوں کے سوا اور کون بحسن و خوبی انجام دے سکتا ہے؟ پھر جو لوگ شریعت سے بالکل بے بہرہ ہیں انہیں اجتہاد کی اہمیت کا سزاوار کیوں کر قرار دیا جا سکتا ہے؟

ہمیں اپنی ساری تاریخ میں علماء عیش و عشرت اور راحت و طمانیت کی زندگی سے دُور، بڑے صبر و استقامت کے ساتھ انتہائی ناقابلِ برداشت آلام و شدائد کا سامنا کرتے نظر آتے ہیں۔ ان لوگوں کو تعذیب و اذیت کس نے دی؟ مسیحیوں، یہودیوں یا ہندوؤں نے نہیں، ہمارے اپنے حکمرانوں نے، جن کے نام مسلمانوں کے سے تھے، جو نہیں چاہتے تھے کہ اسلام مملکت کے معاملات میں حصّہ دار ہو۔ ابو حنیفہؒ، شافعیؒ، مالکؒ اور ابنِ حنبلؒ ایسے جلیل القدر ائمہ کو انتہائی ظلم و تشدد کیوں سہنا پڑا؟ اس لیے کہ انہوں نے معتزلہ کے بدعتانہ افکار کی توثیق سے انکار کر دیا تھا جو اُس زمانے کے حکمران طبقے میں بے حد مقبول تھے۔ امام احمدؒ کو کوڑوں کی ایسی سخت مار کیوں ماری گئی کہ اگر ہاتھیوں پر بھی پڑتی تو وہ چلّا اُٹھتے۔ امام ابنِ تیمیہؒ کا جرم کیا تھا کہ انہیں بار بار قید و بند میں ڈالا گیا حتیٰ کہ وہ قید ہی کی حالت میں واصل بحق ہو گئے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحؒ کو جہانگیر نے گوالیار کے قلعے میں کیوں قید کیا؟ کیا اس لیے نہیں کہ انہوں نے بادشاہ کے آگے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

آج طاقت کس کے ہاتھ میں ہے؟ علماء کے ہاتھ میں یقیناً نہیں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جو علماء جدید زندگی کے غیر اسلامی معمولات کی علانیہ مذمت کرتے ہیں، جو لادینیت، مادّہ پرستی اور الحاد کی راہ میں مزاحم ہیں اور جو احیائے اسلام کی جدّوجہد کرنے والی تحریکوں کے حامی ہیں، وہ تقریباً ہر مسلمان مُلک میں دار و گیر کا شکار ہو رہے ہیں۔ اس تعذیب و اذیت اور جبر و تشدد کا سبب اس کے سوا اور کیا ہے کہ انہوں نے بدعات و منکرات کے مقابلے میں نہایت صبر و ثبات اور جرأت کے ساتھ دین کا پرچم بلند کر رکھا ہے۔ مُلّا کی مذہبی آمریت کہاں ہے؟ اگر علماء مسلمانوں کو آزادی کے ثمرات سے محروم کرنے اور روشن خیالی اور ترقی کی راہ سے روکنے کی طاقت رکھتے ہیں تو وہ اس سارے ظلم و جور کا تختۂ مشق بننے پر کیوں مجبور ہیں؟

عامۃ المسلمین کے دل میں ان علماء کے لیے عزّت و احترام کا جو جذبہ پایا جاتا ہے وہ نہ تو محض ایک امرِ اتفاقی ہے اور نہ نری قدامت پسندی یا تقلید کا شاخسانہ۔ انہیں مسلمان معاشرہ میں جو عظمت و وقعت ہے وہ کسی مادّی طاقت کی مرہونِ منّت نہیں ہے، بلکہ انہیں یہ مقامِ عظیم محض اُن کے کمالِ علم و فضل، بصیرت، کردار، ورع و تقویٰ اور اسلام کی راہ میں جدّوجہد، قربانیوں اور مصائب و شدائد کی بدولت مِلا ہے۔ اُن کی زندگی اور کام بجائے خود اس بات کا یقین پرور ثبوت ہے کہ انہوں نے شریعت کے صحیح معانی و مطالب معلوم کرنے میں ہر ممکن انسانی کوشش کی ہے اور ان کی پیش کردہ تعبیر پر کامل اعتقاد اور دیانت داری کے ساتھ اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

جو لوگ علماء پر تہمت طرازی کرتے ہیں اور ان کی تعبیرات کو "ادعائی فاضل اصحاب" کی رائے قرار دے کر مسترد کرتے ہیں، وہ گویا بالفاظِ دیگر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اہلِ بیتؓ، صحابہ کرامؓ، بخاریؒ، مسلمؒ، ابو حنیفہ رحؒ، شافعیؒ، مالکؒ، ابنِ حنبلؒ، ابنِ تیمیہؒ، شیخ احمد سرہندیؒ اور شاہ ولی اللہؒ ایسے سب "ادعائی فاضل اصحاب" نے اسلام کی غلط تعبیر کی تھی اور چودہ سو برس کے بعد آج مغرب کے تہذیبی استعمار کے سائے میں پلنے اور پروان چڑھنے والے ان تجدد پسندوں

کو اسلام کی صحیح تعبیر پیش کرنے کا شرف حاصل رہتا ہے۔ یہ نئے اِسلام کی تخلیق بلکہ قرآن وسنت کے اسلام کے بجائے لندن اور نیویارک کے مسیحی مشنریوں اور مستشرقین کے بتائے ہوئے جعلی دین کو رائج کرنے کے لیے کیسا عجیب استدلال اور پُرفن حیلہ ہے۔

محمد بن عبدالوہابؒ کی تحریک

بارھویں صدی ہجری (اٹھارہویں صدی عیسوی) کے آغاز میں دنیائے اسلام کا دینی و اخلاقی انحطاط انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ اس عہد کے مسلمان قرنِ اول کے مسلمانوں سے بالکل مختلف تھے۔ خود مسلمان ہی نہیں غیر مسلم بھی اس تفاوت پر متعجب تھے۔ امریکی مصنف لوتھروپ سٹاڈرڈ نے اس دورِ انحطاط کی نہایت صحیح تصویر کھینچی ہے۔ امیر شکیب ارسلانؒ کے الفاظ میں کوئی انتہائی متبحر مسلمان عالم اور مفکر بھی ایسی واضح، صاف اور بلیغ تصویر نہیں کھینچ سکتا وہ لکھتا ہے:-

"دیگر امور کی طرح مذہب بھی زوال پذیر تھا۔ تصوف اور طفلانہ توہمات کی کثرت نے خالص اسلامی توحید کو مستور کر دیا تھا۔ مسجدیں سونی اور ویران تھیں۔ جاہل عوام ان سے منہ موڑ چکے تھے اور تعویذ گنڈے اور مالا میں پھنس کر غلیظ فقرا اور درویشوں سے اعتقاد رکھتے تھے، بزرگوں کے مزاروں کی زیارت کو جاتے تھے۔ انہیں ولی اور بارگاہِ ایزدی میں شفیع سمجھ کر ان کی پرستش کی جاتی تھی۔ قرآنِ مجید کی اخلاقی تعلیم کو نہ صرف پسِ پُشت ڈال دیا گیا تھا بلکہ اُس کی خلاف ورزی بھی کی جاتی تھی۔ مقاماتِ مقدسہ یعنی مکہ اور مدینہ بھی معصیت اور بد اعمالی کے قعرِ مذلت بن گئے تھے۔ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پھر سے دنیا میں تشریف لاتے تو وہ اپنے متبعین

کے ارتداد اور بُت پرستی پر سخت اظہارِ بیزاری فرماتے تھے[1]۔

یہ تھے وہ حوصلہ شکن حالات جب ۱۷۰۳ء میں محمد بن عبدالوہابؒ پیدا ہوئے۔ اُنکا خاندان اپنے علم اور ورع و تقویٰ کی بنا پر سارے نجد میں مشہور تھا۔ وہ بچپن ہی سے غیر معمولی دماغی اور جسمانی صلاحیتیں رکھتے تھے۔ چودہ پندرہ برس کے تھے کہ اُن کا شمار عرب بھر کے ممتاز علماء میں ہونے لگا۔ ان کے علم و فضل کی شہرت سُن کر طالبانِ علم دُور دُور سے آنے لگے، لیکن ابھی وہ خود علم کے پیاسے تھے، چنانچہ وطن سے نکل کھڑے ہوئے پہلے مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ پہنچے اور پھر ایران میں اپنے عہد کے ممتاز اساتذہ کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا۔

پھر وطن واپس آئے اور دعوت و ارشاد میں مشغول ہوگئے۔ جلد ہی مرجعِ خلائق بن گئے۔ ان کے بڑھتے ہوئے اثر کو دیکھ کر علاقے کے حکمران سخت پریشان ہوئے۔ انہیں اپنا اقتدار خطرہ میں نظر آیا، چنانچہ ان کے علاقے کے امیر نے مقامی گورنر کو ایک پیغام میں اس خطرہ کی خبر دیتے ہوئے کہا:

"...... شیخ محمد بن عبدالوہابؒ نے میری مرضی کے خلاف عمل کیا ہے، اس لیے انہیں فوراً قتل کر دیں ورنہ ہم آپ کو خراج دینا بند کر دیں گے......"

شیخ نے سُنا تو پوری بے خوفی کے ساتھ اپنی دعوت کا اعلان کیا:

"میرا موقف لا الٰہ الا اللہ ہے۔ میں اسلام کے بُنیادی اصولوں کو اپنانے، نیک کام کرنے اور بُرے کاموں سے باز رہنے کی دعوت دیتا ہوں۔ اگر تم اس دعوت کو قبول کرو گے اور اس پر ثابت قدم رہو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے دشمنوں پر غلبہ عطا کرے گا"

لیکن مقامی گورنر نے اس دعوت کو ٹھکرا دیا اور شیخ کو ملک سے نکل جانے کا حکم دے دیا؛

---

[1] The New World of Islam, PP. 25-26.

چنانچہ شیخ ملک چھوڑنے اور بھٹی کی طرح تپتی ہوئی ریت پر برہنہ پا سفر کرنے پر مجبور ہوگئے۔ شیخ ایک مدّت تک سرگرداں رہے۔ اسی دوران میں درعیہ کا امیر محمد بن سعود دعوت سے متاثر ہوا، اُس نے شیخ کو سر آنکھوں پر بٹھایا اور عہد کیا کہ وہ اس دعوت کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ان کے ساتھ تعاون کرے گا۔ محمد بن عبدالوہابؒ محض اسلام کی تبلیغ و تلقین ہی پر قانع نہ تھے بلکہ وہ ایک ایسا معاشرہ قائم کرنے کا عزم رکھتے تھے جس میں اسلام کی خالص، نکھری ہوئی پاکیزہ تعلیمات کو زندگی کے عملی دستور کی صورت میں نافذ کیا جا سکے۔ محمد ابن سعود کی حکومت کے زیرِ سایہ لوگوں کا طرزِ زندگی، اعتقاد اور کردار یکسر بدل گیا۔ قبل ازیں اکثر لوگ برائے نام مسلمان تھے کلمۂ شہادت کے سوا کچھ نہ جانتے تھے اور وہ بھی غلط سلط۔ اب ہر شخص سے باجماعت نماز پڑھنے، روزے رکھنے اور زکوٰۃ دینے کا مطالبہ کیا گیا۔ تمباکو نوشی، ریشم اور عشرت پرستانہ زندگی کے نشانات محو اور تمام غیر اسلامی ٹیکس منسوخ کر دیئے گئے۔ کئی صدیوں کے بعد پہلی مرتبہ مُلک میں امن و امان کا ایسا دَور دَورہ ہوا کہ بدّو چوری چکاری اور لُوٹ مار کے خوف و اندیشہ سے آزاد رات کو چین کی نیند سونے لگے۔ ایک سیاہ فام غلام بھی انتہائی طاقت ور قبیلے کے سردار کے سامنے اپنی شکایات پیش کرتا اور اس کی بداعمالیوں کا مواخذہ کرتا تھا۔ فرقہ وارانہ آویزش ختم ہوگئی، کیونکہ تمام مکاتب فکر کے علماء مساجد میں باری باری نماز پڑھاتے تھے۔

شیخ محمد بن عبدالوہابؒ بلند پایہ مجدد اور امام احمد ابن حنبلؒ اور امام ابن تیمیہؒ کے صحیح معنوں میں جانشین تھے۔ اپنے پیشروؤں کی طرح انہوں نے معتزلہ کے استدلالی ہیومانزم کو مسترد کر دیا۔ قرآنِ کریم اور خالص سُنّتِ رسولؐ کو اپنانے اور ان کے سیدھے سادے ظاہری معانی کے مطابق ان کی بے چون و چرا اطاعت پر زور دیا۔ قرآن مجید کی متصوفانہ تفاسیر اور شروح پر دیدہ ریزی کے بجائے سیدھے سادے متن کی طرف رجوع کرنے کی تاکید کی۔ اُن کا یہ اندیشہ بالکل بجا تھا کہ چونکہ تفاسیر اور حواشی انسان کی ذہنی کاوش کا نتیجہ ہوتے ہیں اس لیے بے خطا نہیں ہو سکتے۔ ان کا موقف یہ تھا کہ اگر قرآن مجید کو مختلف تفسیروں کے ساتھ خلط ملط کر دیا گیا تو کلامِ پاک کی صاف

گستری تعلیم تک رسائی مسلمانوں کے لیے ناممکن ہو جائے گی اور وہ اپنے آپ کو اسی ناگوار صورت حال سے دوچار پائیں گے جس میں ان سے پہلے یہودی اور عیسائی مبتلا ہو چکے ہیں۔ شرعی مسائل میں شیخ محمد بن عبدالوہابؒ حنبلی مسلک کے پابند تھے، تاہم وہ امام ابن حنبلؒ کے اندھے مقلد نہ تھے۔ اپنی کتابوں میں انہوں نے بالصراحت کہا کہ جو مسلمان دیگر تین ائمہ کے فقہی مسلک سے وابستہ رہنا چاہتے ہیں، انہیں ان پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔

اللہ نے انہیں بے خطا روشن و واضح بصیرت عطا کی تھی۔ اس خداداد بصیرت کے ذریعے انہوں نے ہم عصر مسلمانوں کے بدترین روگ کی تشخیص کی، اور وہ تھا تصوف سے مریضانہ دل لگاؤ۔ یہ بات یقینی ہے کہ شیخ تصوف کے مخالف نہ تھے۔ ایران کے زمانۂ قیام میں انہوں نے صوفیاء کی متعدد شاخوں کا ہمدردانہ مطالعہ کیا تھا، لیکن عمر کی پختگی کے ساتھ ساتھ ان پر آشکارا ہو گیا کہ تصوف کے مفاسد اتنے گہرے اور عام ہو چکے ہیں کہ مسلمانوں کو اس سے بچانا نہایت ضروری ہو گیا ہے۔ جس طرح پانی ایسی صاف اور حلال شے بھی اگر مریض کے لیے مضر ہو تو ڈاکٹر اس کی ممانعت کر دیتے ہیں، اسی طرح تصوف کا مسلک اگرچہ اصولاً جائز ہے، تاہم حالات کا تقاضا یہ ہے کہ اسے مسترد کر کے بالائے طاق رکھ دیا جائے۔ "بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید" کی ذہنیت روحانی مرشد اور اربابٌ مِنْ دُونِ اللّٰہِ کے درمیان امتیاز نہیں کر سکتی۔ شیخ خوب جانتے تھے کہ ان کے زمانے کے مسلمان افیون کی طرح تصوف کے عادی ہو چکے ہیں، جس نے انہیں اتنا سفلیں اور جوش و جذبہ اور زندگی سے محروم کر دیا ہے، چنانچہ انہوں نے مسلکِ تصوف کی ان تمام کج رویوں کے خلاف جدوجہد کی جو اسلام کے بنیادی عقیدہ توحید سے متصادم تھیں۔ اولیاء پرستی، تصورِ شیخ، قبر پرستی اور بدعات و منکرات کے خلاف زبردست جنگ لڑی۔ اس زمانے میں سنّتِ رسولؐ کے صریح خلاف قبروں پر مسجدیں اور مقبرے تعمیر کرنے کا رواج عام تھا، شیخ نے اس کی بالخصوص مذمت کی۔ انہیں قبروں کی زیارت پر کوئی اعتراض نہ تھا، شریعت نے اس کی اجازت دی ہے، اس سے انسان کو اپنی موت اور آخرت یاد آتی ہے، تاہم وہ بزرگوں

کی پرستش اور اہلِ قبور سے استعانت اور انہیں اللہ کے حضور اپنا شفیع و کارساز قرار دینے کے سخت مخالف تھے۔

مختلف گوشوں سے شیخ کی شدید مخالفت ہوئی۔ یہ ایک فطری امر تھا۔ اُن کے دشمنوں نے عامۃ المسلمین کو یقین دلایا کہ شیخ ایک نئے مذہب کی تعلیم دیتے ہیں جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ انہوں نے شیخ پر گوناگوں الزامات عائد کیے، وہ ایک نیا فرقہ بنا رہے ہیں، جو لوگ ان کی سیادت تسلیم نہیں کرتے انہیں کافر قرار دیتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ان الزامات میں رتی بھر بھی صداقت نہ تھی، لیکن شیخ کے دشمن اپنے عقیدت مندوں کو اس جھوٹ کے باور کرانے اور شیخ کی دعوتِ دینی پر لبیک کہنے والوں کو "وہابی" کا نفرت انگیز لقب دینے میں کامیاب ہو گئے۔

امیر عبدالعزیز کے انتقال پر اُس کا بیٹا جانشین ہوا۔ بدقسمتی سے وہ تدبر اور حکمتِ عملی دونوں سے عاری تھا۔ اُس نے شیخ کے متبعین کو ترکوں کی حکومت سے بھڑا دیا۔ وہ عقل و دانش سے کام لیتا تو مسلمانوں کے مابین اس غیر ضروری خون ریزی کو ٹال سکتا تھا، لیکن اُس کے پیروکار مکمل سیاسی اقتدار کے طلب گار تھے اس لیے انہوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس تصادم ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج بھی کسی ترک کے آگے "وہابی تحریک" کا ذکر کرنا اُس کی نفرت کو اُبھارنے کے لیے کافی ہے۔

اس مہلک غلطی کے نتیجے میں مصر کا البانوی حکمران محمد علی "وہابی تحریک" کا نام و نشان مٹا دینے کے ارادے سے عرب پر چڑھ دوڑا۔ ۱۸۱۴ء میں طائف کے قریب زبردست جنگ کے بعد وہابیوں کو شکستِ فاش ہوئی۔ پانچ ہزار سے زائد مارے گئے۔ طائف کے گلی کوچے لاشوں سے پٹ گئے۔ پھر ظلم و تشدد کا بازار گرم ہوا۔ تمام مشہور و معروف وہابی گروہ در گروہ گرفتار کر لیے گئے اور برسرِ عام ان کی گردن ماری گئی۔ ان کی لاشوں پر کتے چھوڑ دیے گئے، فاتحین جس شہر میں بھی پہنچے اُس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ کھجور کے باغات تباہ کر دیے،

مویشی مار ڈالے، مکانات کو آگ لگا دی، بوڑھی، بیمار عورتوں اور بچوں کو بڑی بے دردی سے ذبح کر دیا۔ برطانوی حکومت تحریک احیائے اسلام کو اُبھرتے اور طاقت پکڑتے دیکھ کر سخت مضطرب تھی۔ اُسے جب محمد علی اور اُس کے بیٹے ابراہیم کے "کارنامے" کی خبر ملی تو اُس کے ہاں گھی کے چراغ جلنے لگے۔ اُس نے ہندوستان سے کیپٹن جارج فارسٹر سیڈلیر کی قیادت میں ایک وفد مبارکباد دینے کے لیے بھیجا۔ ۱۹۰۰ء میں بدنام زمانہ مسیحی مشنری سیموئل زویمر نے لکھا:

"یہ وہابی تحریک رُسواکن انجام سے دوچار ہو گئی اور سیاست کے میدان میں محض ایک شکست ثابت ہوئی۔ اب عرب میں سعودیوں کی طاقت کو قصّۂ ماضی سمجھنا چاہیئے ......"

تاہم یہ یاس انگیز پیشین گوئیاں غلط ثابت ہوئیں۔ پچیس برس بھی نہ گزرے تھے کہ سلطان عبدالعزیز ابنِ سعود نے محض اپنی سعی و جہد کے بل پر جزیرہ نمائے عرب کا بیشتر علاقہ فتح کر لیا۔ ابتدا میں نہ صرف اس کے زیرِ سایہ بسنے والے عربوں کی، بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کی نگاہیں اُس پر مرکوز ہو گئیں۔ اُن کا خیال تھا کہ وہ احیائے اسلام کا پرچم لے کر اُٹھے گا، چنانچہ وہ بڑی بے چینی سے اُس روزِ سعید کا انتظار کرنے لگے، لیکن جب اُس نے ملوکیت کے قیام کا اعلان کیا تو اُن کی ساری اُمیدیں خاک میں مل گئیں۔ اب یہ صاف عیاں ہو گیا کہ شاہ سعود نے وہابی تحریک کے مذہبی جوش و خروش کو محض حصولِ اقتدار کی خاطر بطور حربہ استعمال کیا تھا۔ اس المیہ پر محمد اسد لکھتے ہیں:-

"ابنِ سعود زندگی بھر اسلام کا ذکر والہانہ انداز میں ایک مشن کی حیثیت سے کرتا رہا ہے، جو اُسے تفویض کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ آگے چل کر بھی، جب کہ ایک عرصہ پہلے یہ واضح ہو چکا تھا کہ اُس کے نزدیک شاہانہ اقتدار ایک نظریہ کی علمبرداری کے مقابلے میں زیادہ اہمیت رکھتا ہے، وہ اپنی غیر معمولی خطابت کے زور سے اکثر لوگوں کو ——— اور غالباً اپنے آپ کو بھی ——— یقین دلاتا کہ یہ نظریہ اب بھی

اُس کی زندگی کا نصب العین ہے (ص ۱۶۶)۔ ابنِ سعود سیدھا سادا، منکسر اور جفاکش ہے، مگر ساتھ ہی ساتھ نہ صرف خود انتہائی مسرف اور احمقانہ عیش پسندی کا خوگر ہے بلکہ اُس نے اپنے مصاحبین کو بھی کھُلی چھُٹی دے رکھی ہے۔ وہ بے حد متدیّن ہے اور تمام احکام شرعی ظاہری حد تک ٹھیک ٹھیک بجا لاتا ہے، لیکن ان کی رُوحانی ماہیت کی طرف شاذ و نادر ہی توجہ کرتا ہے۔ وہ پانچوں وقت کا نمازی ہے اور رات کا بڑا حصّہ ذکر و فکر اور نوافل میں گزارتا ہے، لیکن اُسے کبھی یہ خیال تک نہیں آتا کہ نماز بجائے خود مقصد نہیں ہے بلکہ مقصد تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔ وہ ہمیشہ بڑے عقیدت مندانہ انداز میں اسلامی طرزِ زندگی کی عظمت و شوکت کی باتیں کرتا ہے، لیکن اُس نے ایک ایسا منصفانہ ترقی یافتہ معاشرہ قائم کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں کیا جس میں یہ نظامِ حیات اپنا تہذیبی اظہار پا سکتا...... (ص ۱۷۷-۱۷۸)...... چونکہ افتادِ طبع کے اعتبار سے وہ مشاہدۂ نفس کا عادی نہیں اس لیے انتہائی نمایاں فروگزاشتوں کے باوصف تاویلات کرنے اور اپنے آپ کو اپنی راست بازی کا قائل کرنے کی زبردست صلاحیت رکھتا ہے۔ اُس کے درباری اور لاتعداد حاشیہ نشین جنہوں نے اُس کو گھیر رکھا ہے اور جو اُس کے عطیات پر پلتے ہیں، اس افسوسناک رجحان کی روک تھام کے لیے یقیناً کچھ نہیں کرتے...... (ص ۱۸۰)[1]

فی الواقع وہ شاہ ابن سعود ہی تھا جس نے ۱۹۳۲ء میں امریکہ کی ایک بہت بڑی کاروباری کمپنی کو تیل تلاش کرنے کی اجازت دے کر تحریک پر ضربِ کاری لگائی۔ اگر وہ اسلامی نظریات کے بارے میں صدقِ دل سے پُرجوش ہوتا تو اس بات کا بخوبی اندازہ کر لیتا کہ امریکی کمپنی کو مراعات

---

[1] The Road to Mecca, Muhammad Asad.

دینے سے انکار کرے کے نقصان دہ مغربی اثرات پر اپنی مملکت کے دروازے بند رکھ سکتا ہے یا کم از کم
ان اثرات کے نفوذ کی راہ میں کئی عشروں تک کے لیے مزاحم ہو سکتا ہے۔ یہ ایک المناک حقیقت ہے
کہ دولت کی حرص و آز نے اسلام کے اجتماعی نظام کے نفاذ کی جدوجہد کو مکمل طور پر غرقاب کر دیا۔

"وہابی دور کا سخت محتاط نظریۂ الواقع اُس روز ختم ہو گیا جب امریکیوں نے
تجارتی مقدار میں تیل دریافت کیا۔ ۱۹۱۲ء سے تقریباً تیس برس تک کی پوری زندگی اور
اُس کی سرگرمیاں صحیح معنی میں مذہبی قوانین کی پابند تھیں۔ نماز کے وقت تمام کاروبار بند
ہو جاتا۔ دارالحکومت کے دروازے آمدورفت کے لیے بند کر دیے جاتے اور پوری
مرد آبادی مسجد کی راہ لیتی۔ آج وہ سب تبدیل ہو چکا ہے۔ عرب کی معاشرتی زندگی پر
تیل کا دوہرا اثر ہوا ہے۔ اوّل اس سے حاصل ہونے والی دولت نے شہزادوں اور
ملک کے خوش حال شہریوں میں آرام اور مغربی خطوط پر ترقی کی خواہش پیدا کر دی
ہے۔ وہ غیر ملکوں کی سیاحت، غیر ملکی لباس اور ہر قسم کے تعیشات کے خوگر ہو
چکے ہیں۔ دوم تیل پڑوسی ممالک کے تارکین وطن کی اتنی بھاری تعداد کو اپنی جانب
کھینچ رہا ہے کہ قصباتی اور شہری آبادی کا کردار یکسر تبدیل ہو گیا ہے۔ ان لوگوں
میں سرکاری ملازم بھی ہیں اور روزی کی تلاش کرنے والے مزدور بھی۔ سوداگر بھی ہیں
اور سہل الحصول منفعتوں کی توقع رکھنے والے دکاندار اور تعمیری مواقع سے جھولیاں
بھرنے اور کارخانوں کو ترقی دینے والے صنعت کار بھی۔ سب سے بڑھ کر اساتذہ
اور فنی ماہرین ہیں جو نوخیز نسل کو مغربیت کے رنگ میں رنگنے کے لیے اپنے
قوی اثر و رسوخ سے کام لے رہے ہیں۔ یہ سب لوگ مغربی لباس پہنتے ہیں
اور زندگی کے طور اطوار میں مغربیوں سے کچھ بھی مختلف نہیں ہیں۔ وہ دن زیادہ
دور نہیں ہے جب مغربی رنگ میں رنگنے کا عمل سعودی عرب میں اسی طرح

عام ہو جائے گا جس طرح اس کے پڑوسی ملکوں میں ہو چکا ہے[1]۔"

اگرچہ وہابی تحریک خالص سیاسی معنی میں جزیرہ نمائے عرب تک محدود تھی تاہم روحانی
طور سے اس کے قوی اثرات عالم اسلام کو ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک اپنی رَو میں
بہا لے گئے۔ اس تحریک کی قابلِ تقلید مثال سے سنوسی تحریک، الاخوان المسلمون اور جماعتِ
اسلامی کو حرکت ملی۔ اسلام کی نشاۃ ثانیہ بلکہ اس کی بقا کا دارومدار محمد بن عبدالوہابؒ ایسے مجددین
کی روحانی اولاد ہی پر ہے۔

---

[1] "Riyadh Ancient and Modern", Harry St. John Bridger Philby, *The Middle East Journal*, Washington, D.C., Spring 1959.

سنوسی تحریک

سنوسی تحریک کی داستان دورِ حاضر کی اسلامی تاریخ کا نہایت اندوہناک المیہ ہے۔ المیہ اس لیے کہ یہ تحریک جن نظریات کی علمبردار تھی اگر وہ پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتے تو اس کا نتیجہ سارے عرب اور دوسرے مسلمان ملکوں میں روحانی نشاۃِ ثانیہ کی صورت میں نکلتا چونکہ لیبیا ۱۹۵۲ء میں اپنی سیاسی حاکمیت بحال کرنے میں کامیاب ہوگیا ہے، اس لیے عرب قوم پرست یورپی سامراج کے خلاف سنوسیوں کی جدوجہد کو اپنی امنگوں اور نظریات کا ہم آہنگ قرار دینے لگے ہیں۔ حالانکہ اس سے بڑھ کر غلط بیانی اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ سنوسیوں کا سارا جہاد اسلام کی خاطر تھا۔ لادینی قوم پرستانہ نعرے جو آج عالمِ عرب میں عام ہو چکے ہیں، ان لوگوں کے لیے بالکل مہمل اور لغو تھے۔

سنوسی جن اغراض و مقاصد پر ایمان رکھتے تھے اور جن کی خاطر انہوں نے جنگ کی، وہ قوم پرستوں کے اغراض و مقاصد کے بالکل برعکس تھے۔ قوم پرستوں نے انتہائی بددیانتی سے کام لیتے ہوئے سنوسی رہنماؤں کا نام اپنے اغراض و مقاصد کے ساتھ منتقی کر دیا۔ سنوسیوں کے دل میں جدید تہذیب سے نفرت و حقارت کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ آخر وقت تک اسلامی نظریات اور مادہ پرستانہ فلسفے کے درمیان مصالحت سے انکار کرتے رہے۔

ایک بار لیبیا کے موجودہ بادشاہ سید محمد الادریس سے پوچھا گیا کہ وہ خود اور ان کے پیروکار جدید

تہذیب و ثقافت کے مخالف کیوں ہیں تو انہوں نے جواب دیا:

" سنوسیوں کا مطمح نظر صرف تقویٰ اور شرافتِ نفس کا حصول ہے۔ یہ مقصد کس طرح پُورا ہو سکے گا ؟ خدا کے سوا تمام چیزوں کو ہم اپنے خیالات سے خارج کر دیں، میانہ روی اختیار کریں اور ان تمام لذتوں سے مجتنب رہیں جو تقربِ الٰہی کے حصول میں حارج ہوتی ہیں۔"

" پھر اطالوی سنوسیوں کے خلاف اقدامات کیوں کرتے ہیں ؟"

" اس لیے کہ جو شخص ہماری تعلیم کو اپناتا ہے وہ جسمانی اور روحانی لحاظ سے صحت مند ہو جاتا ہے۔ اطالوی فاشسٹ عالمِ اسلام کے بہت سے دوسرے حکمرانوں کی طرح ، ہماری پُوری آبادی کو بگاڑنے کے درپے ہیں۔ اطالوی تہذیب اسی صورت میں زیادہ تیز رفتاری سے پیش قدمی کر سکتی ہے ، لیکن جب تک ہماری تعلیم دلوں پر حکمران ہے ایسا نہیں ہوگا۔"

" کیوں نہ ہوگا ؟"

" ہماری تعلیم بالکل سادہ ہے۔ ضروری ہے کہ جسم کو صحت مند اور پرہیزگار زندگی سے تقویت دی جائے تاکہ وہ روح کے لیے شایانِ شان اور عمدہ مسکن بن سکے۔ آپ کوئی نشہ آور شے حتیٰ کہ تمباکو تک استعمال نہیں کر سکتے۔ لازم ہے کہ خدا کے سوا آپ کسی کے غلام نہ ہوں۔ گویا حالات آپ کے تصرّف میں ہونے چاہئیں۔ اطالوی جس تہذیب کو سیرینیکا میں رائج کرنا چاہتے ہیں وہ ہمیں حالات کا غلام بنا دیتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ ہم اس کے خلاف جنگ کریں۔"

" یہ تہذیب ہمیں حالات کا غلام کیونکر بناتی ہے ؟"

" وہ مادی صنعتی ترقی ہی کو سب کچھ گردانتی ہے۔ خارجی شان و شوکت اور قوت و اقتدار کسی شخص یا قوم کی قوتِ فیصلہ میں فیصلہ کن عنصر بن جاتا ہے یعنی صرف

اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جہاں سنوسی حکمران ہیں وہاں امن امان اور اطمینان و آسودہ فطری کا دَور دَورہ ہے۔[1] ......"

سیّد محمد ادریس کے جدِّ امجد سیّد محمد ابنِ علی السنوسی الجزائر میں مستغانم کے قریب ۱۷۸۷ء میں پیدا ہوئے۔ اسی سال وہابی تحریک کے مؤسس نے عرب میں وفات پائی۔ سیّد محمد ابھی دو برس کے بھی نہ تھے کہ ان کے والد انتقال کر گئے۔ وہ ایک علمی اور خدا پرست خاندان میں پروان چڑھے۔ ان کی پہلی معلمہ اُن کی پھوپھی سیّدہ فاطمہ تھیں۔ سیّدہ فاطمہ نہایت ذکی و فہیم اور تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ ان کے زیرِ ہدایت کم سِن سنوسی نے قرآن کریم بہت چھوٹی عمر ہی میں حفظ کر لیا۔ پھر دینیات اور فقہ کی تعلیم اپنے علاقے کے بہترین اساتذہ سے حاصل کی۔ جوان ہوتے تو مراکش چلے گئے۔ وہاں پہلے ضروری استعداد بہم پہنچائی اور پھر مشہور یونیورسٹی جامعہ قیروین میں داخل ہو گئے، جہاں نامی گرامی اساتذہ سے قرآن، حدیث، فقہ اور عربی زبان کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ جلد ہی ان کے علم و فضل نے سُلطانِ مراکش مولائی سلیمان کی نگاہِ توجہ ان کی جانب منعطف کرا دی۔ سلطان نے انہیں اپنے درباریوں میں شامل کرنا چاہا، لیکن سیّد السنوسی نے جو کسی دنیوی اقتدار کے آگے جُھکنے کے تصوّر ہی سے نفرت کرتے تھے، اس پیش کش کو رد کر دیا۔ لہٰذا انہوں نے مراکش کو خیرباد کہا اور جہاں گشت علماء کی صف میں شامل ہو گئے۔ پہلے تونس گئے، پھر لیبیا اور مصر۔ اس سفر کے دوران میں انہوں نے ہر جگہ اپنی علمی تشنگی بجھائی، مگر اُن کی پیاس تھی کہ روز بروز فزوں تر ہوتی جاتی تھی۔ جہاں کہیں جاتے طالبانِ علم جُوق در جُوق ان کے گرد جمع ہو جاتے۔ ان کے زبردست علم و فضل کا شہرہ دیس دیس پھیل چکا تھا اور ان کا شمار ممتاز ترین علماء میں ہونے لگا تھا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ مصر میں طویل

---

[1] *Sanusiya:*

The Study of a Revivalist Movement in Islam, Nicola A. Ziadeh, E. J. Brill, Leiden. pp. 132-3.

مدّت تک رہیں گے اور قاہرہ کی جامعہ الازہر میں اپنی تعلیم جاری رکھیں گے، لیکن ان کے سب ارادے خاک میں مل گئے۔ علمائے ازہر نے ان کا استقبال معاندانہ جذبات سے کیا۔ انہیں اس نئی طاقت ور شخصیت کے ہاتھوں اپنا وقار اور اثر و رسوخ خطرے میں نظر آیا۔ وہ مخالفت میں اس حد تک بڑھ گئے کہ ان کے گمراہ ہونے کا فتویٰ دے دیا۔ السنوسی کو علماء کے اس مکارانہ طرزِ عمل نے ان سے متنفر کر دیا۔ یہ مکار لوگ اپنے آپ کو راسخ الاعتقادی اور ورع و تقویٰ کا پیکر ظاہر کرتے تھے اور حال یہ تھا کہ بدعنوان اور عیاش حکمران طبقے کے ہاتھ میں محض کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ سیّد السنوسی کو محمد علی سے خاص طور پر ازحد نفرت تھی۔ وہ اس کی غیر اسلامی سرگرمیوں کی علانیہ مذمت کرتے تھے۔ آخر قاہرہ کے احوال سے متنفر ہو کر مکہ معظمہ چلے گئے۔ یہاں انہیں وہ چیز مل گئی جس کی جستجو تھی۔ موسمِ حج میں ان کی ملاقات مراکش کے سیّد احمد ابن ادریس الفاسی سے ہوئی۔ سیّد احمد شہرۂ آفاق رُوحانی پیشوا تھے۔ وہ تصوف کے سلسلہ خضریہ کے شیخ تھے۔ سیّد السنوسی نے بلاتوقف ان کی بیعت کر لی اور انتہائی مخلص و صادق مُرید بن گئے۔ یہاں بھی علماء اُن کی زبردست شخصیت کو برداشت نہ کر سکے، چنانچہ پیر و مرید دونوں مکہ چھوڑ کر یمن چلے گئے۔ چند سال بعد جب شیخ احمد ابن ادریس الفاسی کا انتقال ہو گیا تو سیّد السنوسی مکہ واپس آ گئے۔ ۱۸۳۷ء میں انہوں نے پہلا زاویہ قائم کیا۔ یہ گویا اس تحریک کا آغاز تھا جو بعد ازاں سنوسی تحریک کے نام سے مشہور ہوئی۔

سنوسی تحریک کا مقصد خالص کتاب و سُنّت کی اساس پر عالمِ اسلام کا مکمل دینی احیاء تھا۔ اپنے اِس کام میں السنوسی زیادہ تر امام احمد ابنِ حنبلؒ، امام غزالیؒ اور امام ابنِ تیمیہؒ کی تعلیمات سے متاثر تھے۔ اغلباً عرب کے مجدّد محمد بن عبدالوہابؒ کی قائم کردہ نظیر بھی اُن کے سامنے تھی، اگرچہ دونوں مجدّد یکساں مقاصد، امنگیں اور نظریات رکھتے تھے تاہم تصوف کے بارے میں سنوسی تحریک کا رویہ وہابی تحریک سے بالکل مختلف اور زیادہ ہمدردانہ تھا، البتہ وہ تصوف کی مناسب حد تک حوصلہ افزائی کے باوجود بعض سلسلہ ہائے تصوف کے برعکس سماع اور وجد وغیرہ کو کسی بھی دُوسرے خلافِ شریعت عمل کی طرح سخت ممنوع قرار دیتے تھے۔

السنوسی جہاں بھی گئے اُن کا پُرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ آخر دُور دراز ممالک کی سیاحت کے بعد انہوں نے سیرینیکا کو اپنی دعوت کا میدان بنانے کا فیصلہ کیا، تاہم جو زاویے عرب اور شمالی افریقہ کے دوسرے حصّوں میں قائم کر چکے تھے انہیں کبھی فراموش نہ کیا۔ جب اُن کے وطن الجزائر پر فرانسیسی قابض ہو گئے اور تونس بھی اسی حشر سے دوچار ہوتا نظر آیا، نیز دیکھا کہ عثمانی حکام تحریک کی کامیابی سے خار کھانے لگے ہیں تو السنوسی نے اپنی دعوت کا مرکز صحرا میں کسی ایسے انتہائی دُور افتادہ علاقے میں منتقل کرنے کا فیصلہ کر لیا، جہاں وہ الگ تھلگ رہ کر اپنی دعوت کو بے روک ٹوک جاری رکھ سکیں، چنانچہ ۱۸۵۲ء میں انہوں نے ایک اُجاڑ سے نخلستان جغبوب کو اس مقصد کے لیے منتخب کر لیا۔ ایک بڑا زاویہ تعمیر کرنے کے لیے عمارتی ساز و سامان قافلے کے ذریعے بھیجا۔ اپنے مضبوط کردار کی بدولت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان ——— اپنے گرد و پیش کے لوگوں میں امن و امان قائم کرو ——— سے تحریک پا کر وہ مقامی قبائل کی دیرینہ عداوتوں کو مٹانے اور بالآخر علاقے بھر کے خانہ بدوش قبائل کو مسلکِ اتحاد میں منسلک کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جوں ہی اس علاقے میں امن و امان قائم ہوا، جو زمانہ دراز سے عنقا تھا، انہوں نے اپنی توجہ افریقہ کے دُور افتادہ گرم سیر خطّوں میں اسلامی دعوت پھیلانے پر مرکوز کر دی۔ انہیں سب سے نمایاں کامیابی اُس وقت ہوئی جب قبیلہ زویا نے استدعا کی کہ السنوسی ان کے ہاں تشریف لائیں، کفرہ میں زاویہ قائم کریں اور رہیں۔ قبیلۂ زویہ اپنی خون آشامی کی بدولت سارے صحرا میں ایک عذاب بنا ہوا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا قبیلہ تھا جو سیرینیکا اور جھیل شاد کے بیس ہزار مربع میل سے زائد رقبے میں پھیلے ہوئے نخلستانوں میں بود و باش رکھتا تھا۔ ان لوگوں نے عہد کیا کہ وہ چوری چکاری اور قتل و غارت کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیں گے۔ السنوسی نے اپنے معتمد مرید کفرہ بھیج دیئے۔ ہزاروں قبائلی جو نسلوں سے محض برائے نام مسلمان چلے آتے تھے، دیکھتے ہی دیکھتے اُن کی کایا پلٹ ہو گئی۔ ایک زبردست رُوحانی انقلاب نے اُن کی زندگیوں کا رُخ بدل دیا۔ ساتھ

بھی ساتھ منطقہ حارہ افریقہ کے بیشمار لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

۱۸۵۹ء میں السنوسی کا انتقال ہو گیا۔ اُن کے سب سے بڑے صاحبزادے سید المہدی
جانشین ہوئے۔ سید المہدی اُس وقت صرف سولہ برس کے نوجوان تھے۔ وہ ۱۸۴۴ء
میں پیدا ہوئے۔ جغبوب میں تعلیم حاصل کی۔ پدر بزرگوار کی وفات سے تقریباً ایک سال
پہلے کفرہ پہنچے جو اب تحریک کا مرکز بن چکا تھا۔ ابھی بارہ برس کے بھی نہ تھے کہ وہ اپنے والد
کی دعوتی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ قاصد بھیجتے۔ وفود کا استقبال کرتے اور طلبہ کو تعلیم دیتے،
حالانکہ وہ اس وقت خود فاضل اور متقی اساتذہ سے تعلیم پا رہے تھے۔ اُس زمانے میں مسلمانوں
کی حالت سخت مایوس کن تھی۔ یورپی استعمار زبردست خطرہ بن چکا تھا؛ چنانچہ سید المہدی
ان کی اُمید بھری نگاہوں کا مرکز بن گئے۔ یہ خیال عام تھا کہ وہی عدل و انصاف اور امن و
راستی کا دور پلٹ کر لائیں گے۔ سید المہدی نے بار بار اور بڑے زور کے ساتھ اپنے "مہدی"
ہونے سے انکار کیا۔ اپنے والد کی طرح انہیں بھی دعووں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ انہیں
صرف اسلامی دعوت کے لیے مسلسل جدوجہد اور بار آور کام سے دلچسپی تھی۔

سید المہدی کی قیادت میں سنوسی تحریک کی قوت اور اثر و نفوذ اپنے عروج پر
پہنچ گیا۔ سنوسی تعلیمات کا اہم ترین مطالبہ یہ تھا کہ اُس کے متبعین دیرپا اور ٹھوس کام کریں۔
سنوسی الکبیر خود اکثر کہا کرتے تھے کہ درختوں اور ان کے پتوں میں بیش بہا دولت پنہاں ہے۔
اس فلسفے کی بدولت انتہائی بنجر اور ویران زمینیں وسیع پیمانے پر سرسبز باغات میں تبدیل ہو
گئیں۔ کاروبار اور تجارت ترقی کرنے لگی۔ گداگری اور کاہلانہ زندگی ناقابلِ برداشت بن گئی۔

"سنوسیہ: ایک تحریک احیائے اسلام کا مطالعہ" کا مصنف ایک مثالی سنوسی زاویے
کی کیفیت حسب ذیل الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"جغبوب صحیح معنوں میں محض ایک قصبہ نہیں مذہبی اور تعلیمی مرکز ہے
——— کسی چھوٹے سے یونیورسٹی شہر میں جس امن سکون کا تصور کیا جاسکتا

ہے وہ یہاں پایا جاتا ہے۔ صرف کالج کے اساتذہ عمامہ باندھتے ہیں۔ سفید ریشش
سیشیخ سبز یا دیسی نیلے رنگ کے جاموں پر لمبی ڈھیلی ڈھالی عبائیں پہنتے ہیں ———
یہ ایک نہایت وسیع عمارت ہے۔ جس کی ضخیم اور بے دریچہ دیواریں صحن خانوں،
غلام گردشوں، مدارس اور طلبہ کی اقامت گاہوں، سنوسی خاندان کے بڑے
بڑے مکانات اور مسجد کے گرد پھیلی ہوئی ہیں۔ جغبوب ایک ڈھلوان چٹان پر
واقع ہے۔ بے شمار سیڑھیاں نیچے کھجور کے درختوں اور ایک بڑے سے کنویں تک
جاتی ہیں۔ یہ واحد کنواں ہے جو پوری بستی کو پانی مہیا کرتا ہے۔ سید المہدی کفرہ
منتقل ہوئے تو انہوں نے اپنے پچاس غلاموں کو آزاد کر دیا اور جن باغات کو یہ
غلام کبھی اپنے آقاؤں کے لیے تیار کیا کرتے تھے، انہیں ہبہ کر دیئے؛ چنانچہ اب
وادی کے ان نخلستانوں میں یہی آزاد کردہ غلام رہتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے باغات میں
بڑی عرق ریزی سے کام کرتے ہیں۔ باغات کو سینچنے کے لیے مصنوعی نالوں اور
تالابوں کا نہایت عمدہ نظام ہے۔ ان نالوں اور تالابوں میں پانی ایک چشمے سے
آتا ہے جو زاویہ کے نیچے واقع ہے۔ یہ لوگ کھجوریں بیچتے ہیں۔ اس آمدنی پر خود بھی
گزر بسر کرتے ہیں اور طلبہ کے لیے خوراک بھی فراہم کرتے ہیں۔ جغبوب ایک
یونیورسٹی ہے۔ پاک صاف اور سادہ۔ ساری جماعت کی زندگی اس کے گرد مرتکز
ہے۔ اس کی لائبریری میں ۸ ہزار کتابیں ہیں اور صفِ اوّل کے علماء اور فضلاء
کی ایک بڑی تعداد ہے جن کی موجودگی طلبہ کے لیے تحریک کا باعث ہوتی ہے۔
المہدی کے دور میں ان طلبہ کی تعداد تین سو تھی۔ مجوزہ نصابِ تعلیم میں قرآن کی تعلیم،
تفاسیر کا گہرا مطالعہ، حدیث، فقہ، صرف و نحو، ادب، تاریخ اور منطق شامل ہے۔
تربیت کا پورا پورا اہتمام کیا جاتا ہے۔ طلبہ میں حصولِ علم کی خواہش بے پایاں اور
خلوص سے معمور ہے۔ طلبہ کو صنعت و حرفت بھی سکھائی جاتی ہے۔ کوئی طالب علم

اس سے مستثنیٰ نہیں۔ ان حرفتوں میں نجاری، لہاری، معماری، کتابی، پارچہ بافی،
جلد سازی اور چٹائی بنانا شامل ہیں۔ اس مقصد کے لیے ہر ہفتے جمعرات کا دن
وقف ہے۔ سید المہدی بالعموم خود طلبہ کے ساتھ کام کرتے ہیں، یہ عملی مثال اُن
کے لیے ولولہ انگیز ثابت ہوتی ہے۔ جمعہ کا دن فوجی تربیت اور جنگی مشقوں
کے لیے وقف ہے۔ طلبہ گھڑ سواری اور شتر سواری سیکھتے ہیں۔ ان مشقوں کی
نگرانی اکثر خود المہدی کرتے ہیں ——— یونیورسٹی کے ہوسٹل میں طلبہ کے
قیام وطعام کا مفت انتظام ہے۔ سنوسی رہنما اپنے طلبہ میں خوب دلچسپی لیتے
ہیں۔ جغبوب یونیورسٹی میں طلبہ کو روزانہ ڈیڑھ روٹی ملتی ہے۔ ناشتے میں کھجوریں
اور دہی ملتا ہے۔ دوپہر اور رات کا کھانا شوربے کے ساتھ کھاتے ہیں۔ ہر طالب علم
کو سال میں دو کُرتے، دو ٹوپیاں اور عمامے، دو شلواریں، جوتوں کا ایک جوڑا اور
چھ ماہ میں ایک عبا ملتی ہے۔ متمول گھرانوں کے طالب علم غریب طلبہ کو اکثر تحفے
تحائف دیتے رہتے ہیں۔ تحریک کے مستقبل کے رہنما، زاویوں کے شیوخ،
پُرجوش مبلغین اور جنگجو سردار خود سنوسی الکبیر کی ذاتی نگرانی میں تربیت پاتے
ہیں۔ اس کام میں اُن کے ممتاز خلفاء بھی تعاون کرتے ہیں ——— زاویہ
دفاعی لحاظ سے خوب محفوظ ہے۔ تین ہزار آدمیوں کے اسلحہ کے علاوہ چار سو تفنگیں
اور دو سو تلواریں بھی ہیں۔ یہ اسلحہ بیس کمروں میں رکھا ہوا ہے۔ المہدی کے اپنے
پاس پچاس رائفلیں ہیں جن کی دیکھ بھال وہ خود کرتے ہیں۔ اسلحہ سازی کے فن میں
ماہر متعدد کاریگر جغبوب میں آباد ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سنوسی دار الحکومت میں بارود
تیار کرنے کا کارخانہ بھی ہے۔ مسجد کافی بڑی ہے جس میں بیک وقت پانچ چھ سو
آدمی جمع ہو سکتے ہیں، نہایت پُرسکون، سفید اور باشکوہ۔ فرش پر سیاہ
قالین بچھے ہیں یہ ساری مسجد میں واحد بیش قیمت چیز ہیں۔ بڑے بڑے مربع نما

سفید ستون قطار در قطار چھت کے بھاری بھرکم شہتیروں کو تھامے کھڑے ہیں۔
چھت بالکل سادہ ہے۔ منبر بھی نہایت سادہ اور نقش و نگار سے منزہ ہے۔
مسجد کی یہ سادگی اُس دین کے عین مطابق ہے جو عیش و عشرت کو ممنوع قرار دیتا
ہے۔ جغبوب میں پُرشوق ادب و احترام کے سوا زائر کو متاثر کرنے والی اور کوئی
شے نہیں ہے۔ اس طرح سنوسی زاویے متعدد فرائض انجام دیتے ہیں۔ وہ خدائی
رحمتوں کی بافیض ندی کی گزرگاہ ہونے کے علاوہ مدارس، تجارتی و معاشرتی مراکز،
قلعے، قانونی عدالتیں، بینک، گودام، محتاج خانے، عبادت گاہیں، مامن اور
قبرستان ہیں[1] ——"

اگرچہ سید المہدی اور اُن سے پہلے اُن کے پدرِ بزرگوار نے کبھی کوئی دعویٰ نہیں کیا؛
تاہم درحقیقت وہ ایک خود مختار ریاست کے فرماں روا تھے اور حکومت کے تمام کام انجام دیتے
تھے۔ اپنی طاقت کے زمانۂ عروج میں سید المہدی ایک زبردست سلطنت پر حکومت کرتے تھے۔
جو موجودہ لیبیا، صحرائے مغربی مصر اور شمال مغربی سوڈان پر مشتمل تھی، جس کی سرحدیں منطقۂ حارۂ
افریقہ (tropical Africa) کے قلب تک پھیلتی چلی جاتی تھیں، جہاں لاکھوں نومسلم
اسلام کے سایۂ رحمت میں داخل ہو رہے تھے۔ اپنی پیشرو وہابی تحریک کی طرح سنوسی
تحریک کے پیروؤں کی بھاری تعداد عرب کے بدوؤں کی تھی۔ سنوسی جب کبھی حج کرنے جاتے اس
موقعے سے پورا فائدہ اُٹھاتے۔ دنیا کے ہر حصے سے آنے والے زائرین بیت اللہ تک تحریک
احیائے اسلام کی دعوت پہنچاتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سنوسی تحریک ملایا، انڈونیشیا اور فلپائن ایسے دُور
افتادہ ممالک میں بھی معروف ہو گئی۔

۱۹۰۲ء میں مصیبت ٹوٹ پڑی۔ فرانس نے محسوس کیا کہ سنوسی تحریک کے بڑھتے ہوئے

---

[1] حوالہ سابق ص ۱۰۴ - ۱۰۶

اثرات اُس کے استعماری مفادات کے لیے خطرہ بنتے جا رہے ہیں۔ اس نے وسطی افریقہ میں تحریک
کو ختم کر دینے کے لیے وسیع پیمانے پر فوجی کاروائی شروع کر دی۔ اسی سال سید المہدی وفات پا
گئے۔ سید المہدی کے صاحبزادے سید محمد الادریس اُس وقت صرف ۱۲ سال کے تھے اور نہایت
کٹھن نئی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے، چنانچہ تحریک کی زمامِ قیادت
ان کے عم زاد بھائی سید احمد الشریف نے اپنے ہاتھ میں لے لی۔ سید احمد الشریف ۱۸۷۳ء
میں جنبوب میں پیدا ہوئے۔ تعلیم اپنے چچا کی ذاتی سرپرستی میں حاصل کی۔ نئے قائد کے سامنے
پہلا فوری مسئلہ مغربی سامراج کے ساتھ زندگی اور موت کی کشمکش کا تھا۔ انتہائی جان توڑ جدوجہد
کے بعد سنوسیوں کو ۱۹۰۹ء میں شکست ہو گئی۔ فرانس افرادی طاقت، غیر محدود ذرائع، جدید ترین
ہتھیاروں اور سامانِ جنگ میں کہیں زیادہ طاقتور تھا، چنانچہ پورا وسطی افریقہ کا سیاسی اقتدار
سنوسیوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ستمبر ۱۹۱۱ء میں سب سے بدتر مصیبت نے آلیا۔ اٹلی نے ترکی
کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا اور طرابلس اور بنغازی پر قبضہ کرنے کے لیے اپنی افواج بھیج دیں۔
ترکی کا وزیر جنگ انور پاشا فوج لے کر میدانِ جنگ کی طرف تیزی سے بڑھا۔ سید احمد الشریف
بھی اپنے جنگجو قبائلیوں کو لے کر اس کے ساتھ آ ملے۔ اپنی ان تھک قوتِ عمل اور جوش و خروش
کے ذریعے انور پاشا نے سنوسی قبائل کو مذہب کی خاطر آخر دم تک لڑنے پر آمادہ کر لیا جو دونوں
کا مشترکہ مقصد تھا۔ عرب اور ترک رہنماؤں کے درمیان اس مؤثر تعاون کا فوری نتیجہ یہ نکلا کہ وہ
اطالویوں کی جارحانہ یلغار روکنے میں کامیاب ہو گئے۔ پھر اچانک، کسی پیشگی انتباہ کے بغیر،
۱۹۱۲ء میں بلقان کی تمام نو آزاد ریاستوں نے یکجہت ہو کر بیک وقت ترکی پر حملہ بول دیا۔
اب ترکی کا ملامٹ جانے کے خطرہ سے دوچار تھا۔ دشمن اُس کے دروازے پر پہنچ چکا تھا۔
اٹلی سے صلح کرنے، لیبیا کو آزاد کر دینے اور اپنی افواج جلد سے جلد ترکی پہنچانے کے سوا اور
کوئی چارۂ کار نہ تھا، چنانچہ سنوسی جہاد جاری رکھنے کے لیے تنہا رہ گئے۔
۱۹۱۷ء میں سید احمد الشریف نے سید محمد الادریس کو تحریک کی قیادت سونپی اور خود ترک

حکومت سے مؤثر امداد لینے کے لیے ایک آبدوز کے ذریعے استنبول پہنچے، لیکن وہاں انہیں
سوائے ناکامی اور مایوسی کے اور کچھ نہ ملا۔ ترک حکومت خوفزدہ تھی کہ کہیں سید احمد الشریف خود
عالمِ اسلام کا خلیفہ بن جانے کا اعلان نہ کر دیں۔ اس طرح ایک عرب خانوادہ عثمانی خلافت کا جانشین
بن جائے گا۔ سید الشریف اگرچہ ایسے کوئی عزائم نہ رکھتے تھے، تاہم سیاسی ریشہ دوانیوں نے
ان کی واپسی کا راستہ مسدود کر دیا۔ مہینے پر مہینے گزرتے چلے گئے۔ سید احمد کو جانے کی اجازت
نہ ملی۔ ۱۹۲۰ء میں عثمانیوں کی شکست سے واپسی کی رہی سہی توقعات بھی جاتی رہیں، لیکن
سید احمد نے مایوسی کے آگے سپر انداز ہونے سے انکار کر دیا۔ وہ اناطولیہ کے میدان طے کرتے
ہوئے مصطفےٰ کمال اتاترک سے جا ملے اور ترکی کو بربادی سے بچانے کی جدوجہد میں شریک
ہو گئے۔

محمد اسد لکھتے ہیں:-

"یہ بات نہیں بھولنی چاہیئے کہ ابتدا میں وہ دینی جوش و جذبہ ہی تھا جس نے
ان بھیانک دنوں میں ترک قوم کو یونانیوں کی بے پناہ طاقت کے خلاف، جن کی پُشت
پر اتحادیوں کے بے پناہ وسائل تھے، لڑنے کی قوت بخشی۔ سید احمد نے ترکوں کی قومی
جدوجہد میں اپنے زبردست روحانی و اخلاقی اثر کو لگا دیا۔ اناطولیہ کے شہروں
اور قصبات کا اُن تھک دورہ کیا۔ لوگوں کو "غازی مصطفےٰ کمال" کا ساتھ دینے پر
آمادہ کیا۔ سنوسی الکبیر کی مساعی اور ان کے نام کی عظمت نے اناطولیہ کے سیدھے سادھے
کسانوں میں کمالی تحریک کو کامیابی سے ہمکنار کرنے میں بے پایاں کام کیا۔ ان لوگوں
کے نزدیک قوم پرستانہ نعرے بے معنی تھے اور وہ پُشت ہا پُشت سے اسلام
کی خاطر اپنی جانیں قربان کر دینے کو عظیم سعادت سمجھتے تھے، لیکن جُوں ہی غازی
کو فتح نصیب ہوئی اس کے حقیقی عزائم آشکارا ہو گئے جو ترک عوام کی توقعات سے
یکسر مختلف تھے۔ اتاترک نے اپنے معاشرتی انقلاب کی اساس تجدید شدہ اسلام

پر رکھنے کے بجائے دین کی روحانی طاقت سے قطع تعلق کر لیا (حالانکہ یہی وہ طاقت
تھی جس کی بدولت وہ فتح یاب ہوا) اور اسلامی اقدار کو اپنی اصلاحات کی بنیاد بنانا
قبول نہ کیا ـــــــــــ اتاترک کی اسلام دشمن اصلاحات سے سخت مایوس
ہو کر سید احمد ۱۹۲۳ء میں دمشق چلے گئے، جہاں اتاترک کی داخلی پالیسیوں
کا مخالف ہونے کے باوجود، انہوں نے شام کو ترکی کے ساتھ دوبارہ متحد ہو جانے
پر آمادہ کرنے اور اتحادِ اسلامی کی خدمت بجا لانے کی کوشش کی۔ فرانس کی انتدابی
حکومت فطرۃً سید احمد کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھنے لگی۔ ۱۹۲۴ء کے اواخر میں
جب ان کے دوستوں کو خبر ملی کہ فرانسیسی حکومت انہیں عنقریب گرفتار کیا چاہتی
ہے تو وہ موٹر گاڑی میں بیٹھ کر صحرا کے راستے عرب میں داخل ہو گئے اور مکہ معظمہ پہنچ گئے
جہاں ابنِ سعود نے ان کا پر تپاک خیر مقدم کیا۔"[1]

اس اثناء میں سیرینیکا میں سنوسی سید محمد الادریس اور عمر المختار کی قیادت میں مسولینی کی
فاشستی آمریت کی وحشی اور ظالم فوجی طاقت کے خلاف زندہ رہنے کی جان توڑ جدو جہد کر
رہے تھے۔

"سیرینیکا عمر المختار ستر سال سے کچھ اوپر تھے، لیکن یہ ضعیف العمری بھی
انہیں آخر دم تک لڑنے سے باز نہ رکھ سکی۔ وہ دس سال کے طویل اور بھیانک عرصے
تک نہایت مایوس کن حالات میں اپنے سے دس گنا فوج کے خلاف، جو جدید ترین
ہتھیاروں اور توپ خانے سے لیس تھی، سنوسی مزاحمت کی روحِ رواں بنے رہے۔
عمر اور ان کے نیم فاقہ زدہ مجاہدین کے پاس رائفلوں اور چند گھوڑوں کے سوا کچھ نہ
تھا۔ اس سر و سامان کے ساتھ وہ ایک ایسے ملک میں سر توڑ گوریلا جنگ لڑ رہے

[1] *The Road to Mecca*, pp. 319-320.

تھے جو عملاً ایک وسیع قید خانے کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ دیکھ بھال
کرنے والا جنگی طیارہ لاسلکی کے ذریعے اپنی قریب ترین فوجی چوکی کو قبائلی
لشکر گاہ کی خبر دیتا۔ اطالوی فوج کے آنے تک وہ خود مشین گنوں کے ذریعے لوگوں
کو منتشر ہونے سے روکے رکھتا۔ اتنے میں چند بکتر بند گاڑیاں پہنچ جاتیں جو اپنی
زد میں آنے والے مردوں، عورتوں اور بچوں کو بلا امتیاز قتل کرتی ہوئی سیدھی
خیموں میں گھس جاتیں۔ بچے کھچے لوگوں اور مویشیوں کو ایک جگہ جمع کیا جاتا اور
ہانک کر شمال میں خاردار تاروں سے گھرے ہوئے وسیع و عریض احاطوں،
اجتماعی کیمپوں میں پہنچا دیا جاتا، جو اطالویوں نے ساحل کے قریب قائم کر رکھے
تھے۔ ۱۹۳۰ء کے اواخر تک تقریباً ۸۰ ہزار بدوی اور لاکھوں مویشی ہانک کر
ایک ایسے علاقے میں جمع کیے جا چکے تھے، جہاں اس سے نصف تعداد کے لیے
بھی کھانے پینے کا سامان نہ تھا۔ اس اثناء میں بھوک اور بیماری اندرونِ ملک
میں بدوی آبادی کے بڑے حصے کو ہلاک کر رہی تھی۔"[1]

خود محمد اسد کو جن المناک واقعات کا تجربہ ہوا ان کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"طلوعِ فجر سے پہلے ہم (اطالوی مقبوضہ علاقے کے عین قلب میں) عمر المختار
کے اپنے گوریلا دستے کے پڑاؤ پر پہنچے، جو اس وقت صرف دو سو سے کچھ اوپر
مجاہدین پر مشتمل تھا۔ وہ ایک عمیق تنگ گھاٹی میں پناہ گزین تھا۔ معلق چٹانوں کے
نیچے متعدد مقامات پر چھوٹے چھوٹے الاؤ روشن تھے۔ کچھ لوگ زمین پر پڑے
سو رہے تھے۔ باقی صبح کاذب کے دھندلے سایوں میں کیمپ کے مختلف کاموں
ہتھیار صاف کرنے، پانی لانے، کھانا پکانے اور درختوں کے ساتھ اِدھر اُدھر

[1] حوالہ سابق صفحہ ۳۲۰-۳۲۳۔

بندھے ہوتے چند گھوڑوں کی خبر گیری کرنے میں مصروف تھے۔ تقریباً سب کے سب چیتھڑوں میں ملبوس نظر آتے تھے۔ مجھے نہ تو اس وقت نہ بعد ازاں کوئی ایک شخص بھی صحیح سالم عبا یا چغہ پہنے دکھائی دیا۔ بہت سے لوگوں نے پٹیاں باندھی ہوئی تھیں۔ یہ گویا دشمن کے ساتھ تازہ لڑائیوں کی داستان بیان کر رہی تھیں۔ خلافِ توقع مجھے کیمپ میں دو عورتیں بھی نظر آئیں۔ ایک خاتون بوڑھی تھی اور دوسری نوجوان تھی۔ وہ ایک الاؤ کے پاس بیٹھی تھیں اور ایک پھٹی پُرانی زین کی مرمّت کرنے میں منہمک تھیں۔ ہم جہاں کہیں جاتے ہیں یہ ہماری دو بہنیں ہمارے ساتھ ہوتی ہیں۔ سیّدی عمر نے میرے خاموش تعجب کے جواب میں کہا۔ ہم نے اپنی عورتوں اور بچّوں کو مصر بھیج دیا ہے، مگر انہوں نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ یہ دونوں ماں بیٹی ہیں۔ ان کے گھر کے سارے مرد شہید ہو چکے ہیں ——— سیّدی عمر نے بڑے افسردہ انداز میں ایک آدمی کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ "یہ شخص آپ کو اپنی کہانی سُنائے گا، یہ کل ہی میرے پاس پہنچا ہے۔"

"کفرہ سے آنے والا شخص میرے سامنے فرشِ خاک پر دو زانو ہو کر بیٹھ گیا اور پھٹی پُرانی عبا اپنے اردگرد لپیٹ لی۔ وہ دھیرے دھیرے بول رہا تھا۔ اُس کی آواز جذباتی ارتعاش سے یکسر خالی تھی، البتہ اُس کا دہشت زدہ چہرہ ان ہولناک مناظر کا آئینہ دار تھا جو اُس نے دیکھے تھے:

انہوں نے تین اطراف سے ہم پر اچانک ہلّہ بول دیا۔ ان کے ساتھ بہت سی بکتر بند گاڑیاں اور بھاری توپیں تھیں۔ ان کے طیّارے نیچی پرواز کر کے مکانوں، مسجدوں اور کھجوروں کے جھنڈوں پر بم باری کرنے لگے۔ ہم جنگ کے قابل صرف چند سو آدمی تھے۔ باقی سب عورتیں، بچّے اور بوڑھے تھے۔ ہم نے یک ایک گھر کے لیے

جنگ کی، لیکن وہ ہمارے مقابلے میں بہت زیادہ طاقت ور تھے۔ بکتر بند گاڑیوں کے مقابلے میں ہماری رائفلیں بیکار تھیں؛ چنانچہ آخرکار وہ غالب آگئے۔ ہم معدودے چند آدمی بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ میں کھجوروں کے باغات میں چُھپ گیا اور اطالوی مورچوں میں سے گزر کر نکل جانے کے موقع کا انتظار کرنے لگا۔ عورتوں کی چیخیں رات بھر سُنائی دیتی رہیں۔ وحشی اطالوی اور ان کے بھاڑے کے اریٹیری ٹٹّوان کی عصمت دری کر رہے تھے۔ اگلے روز ایک بوڑھی خاتون میری پناہ گاہ میں آئی اور روٹی اور پانی لا کر دیا۔ اُس نے بتایا کہ اطالوی جرنیل نے زندہ بچ جانے والے سب لوگوں کو سیّد محمد المہدی کے مقبرے کے سامنے جمع کیا۔ ان کی آنکھوں کے سامنے قرآن مجید کو پارہ پارہ کر کے زمین پر پھینک دیا۔ پھر اُس پر کھڑا ہو گیا اور چلّایا: "تمہارا بدّو پیغمبر اگر تمہاری مدد کو پہنچ سکتا ہے تو اُسے بُلاؤ۔" پھر حکم دیا کہ نخلستان کاٹ دیئے جائیں، تمام کنوئیں تباہ کر دیئے، سیّد احمد کے کُتب خانے کی تمام کتابیں نذرِ آتش کر دیں۔ اگلے روز اُس نے ہمارے بعض شیوخ اور علماء کو طیّاروں میں سوار کر کے بلندی سے گرا دینے کا حکم دیا؛ چنانچہ وہ سب زمین پر گر کر شہید ہو گئے ——— دوسری رات بھی بے بس خواتین کی چیخیں اور وحشیوں کے قہقہوں اور گالیوں کی آوازیں آتی رہیں۔ آخرکار میں رات کی تاریکی میں رینگ کر صحرا میں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہاں مجھے ایک آوارہ اُونٹ مل گیا جس پر سوار ہو کر یہاں پہنچا ہوں۔"[1]

۱۹۳۲ء کے اواخر میں سنوسی مزاحمت ختم ہو گئی اور اطالوی سارے لیبیا پر قابض ہو گئے۔ محمد اسد اس قصے کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

[1] حوالۂ سابق ص ۳۳۶ - ۳۳۹۔

"جب میں نے مدینہ طیبہ کے چھوٹے سے سنوسی زاویہ کی دہلیز پر قدم رکھا موت اور مایوسی کی مدھم آوازیں میرے ذہن میں گونج رہی تھیں۔ پھر سیرینیکا کی مہم کی یاد تیزی سے جاتی رہی اور صرف درد باقی رہ گیا ——— ایک بار پھر میں سنوسی الکبیر کی خدمت میں حاضر تھا۔ میری نگاہیں اس سن رسیدہ مجاہد کی خوبصورت پیشانی پر تھیں جس پر غم و محن کے نقوش ثبت تھے۔ میں نے ایک بار پھر ان کا ہاتھ چوما۔ وہ ہاتھ جس نے زمانۂ دراز تک تلوار تھامے رکھی تھی، اتنے عرصے تک کہ اب اُس کی طاقت جواب دے گئی تھی ———

"میرے بیٹے، اللہ تم پر برکت نازل کرے اور تمہاری راہ محفوظ کرے۔ ہماری پچھلی ملاقات کو سالِ بھر سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے۔ امسال ہماری مقررہ مدت ختم ہو گئی، لیکن ساری حمد و ثنا اللہ کے لیے ہے اس کی مشیت جو چاہتی ہے وہی ہوتا ہے ———"

سیّد احمد پر یہ سال بلا شبہ نہایت بھاری گزرا تھا۔ ان کے مُنہ کے گرد لکیریں اور گہری ہو چکی تھیں اور ان کی آواز پہلے سے زیادہ پست تھی۔ بڑھاپا انہیں پہلے سے کہیں کمزور ہو چکا تھا۔ وہ اپنے مصلّے پر گٹھڑی بنے بیٹھے تھے۔ انہوں نے سفید برنس خوب اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا۔ وہ چُپ چاپ ٹکٹکی باندھے دُور کہیں دیکھ رہے تھے۔

کاش ہم عمر المختار ہی کو بچا لیتے!" انہوں نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔"کاش ہم انہیں مصر میں پناہ لینے پر آمادہ کر سکتے!"

"سیدی عمر کو کوئی بھی نہ بچا سکتا تھا،" میں نے کہا۔" وہ خود بچنے کے خواہشمند نہ تھے، وہ شکست کی صورت میں موت کو ترجیح دیتے تھے۔ میں جب ان سے رُخصت ہو رہا تھا اُسی وقت مجھے اس کا علم تھا، یا سیّد احمد!"

سیّد احمد نے بطور اعتراف زور سے سر کو جُنبش دی۔" ہاں مجھے بھی علم تھا ——— میں بھی جانتا تھا۔ مجھے خبر تھی کہ وقت گزر چکا ہے ——— بعض اوقات خیال آتا ہے سترہ برس پہلے میں نے استنبول کی دعوت پر لبیک کہہ کر غلطی کی تھی ——— لیکن میں اور کر تا بھی تو کیا جبکہ خلیفۂ اسلام نے امداد کے لیے پُکارا تھا۔ اللہ کے سوا کون کہہ سکتا ہے کہ انسان جب اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتا ہے تو وہ حق پر ہوتا ہے یا احمق؟ بے شک کون کہہ سکتا ہے؟

سنوسی الکبیر کا سر درد کی شدت میں اِدھر اُدھر جھولنے لگا۔ اِن کی آنکھیں بھاری پپوٹوں کے پیچھے چھُپ گئیں۔ پھر جیسے فوری ایقان نے مجھے آلیا۔ میں جانتا تھا ان آنکھوں میں اُمید کا شعلہ اب کبھی روشن ہونے نہ پائے گا[1] ———"

---

[1] حوالۂ سابق ص ۲۲۲-۲۲۳۔ سیّد احمد الشریف اگلے سال (۱۹۳۳ء) مدینہ طیبہ میں فوت ہو گئے۔

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ

۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغل سلطنت بڑی سرعت کے ساتھ زوال پذیر ہو گئی۔ نتیجہ ہندو مرہٹوں، سکھوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے بھیس میں انگریزوں کے عروج کی صورت میں نکلا۔ جب شاہ ولی اللہ رح ۱۷۰۳ء میں اورنگ زیب کی وفات سے چار سال پہلے پیدا ہوئے اس وقت تک قرآن و سنّت پر مبنی صحیح اسلام کی تعلیمات ملک میں وسیع پیمانے پر نہیں پھیلی تھیں۔ مغل دربار اور تصنیف و تالیف کی زبان فارسی تھی اور عام لوگ اُردو بولتے تھے۔ قرآن مجید کا ترجمہ تک نہ ہو پایا تھا؛ چنانچہ اکثر لوگ اسلامی تعلیمات سے ناواقف تھے! اٹھارہویں صدی کے ہندوستان میں اسلام کی بقا کو اس قدر شدید خطرہ درپیش تھا کہ دنیا کے دوسرے حصوں کے مسلمان فی الواقع یہ اندیشہ محسوس کرنے لگے کہ مغلوں کا سیاسی زوال لوگوں کے مکمل مذہبی انتشار پر منتج ہوگا، لیکن یہ منحوس پیشین گوئی نہ صرف یہ کہ پوری نہ ہوئی بلکہ آنے والے دور نے ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک تازہ روحانی جذبہ موجزن پایا۔ یہ انقلابِ احوال تن تنہا ایک شخص کی مساعی کا نتیجہ تھا اور وہ شاہ ولی اللہ رح تھے۔

شاہ ولی اللہ کے والد ماجد مقامی حد تک شہرت کے حامل ایک فاضل بزرگ تھے۔ کچھ مدت فقہ اسلامی کی مشہور کتاب فتاویٰ عالمگیری کی تدوین کا کام کرتے رہے؛ تاہم انہیں مغل

دربار کی پُرتکلف مصنوعی فضا پسند نہ تھی ؛ چنانچہ اس کام کو چھوڑ دیا اور اپنا سارا وقت اپنی قائم کردہ درس گاہ ـــــ مدرسۂ رحیمیہ میں درس و تدریس کے لیے وقف کر دیا۔ شاہ ولی اللہ رح نے اپنے والد ہی سے تعلیم حاصل کی اور ابھی سترہ برس ہی کے تھے کہ انھی کے مدرسے میں طلبہ کو پڑھانے لگے۔

درس و تدریس کا یہ سلسلہ بارہ برس تک جاری رہا۔ پھر حج کرنے اور مکہ و مدینہ کے ممتاز ترین فضلاء و اساتذہ سے اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کے ارادہ سے عرب تشریف لے گئے۔ مکہ مکرمہ کے زمانۂ قیام میں شاہ ولی اللہ رح نے خواب میں دیکھا کہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کتاب و سنت کی خالص تعلیمات پر مبنی نئے سلسلے کے بانی کی حیثیت سے خلعت سے نوازا اور ان کے حق میں دعا فرمائی۔ یہ خواب مستقبل کی تمام سرگرمیوں میں ان کے لیے روحانی تقویت کا باعث ہوا۔ ہندوستان میں ان دنوں سخت ابتری پھیلی ہوئی تھی ؛ چنانچہ شاہ ولی اللہ رح کے اقرباء نے مشورہ دیا کہ وہ سردست عرب ہی میں رہیں ، لیکن شاہ صاحبؒ اپنا صحیح مقام وطنِ عزیز ہی کو سمجھتے تھے اس لیے اس مشورہ کو قبول نہ کیا اور ۹ جولائی ۳۲ ۱۷ء کو دہلی واپس پہنچ گئے۔ زندگی کا باقی حصہ اپنے شاگردوں کو علومِ اسلامی کی مختلف شاخوں میں تربیت اور طلبہ کو تعلیم دینے کے لیے تیار کرنے میں گزارا۔ وہ اپنا تمام فاضل وقت ضخیم تصانیف لکھنے میں صرف کرتے؛ چنانچہ جب ۱۷۶۲ء میں فوت ہوئے تو فی الواقع وہ تمام علومِ اسلامی پر حاوی ایک کتب خانہ مکمل کر چکے تھے۔ ان کی اہم ترین اور بلند پایہ تصنیف حجۃ اللہ البالغہ ہے۔ یہ کتاب عالمِ اسلام کے علماء میں بے حد مقبول ہوئی اور قاہرہ کی جامع الازہر کے نصاب میں ایک مدت تک شامل رہی۔

عالم دین ہونے کی حیثیت سے شاہ ولی اللہ رح نے مسلمانوں کے سیاسی زوال کو روکنے اور تجدید و احیائے اسلام کی ہر وہ تدبیر کی جو اُن کے بس میں تھی۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں برسرِ اقتدار گروہوں کی بداعمالیوں پر تیز و تند تنقید کرنے سے بھی گریز نہ کیا اور کہا کہ وہ دنیوی لذات کے پیچھے دوڑنا چھوڑ دیں اور اپنے گناہوں سے تائب ہوں۔

"اے امیرو، تمہیں خدا کا خوف نہیں آتا ؛ تم فانی لذتوں کی طلب میں مستغرق ہو چکے ہو ، جن لوگوں کی نگرانی اور تحفظ کی ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے ، ان سے غافل ہو گئے ہو۔ نتیجہ یہ ہے کہ طاقت ور لوگ کمزوروں کو کھاتے جاتے ہیں۔ تم نے اپنی ساری ذہنی توانائیاں پُرتکلف کھانوں ، نرم و نازک اور حسین و جمیل عورتوں ، اعلیٰ ملبوسات اور شاندار محلات پر صرف کر رکھی ہیں ـــــ"

فوجیوں سے کہا کہ وہ غیر اسلامی افعال سے باز آئیں اور اپنے اندر جہاد کی روح پیدا کریں ، نیز نظم و ضبط کے فقدان ، فرائض کی انجام دہی سے اعراض ، شراب اور دوسری منشیات کی عادت اور عامۃ الناس پر جبر و ظلم کی مذمت کی۔

اہلِ حرفہ ، مزدوروں اور علماء سے خطاب کرتے ہوئے امانت و دیانت کے فقدان ، دینی فرائض سے تغافل ، توہمات پر اعتقاد ، خاندانی ذمہ داریوں سے گریز ، اہل و عیال کی ضروریات سے بے توجہی اور غیر اخلاقی اعمال پر گہرے غم و اندوہ کا اظہار کیا۔ انہیں نصیحت کی کہ وہ اپنے شام و سحر نماز میں گزاریں ، دن کا بڑا حصہ کسبِ معاش کے لیے وقف کریں ، مصارف کو آمدنی سے کم رکھیں اور چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائیں ، جو کچھ پس انداز کریں اُسے مسافروں اور حاجتمندوں پر صرف کریں اور تھوڑا بہت ہنگامی مصارف اور ناگہانی مصائب کے لیے ضرور رکھ چھوڑیں۔

عوام کو تلقین کی کہ وہ اپنی زندگیوں کی اصلاح کریں۔ حرام و حلال میں امتیاز روا رکھیں ، اسراف و تبذیر سے کام نہ لیں ، مصارف میں میانہ روی اختیار کریں اور حلال ذرائع سے روزی کمائیں۔ شاہ ولی اللہ رح نے بالخصوص اس بات پر زور دیا کہ ہر صحت مند آدمی حلال اور ثمر آور ذرائع ـــــ زراعت ، تجارت اور صنعت سے روزی کمائے۔ ہندوستان میں اسلام کی ایک بڑی کمزوری وہ ہندوانہ رسوم تھیں ، جنھیں جاہل نومسلم اپنے ساتھ لے آئے تھے اور ان پر بدستور عمل پیرا تھے۔ شاہ ولی اللہ رح نے ان رسوم کو ترک کرنے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کا عمل اختیار کرنے پر زور دیا۔ وہ معاشرتی خرابیاں جن کا منبع ہندوانہ رسوم تھیں ، مثلاً بیوہ عورتوں کا نکاحِ ثانی ، پیدائش ، شادی بیاہ اور موت پر مسرفانہ مصارف ، ان سب پر

شاہ ولی اللہؒ نے سخت تنقید کی۔

شاہ ولی اللہؒ ملوکیت کے قائل نہ تھے۔ ان کی نظر میں مغل حکمران رومی شہنشاہوں اور فارسی ساسانیوں سے ذرا بھی بہتر نہ تھے جو گونا گوں ٹیکسوں اور دوسرے متشددانہ اقدامات کے ذریعے اپنے عوام کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک روا رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک ایک مسلمان معاشرہ کے لیے بہترین حکومت وہ تھی جو خلافتِ راشدہ کے منہاج پر قائم کی جاتی۔

عربی زبان سے نابلد لوگوں میں قرآنِ کریم کی تعلیمات عام کرنے کے لیے شاہ ولی اللہؒ نے قرآن مجید کا ترجمہ پہلی بار فارسی زبان میں کیا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادوں نے اُسے اُردو میں منتقل کیا۔ پوری اسلامی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جب ایک عالمِ دین نے قرآن مجید کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں کیا۔ اس عظیم الشان دینی خدمت کا صلہ قدامت پسند علماء نے شدید مخالفت کی صورت میں دیا۔ قرآن کریم کی تبلیغ و اشاعت کے سلسلے میں ایک قابلِ ذکر پہلو اور بھی تھا۔ مفسرین نے اپنی تفاسیر میں یہودی ماخذ سے لیے جانے والے غیر مصدقہ قصص شامل کر لیے تھے۔ شاہ صاحبؒ نے ان پر کڑی تنقید کی اور قرآنی لٹریچر میں اسرائیلیات کی شمولیت کو اسلامی فکر کی آفت قرار دیا۔ اسی طرح شاہ ولی اللہؒ نے تعلیمِ حدیث کے سلسلے میں بھی بہت گراں قدر اور مؤثر خدمت سر انجام دی۔ اسی ضمن میں ان کا حقیقی کام فاضل اساتذہ کی تربیت تھا تاکہ وہ اس کام کو ان کی وفات کے بعد بھی جاری رکھ سکیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کے سلسلے میں شاہ ولی اللہؒ نے واقدی پر سخت تنقید کی، جس نے کتاب المغازی میں قرآن کی آیات کی شانِ نزول بیان کرتے ہوئے داستان سرائی کی حد کر دی ہے۔ آپ نے بتایا کہ قرآن کریم کی مختلف ہدایات و احکام کا مقصدِ حقیقی بگڑے ہوئے عقائد اور مضر افعال اور انسانی کردار کی اصلاح تھا، لہٰذا ضمنی واقعات جن کا ذکر واقدی نے کیا ہے کوئی اخلاقی اور تاریخی قدر و قیمت نہیں رکھتے۔

شاہ ولی اللہؒ اور ان کے جانشینوں نے جن اصلاحات کی دعوت دی چونکہ ان میں سے

اکثر عرب کے وہابی مصلحین کی اصلاحات سے ملتی جلتی تھیں اس لیے مغربی مبصرین غلطی سے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دونوں تحریکیں ایک سی تھیں۔ اگرچہ شاہ ولی اللہؒ بھی محمد بن عبدالوہابؒ کی طرح امام ابن حنبلؒ اور امام ابن تیمیہؒ کے مکتبِ فکر کے پُرجوش طالب علم تھے اور دونوں مجددین ہم عصر بھی تھے، تاہم دونوں کے درمیان نمایاں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ اپنے افکار و نظریات میں محمد بن عبدالوہابؒ کی بہ نسبت کہیں زیادہ اعتدال پسند اور وسیع القلب تھے۔ انہوں نے بھی تصوف کی خرابیوں پر کھُل کر تنقید کی، تاہم اس کو بالکل مٹا دینے کا مقصد ان کے پیشِ نظر نہ تھا۔ مسلمانوں کو رشتۂ اتحاد میں منسلک کرنے ہی کی کوشش میں انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ شیعہ اگرچہ متعدد اہم ترین مسائل میں سنتِ رسولؐ سے الگ ہو چکے ہیں، تاہم وہ مسلمان ہیں، کافر نہیں ہیں۔

یہ دعویٰ بار بار کیا جاتا ہے کہ شاہ ولی اللہؒ، سر سید احمد خاں ایسے تجدد پسندوں کے پیشرو تھے۔ انہوں نے ان لوگوں کو عقلی توجیہہ مہیا کی جس کی، مغرب کے جدید طور اطوار اور جدت پسندیوں کو اسلام میں داخل کرنے کے لیے سخت ضرورت تھی۔ اس دعویٰ میں صداقت کا شائبہ تک نہیں ہے۔

"جہاں تک شاہ ولی اللہؒ کا تعلق ہے وہ اول و آخر اسلام کے ایک عظیم اور راست فکر عالم تھے۔ انہیں (برِ صغیر کی دینی تاریخ میں) جو مستند اور قابلِ اعتماد مرتبہ حاصل ہے اس کی وجہ سے یہاں ہر "مصلح" ان کا نام استعمال کرتا ہے۔ اپنا مطلب نکالنے کے لیے ان کی عبارتوں کو سیاق و سباق سے الگ کر کے اور توڑ مروڑ کر پیش کرتا ہے۔ جس شخص نے بھی ان کی عربی اور فارسی تصانیف کا گہرا مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ سہارے کے یہ متلاشی کس قدر بد دیانت ہیں۔ جو نظریات ان کی تحریروں میں بالکل نہیں ملتے، ان کو ثابت کرنے کے لیے یہ لوگ ان کے الفاظ کی عجیب و غریب اور پُرلطف تاویل

کرتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ رح نے "عقلیت کی برتری" کی کبھی تائید و وکالت نہیں کی۔ نہ انہوں نے "حربی اجزاء" کو اسلام سے خارج کر دینے کی کوئی کوشش کی۔ وہ چاروں فقہی مذاہب کے زبردست مدّاح تھے۔ انہوں نے ان میں سے کسی ایک فقہی مذہب کو خارج کر کے کوئی نیا نظامِ قانون مستنبط کرنے کی آرزو نہیں کی، تاہم ان قدیم اور مقدس فقہی مذاہب کے کٹرپن اور ان کی باہمی خصومت کے پیشِ نظر انہوں نے یہ خیال ضرور ظاہر کیا تھا کہ حنفی اور شافعی مذاہبِ فقہ کی تحلیل و ترکیب سے ایک نئے قانونی نظام کا استنباط زیادہ مناسب ہوگا، لیکن اس اظہارِ خیال سے آگے بڑھ کر انہوں نے کبھی کوئی قدم نہ اٹھایا۔ اسلام میں اُن کا صحیح مقام مجدد کا ہے۔ وہ متجدد نہ تھے[1]۔"

شاہ ولی اللہ رح ذہنی و فکری انقلاب کی تیاری کرنا چاہتے تھے۔ یہی ذہنی اور فکری انقلاب سیاسی احیاء اور صحیح اسلامی ریاست کا نقیب بن سکتا تھا، اسی کے لیے انہوں نے زندگی بھر جد و جہد کی۔ تحریر و تصنیف سے فراغت پاتے تو علماء کی ایک جماعت کی تربیت میں مصروف ہو جاتے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے بعد ازاں اپنی زندگی اپنے اُستاد کے دینی، معاشرتی اور سیاسی نظریات کو پھیلانے کے لیے وقف کر دی۔

---

[1] مصنف کے نام مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے مکتوب مورخہ ۳۰ مارچ ۱۹۶۲ء سے ایک اقتباس۔

سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ

شاہ ولی اللہ رح کے کام کا سب سے بڑا حاصل یہ تھا کہ خارجی میدان میں انگریزوں اور سکھوں کی طاقت، اور داخلی زندگی میں اخلاقی و روحانی مفاسد کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لیے ایک زبردست تحریک اُٹھ کھڑی ہوئی۔ شاہ ولی اللہ رح کے مشن کو پورا کرنے کی جد و جہد جس شخص نے سب سے بڑھ کر کی وہ سید احمد شہیدؒ تھے۔ سید احمد ۱۷۸۶ء میں لکھنؤ سے تقریباً ۵۰ میل دور ایک چھوٹے سے قصبے رائے بریلی میں پیدا ہوئے، تاہم سید احمد، شاہ ولی اللہ رح کی طرح معروف معنوں میں عالم نہ تھے۔ بچپن میں انہوں نے چند الفاظ لکھنے اور قرآن مجید کی چند سورتیں یاد کرنے کے سوا اور کچھ نہ پڑھا۔ وہ بے حد قوی ہیکل تھے۔ عنفوانِ شباب کا بڑا حصہ جسمانی ریاضت اور پہلوانی میں گزارا۔ پیراکی کے بے حد شائق تھے اور اس فن میں بڑے بڑے پیراکوں پر سبقت رکھتے تھے۔ بھاری وزن اُٹھانا بھی ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ان کی حیرت انگیز طاقت اور دلیری کی بہت سی کہانیاں مشہور ہیں۔ والد کے انتقال کے بعد تلاشِ روزگار کی ضرورت پڑی تو گھر سے نکلے اور لکھنؤ پہنچے۔ وہاں تین مہینے رہے، لیکن کوئی روزگار نہ ملا۔ آخر کار شاہ ولی اللہ رح کے صاحبزادے اور عالمِ بے بدل شاہ عبد العزیز رح کے آگے زانوئے تلمذ تہ کرنے کا فیصلہ کر لیا، چنانچہ دہلی پہنچے اور شاہ عبد العزیز رح کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ شاہ صاحبؒ کو جب پتہ چلا کہ

سید احمد، شاہ ولی اللہ رحمہ کے نہالی رشتے سے ان کے ایک جدی عزیز ہیں، تو بے حد خوش ہوئے۔ سید احمد رحمہ اسلامی طریق آداب پر عامل تھے۔ جب حاضرِ خدمت ہوئے تو السلام علیکم کہا۔ شاہ عبدالعزیز رحمہ بے حد مسرور ہوئے، کیونکہ اس زمانے میں ہندوستان کے مسلمان گھرانوں میں سلام مسنون کا رواج تقریباً اُٹھ چکا تھا۔ دورانِ تعلیم میں سید احمدؒ ایک عجیب و غریب تجربہ سے دوچار ہوتے۔ جب بھی پڑھنے بیٹھتے کتاب کے الفاظ غائب ہو جاتے۔ قرآن و حدیث کی تعلیم وہ بڑے جوش اور ولولے سے حاصل کرتے لیکن دوسرے مضامین میں ان کے لیے کوئی جاذبیت نہ تھی۔ بعض کا خیال تھا کہ وہ کسی اعصابی عارضہ میں مبتلا ہیں، لیکن درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک اشارہ تھا کہ انہیں لکھنے پڑھنے کے لیے پیدا نہیں کیا گیا۔ بائیس سال کی عمر تک انہوں نے اتنی عربی فارسی پڑھ لی جو قرآن و حدیث جاننے کے لیے ضروری تھی۔ اب ان کے اساتذہ نے انہیں تصوف سے روشناس کیا۔ سیّد احمد رحمہ وجیہہ اور دراز قامت نوجوان تھے۔ ان کا جسم گٹھیلا اور رنگ سُرخ و سفید اور خوش گن تھا۔ آنکھیں سیاہ بڑی بڑی اور تفکر میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ وہ شاہ عبدالعزیز رحمہ کے مدرسے سے ان کی دعوت قرآن و حدیث کی تعلیمات کی نشر و اشاعت کے پُرجوش علمبردار بن کر نکلے۔ رائے بریلی پہنچے تو ان کے ورع و تقویٰ، سادگی اور مثالی کردار کی بنا پر لوگ انہیں ولی سمجھنے لگے۔ شاہ عبدالعزیز رحمہ کے ساتھ ربط ضبط سے ان کی شہرت میں اور اضافہ ہو گیا۔ وہ جہاں کہیں جاتے لوگ انہیں خدا رسیدہ انسان سمجھ کر نگاہ و دل فرشِ راہ کرتے۔ سیّد احمدؒ اسلام کی تجدید و احیاء کا مقصد اپنے سامنے رکھتے تھے۔ وہ اسے ہندوستانی اور عجمی توہمات سے پاک صاف کرنا چاہتے تھے۔ انہیں فروعات میں موشگافی اور نظری اختلافات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ توحید اور احکامِ الٰہی کی اطاعت اور اس کی ضرورت و اہمیت ان کا پیغام تھا جس کی وہ رات دن تبلیغ و اشاعت کرتے۔

جولائی ۱۸۲۱ء میں سید احمد فریضۂ حج ادا کرنے کے لیے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔ حج بیت اللہ ایک دینی فریضہ ہے اور ہر صحت مند اور استطاعت رکھنے والے مُسلمان پر

فرض ہے، لیکن ہندوستان کے مسلمان اس فریضہ کی ادائیگی کو تقریباً چھوڑ چکے تھے۔ بہانہ یہ تھا کہ مکہ مکرمہ تک سفر نہایت پُرخطر بن چکا ہے۔ سیّد احمد رحمہ کے ہمراہ تقریباً چار سو افراد کی ایک بڑی جماعت بھی گئی۔ ان میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔ مصارفِ سفر کے لیے اگرچہ ان کے پاس کافی روپیہ نہ تھا، تاہم انہوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کریمی پر کامل بھروسا کریں؛ چنانچہ جب حج کر کے واپس آئے ان لوگوں کے پاس نہ صرف کافی اشیائے خورد و نوش بلکہ کئی سو روپیہ بھی بچ رہا تھا۔ سیّد احمدؒ عرب میں متعدد علماء اور فضلاء سے ملے اور عالمِ اسلام کی تمام اہم تحریکوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ ان میں غالباً وہابی تحریک بھی شامل تھی؛ تاہم یہ سمجھنا غلط ہے کہ سیّد احمد رحمہ نے جس تحریک کا آغاز کیا وہ وہابیت کی شاخ ہی تھی۔ اکثر یورپی مصنف اسی غلطی کا شکار ہوتے ہیں۔ ولیم ہنٹر کی کتاب ہندوستانی مسلمان (THE Indian Musalmans) اس کی ایک مثال ہے۔ سیّد احمد رحمہ کی تحریک کے اہم افکار عرب روانہ ہونے سے پیشتر ہی تشکیل پا چکے تھے۔

حج سے مراجعت فرما ہوئے تو سیّد احمد رحمہ نے ہندوستان کو غیر ملکی اقتدار کے جوئے سے آزاد کرانے اور صحیح اسلامی مملکت قائم کرنے کے لیے ملّی بنیادوں پر جہاد کی تیاری شروع کر دی۔ سیّد احمد رحمہ اپنے سربرآوردہ مرید شاہ اسماعیل سمیت ۱۸۳۱ء میں سکھوں سے لڑتے ہوئے بالاکوٹ کے مقام پر شہید ہو گئے۔ سکھوں نے اپنے مسلمان حریف سے انتقام اس طرح لیا کہ سید صاحب کی لاش کو ضائع کر دیا۔ اس سلسلے میں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ اُن پڑھ پٹھانوں کا یہ اعتقاد تھا کہ اگر جسم کو جلا ڈالا جائے تو انسان کی رُوح کو نہ تو کبھی چین نصیب ہوتا ہے اور نہ وہ بہشت ہی میں داخل ہو سکتی ہے۔ سیّد صاحبؒ اور اُن کے ساتھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے اسوۂ حسنہ اور اصحابِ رسول کے معیارِ کردار کو اپنانے میں کامیاب رہے۔ انہوں نے پہلے سکھوں کو دعوت دی کہ وہ یا تو اسلام قبول کر لیں یا جزیہ دیں۔ ہتھیاروں سے کام اُس وقت لیا جب اور کوئی چارۂ کار نہ رہا۔ دورانِ جنگ میں اسلامی احکام کی کامل

پابندی کی۔ کبھی کسی وحشیانہ فعل کا ارتکاب نہیں کیا۔ ان کے سپاہی نہ شراب پیتے تھے نہ زانی اور بدکار تھے۔ کسی ایک جنگ میں بھی کسی عورت کی عصمت دری یا کسی کا مال لوٹنے کی مثال نہیں ملتی۔ خدا کے یہ سپاہی فی الواقع ولی تھے۔ جن کے دن گھوڑوں کی پشت پر بسر ہوتے تھے اور راتیں تہجد اور نوافل میں۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی آخرت کے حساب کتاب اور اللہ کے آگے جوابدہی کے احساس سے غافل نہ ہوتے تھے۔

• ان کی ناکامی بلحاظ ظاہر ہے نہ کہ بلحاظِ حقیقت۔ حقیقی کامیابی تو مسلمان کے نزدیک بس یہ ہے کہ وہ اللہ کی رضا کے لیے اقامتِ دین کی سعی کرے جیسا کہ سعی کرنے کا حق ہے۔ اس لحاظ سے یہ حضرات یقیناً کامیاب رہے۔ البتہ ان کی ناکامی دنیوی نتائج کے اعتبار سے ہے کہ وہ عملاً جاہلیت کا اقتدار ختم کر کے اسلام کا غلبہ قائم نہ کر سکے۔

ان کی ایک کمزوری یہ ہے کہ ان مصلحین نے تصوف کے بارے میں مسلمانوں کی بیماری کا پورا اندازہ نہیں لگایا اور نادانستہ ان کو پھر وہی غذا دے دی جس سے مکمل پرہیز کرانے کی ضرورت تھی۔ اب جس کسی کو تجدید دین کے لیے کوئی کام کرنا ہو اس کے لیے لازم ہے کہ متصوفین کی زبان و اصطلاحات سے، رموز و اشارات سے، لباس و اطوار سے، پیری مریدی سے، اور ہر اس چیز سے جو اس طریقہ کی یاد تازہ کرنے والی ہو، مسلمانوں کو اس طرح پرہیز کراتے جیسے ذیابیطس کے مریض کو شکر سے پرہیز کرایا جاتا ہے۔

دوسری چیز جو ایک شخص کو تنقیدی مطالعہ کے دوران میں محسوس ہوتی ہے یہ ہے کہ سید صاحبؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ نے جس علاقہ میں جا کر جہاد کیا اور جہاں اسلامی حکومت قائم کی، اس علاقہ کو اس انقلاب کے لیے پہلے اچھی طرح تیار نہیں کیا تھا ——— تاریخ کا یہ سبق بھی ایسا ہے جسے آئندہ

ہر تجدیدی تحریک میں ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ جس سیاسی انقلاب کی جڑیں اجتماعی ذہنیت، اخلاق اور تمدن میں گہری جمی ہوئی نہ ہوں وہ نقش بر آب ہوتا ہے۔ کسی عارضی طاقت سے ایسا انقلاب واقع ہو بھی جائے تو قائم نہیں رہ سکتا۔

اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ ان بزرگوں کے مقابلہ میں کئی ہزار میل دور سے آتے ہوئے انگریزوں کو کس قسم کی فوقیت حاصل تھی جس کی وجہ سے وہ تو یہاں جاہلی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے اور یہ خود اپنے گھر میں اسلامی حکومت قائم نہ کر سکے؟ اس کا صحیح جواب آپ نہیں پا سکتے جب تک کہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی کے یورپ کی تاریخ آپ کے سامنے نہ ہو۔ معاصر تاریخ کے سرسری خاکہ پر نظر ڈالنے سے بآسانی یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ ہمارے ہاں تو چند اشخاص ہی بیدار ہوتے تھے مگر وہاں قومیں کی قومیں جاگ اٹھی تھیں۔ یہاں صرف ایک جہت میں تھوڑا سا کام ہوا اور وہاں ہر جہت میں ہزاروں گنا زیادہ کام کر ڈالا گیا۔ یہاں ولی اللہ صاحبؒ اور ان کی اولاد نے چند کتابیں خاص خاص علوم پر لکھیں جو ایک نہایت محدود حلقے تک پہنچ کر رہ گئیں اور وہاں لائبریریوں کی لائبریریاں ہر علم و فن پر تیار ہو گئیں جو تمام دنیا پر چھا گئیں اور آخر کار دماغوں اور ذہنوں پر زابض ہو گئیں ——— شاہ ولی اللہؒ اور ان کے خلفاء نے اسلام کی تجدید کے لیے جو کام کیا اس کی طاقت کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھیئے اور دوسرے پلڑے میں اس طاقت کو رکھیئے جس کے ساتھ ان کی ہم عصر جاہلیت اٹھی تھی تب آپ کو پورا اندازہ ہوگا کہ اس عالم اسباب میں جو قوانین کارفرما ہیں ان کے لحاظ سے دونوں طاقتوں میں کیا تناسب تھا؟ اس لیے جو نتیجہ فی الواقع رونما ہوا اس کے سوا اور کچھ نہ ہو سکتا تھا۔[1]

---

[1] تجدید و احیائے دین از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی۔ ص ۱۲۲، ۱۲۷

یہ تمام اسباب و عوامل مل کر سید احمدؒ کی بالاکوٹ کے مقام شہادت پر منتج ہوئے، لیکن ان کے اثرات اس قدر قوی تھے کہ ان کی درخشاں مثال مسلم ہندوستان میں تجدید اسلام کی تمام آئندہ کوششوں کی محرک بن گئی۔

شہزادہ سعید حلیم پاشا

شہزادہ سعید حلیم پاشا محمد علی والیٔ مصر کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوئے۔ محمد علی ایک جوشیلا مغرب پرست تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کو مغربی تعلیم دلوائی۔ شہزادہ سعید حلیم پاشا "نوجوان ترکوں" کے ایک لیڈر تھے اور کمال اتاترک کے عہدِ حکومت سے پہلے ترکی کے وزیرِ اعظم رہ چکے تھے۔ وہ تحریکِ احیائے اسلام کے ایک ممتاز علمبردار تھے۔ پہلی جنگِ عظیم کے اختتام پر انہیں اپنی جان بچانے کے لیے ترکی سے بھاگنا پڑا۔ ۱۹۲۱ء میں ایک آرمینی پناہ گزین نے انہیں دھوکے سے قتل کر ڈالا۔

سعید حلیم پاشا زمانے کے گرم و سرد سے آگاہ ایک تجربہ کار اور جہاں دیدہ مدبر تھے۔ جدید یورپی سیاسیات میں گہرا درک رکھتے تھے۔ وہ ایک مصلح تھے۔ انہوں نے اپنی ساری عمر اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل اور ان کے مسائل کے متعلق سوچ بچار میں بسر کی۔ انگلستان، فرانس اور جرمنی کے نظریات کے ساتھ ساتھ قرآن و حدیث کی تعلیمات اور تفسیر و فقہ پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ عالمِ اسلام کی قیادت کرنے اور مستقبل کی پالیسی کے سلسلے میں اُسے مشورہ دینے کی اعلیٰ صلاحیت سے بہرہ مند تھے۔ ان کا مشورہ یہ تھا کہ مسلمان مغرب زدگی کے بجائے اسلام کو

اپنائیں[1]۔ انہوں نے اپنے نظریات اپنی کتاب " اسلامِ مشتق " میں مفصل بیان کیے ہیں۔ مشہور نو مسلم محمد مارماڈیوک پکتھال نے اس کتاب کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے ۔ ذیل میں اس کے چند اقتباسات درج کیے جاتے ہیں ۔ اسلامی نظامِ حکومت کو جدید اسلوب میں پیش کرنے کی یہ غالباً پہلی کامیاب کوشش تھی :

" یہ بات میرے لیے بے حد اطمینان بخش ہے کہ عامۃ المسلمین خوابِ گراں سے بیدار ہو رہے ہیں اور ان کے اندر غیر ملکی اقتدار کا جُوا اتار پھینکنے کی تڑپ پیدا ہو رہی ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بالآخر وہ سمجھ گئے ہیں کہ آزادی حاصل کرنا مسلمان کا مقدس ترین فریضہ ہے ۔ آزادی کے بغیر نہ تو وہ مسرت و خوشحالی سے ہمکنار ہو سکتے ہیں نہ حقیقی ترقی سے ۔ تاہم مجھے اعتراف ہے کہ میرا یہ اطمینان بے آمیزش نہیں ہے ۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ مسلمانوں کے روشن خیال طبقات کے نمائندوں کی بھاری اکثریت اپنے ملکوں کو مغربی اداروں کے مصنوعی چربوں سے نوازنے پر تُلی ہوئی ہے ۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ وہ ہند آریائی دنیا کے اصولوں اور تصورات کو اپنا کر ہی نشاۃِ ثانیہ سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں ۔ اس طبقے کی یہ ذہنی کیفیت میرے لیے بے حد پریشان کُن ہے ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اب ان لوگوں کو یہ احساس تک نہیں رہا کہ اسلام ہمیں ایک خدا کی عبادت کرنے کی تعلیم ہی نہیں دیتا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ عقیدۂ توحید سے صادر ہونے والے اخلاقی اور معاشرتی اصول بھی عطا کرتا ہے ۔ یہ اصول ہم پر ہمارا عقیدہ عائد کرتا ہے ۔ تمام مسلمان معاشرے انہی کے ذریعے وجود میں آئے ہیں اور انہی کی بنیاد

---

[1] *Islamic Culture*, Muhammad Marmaduke Pickthall, pp. 153- 154.

پر زندہ رہے ہیں ۔ پھر یہ بھی صاف عیاں ہے کہ ہمارے منتخب روشن خیال طبقہ کا یہ ایمان بھی نہیں رہا کہ اسلام سب ادیان سے برتر و افضل دین اور کامل و اکمل تہذیب ہے ۔ جس طرح انسان اس کے حلقۂ طاعت سے باہر رہ کر ابدی نجات سے ہمکنار نہیں ہو سکتا اسی طرح اس کے بغیر وہ معاشرتی نجات بھی نہیں پا سکتا ——— میرے نزدیک یہ بات مسلمان ذہنیت کے بگاڑ کا نتیجہ ہے کہ وہ مسلمان معاشرہ کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے مغربی معاشرہ میں جذب ہو جانا ضروری سمجھتے ہیں ۔ یہ ذہنی بگاڑ اس غیر ملکی استیلاء کا منحوس اثر ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو ماننے والے لوگ برداشت کر رہے ہیں ۔ اس غیر ملکی غلبہ و استیلاء کا اثر جس نے ان کے درمیان ذہنی گداز ندہ کا کردار ادا کیا ہے ۔ میں ان غلطیوں کو رفع کرنا چاہتا ہوں جن سے یہ ذہنیت گراں بار ہے اور یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ اخلاقی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے عالمِ اسلام کا مغرب پر رشک کرنا کوئی دانشمندی نہیں ہے ۔ اس کے برعکس ان معاملات میں مغرب کو اسلام کے آگے زانوئے تلمذ تہ کرنا چاہیئے ۔

اسلام کا سارا اجتماعی ڈھانچہ شریعت کی حاکمیت کے اساسی اصول پر مبنی ہے ۔ مسلمان معاشرہ وہ ہے جو اس حاکمیت کے آگے سرِ تسلیم خم کر دے ۔ شریعت ان فطری، اخلاقی اور معاشرتی سچائیوں کا کامل مجموعہ ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خلاقِ کائنات کی طرف سے نازل کردہ وحی کی بنا پر ہمیں بتائیں اور جن پر انسان کی راحت اور مسرت کا دار و مدار ہے ۔ شریعت کی حاکمیت کا اصول یہ ہے کہ انسان اس اساسی سچائی کو تسلیم کرے کہ ہر قسم کی زندگی اس کی محکوم ہے لہٰذا جس طرح انسان کی طبعی زندگی مخصوص طبعی قوانین کی محکوم ہے اسی طرح اس کی معاشرتی زندگی بھی فطری معاشرتی قوانین کے ماتحت ہے ۔ چنانچہ اسلام اس

اصول کو منوانے میں کامیاب ہو گیا کہ انسان اپنے کسی پڑوسی کے قانون کی اطاعت
کرنے پر مجبورِ مطلق نہیں ہے، خواہ وہ قانون اس قوم یا گروہ کی بھاری اکثریت کی
مرضی کا مظہر ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے کہ یہ قانون لازماً کسی حد تک مستبدانہ ہو گا۔ اسلام
نے تجربیت اور عقلیت کو زیر کیا، کیونکہ یہ دونوں غلطیوں اور تعصبات کا انبار تھے۔
یہی غلطیاں اور تعصبات اب تک معاشرتی نظام کی تشکیل اور نشوونما میں انسان کی
رہنمائی کرتے رہے تھے۔ اسلام نے ایسے اصول و ضوابط پیش کیے جن کی بدولت
لوگوں کو ان خیالی حاکمیتوں سے نجات ملی جو انہوں نے کسی ایسی با اختیار ہستی کی
فطری ضرورت پورا کرنے کے لیے خود بنالی تھیں، جو معاشرتی، اخلاقی اور سیاسی
نقطۂ نظر سے نظم و ضبط کی ضمانت دینے کے قابل ہو۔ بلاشبہ یہ اسلام ہی ہے
جس نے حکومت کا صحیح ترین تصور وضع کیا اور انسان کو یہ تعلیم دے کر اس کی حقیقی
اہمیت سے آگاہ کیا کہ غیر متنازع فیہ اقتدار و اختیار کا مالک خدا تعالیٰ کی ذاتِ
بے ہمتا ہے اور یہ عملی شکل میں شریعت میں موجود ہے، جو اخلاقی و معاشرتی
صداقت کا معیار اور، بنا بریں، مملکت کے نظامِ حکومت میں معاشرتی انصاف
کا ضامن ہے۔ اسلام نے اس عقیدہ کا خاتمہ کر دیا کہ انسان کی کمزور و بے مایہ عقل
سے حکومت و اقتدار اخذ کیا جا سکتا ہے، جس سے صادر ہونے والے اخلاقی و
معاشرتی قوانین نے ہمیشہ جبر و ظلم پر مبنی مستبد اور غاصب طاقت کو جنم دیا
ہے۔ ایک ایسی غیر طبعی اور غاصب حاکمیت کو، جو محض اپنے خود غرضانہ مقاصد
کی تسکین کے درپے رہتی ہے اور اقتدار پر قابض ہاتھوں کی تبدیلی کے ساتھ
تبدیل ہو جاتی ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ شریعت کس لیے نازل کی گئی؟ مشاہدہ اور سوچ
بچار کی جن انسانی قوتوں نے سائنسی قوانین کو بے نقاب کیا، وہ اخلاقی و معاشرتی

قوانین کے انکشاف سے عاجز و درماندہ کیوں کر ہو سکتی ہیں؟ اس کا جواب بڑا سیدھا
سادا ہے۔ ان دونوں باتوں میں بنیادی فرق ہے۔ اول الذکر قوانین صرف
انسان کے طبعی وجود کے مطالعہ کی بنیاد ہیں، چنانچہ وہ ایک خالص معروضی نظام
دیتے ہیں۔ اس کے برعکس مؤخر الذکر قوانین کا انسان کے ساتھ رشتہ اُس کے
ایک اخلاقی، باضمیر اور معاشرتی مخلوق ہونے کی حیثیت سے ہے۔ بنا بریں اُن
کا تعلق انسان کے حساس نفسیاتی نظام سے ہے۔ بہ الفاظِ دیگر وہ صریحاً موضوعی
ہیں اور مثبت آئین کی کوئی بنیاد نہیں دے سکتے۔ انسان اپنی مرضی اور ارادے
کے دائرے سے باہر منکشف حقائق اور مظاہرِ فطرت سے نتائج کا استخراج
پوری ذہنی آزادی اور غیر جانبداری سے کر سکتا ہے، کیونکہ یہ نتائج محض مکانکی
انداز میں سامنے آتے ہیں اور ان پر انسانی خصوصیات بالکل اثرانداز نہیں ہوتیں۔
وہ ان سے حقیقت کے مطابق قوانین و ضوابط مستنبط کر سکتا ہے، لیکن جب انسان
کی اخلاقی اور معاشرتی زندگی کی تخلیق اور اس کی روش کو معین کرنے والے قوانین
بنانے کا سوال پیدا ہوتا ہے تو انسان کا مشاہدہ اور استدلال، پورے انضباط سے
کام لینے کے باوجود، غیر یقینی اور بالعموم ناقص رہنما ثابت ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ
ہے کہ انسان کی کمزوریاں اُس کے اس مشاہدہ اور استدلال کو ہمیشہ غارت کر کے
رکھ دیتی ہیں۔ انسان اس میدان میں انکشافِ حقیقت سے فطرتاً کتنا عاجز اور
بے بس و نااہل ہے، اس کا نمایاں ثبوت ان اخلاقی اور معاشرتی قوانین سے ملتا ہے
جو اہلِ مغرب نے وضع کیے ہیں۔ یہ قوانین فطری اصولوں سے یکسر جہالت پر مبنی
ہیں اور ان کی بدولت اہلِ مغرب، حد سے زیادہ مہذب ہونے کے باوجود، آج
تک دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ نیز اس کا اندازہ ان مصائب سے ہو سکتا ہے
جن سے وہ لوگ اس جہالت کے نتیجے میں دوچار ہیں، حالانکہ اپنی فطری صلاحیتوں

سے کام لیتے ہوتے وہ دوسرے فطری قوانین کا ادراک نہایت اعلیٰ پیمانے پر پا چکے ہیں۔ بنا بریں یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اخلاقی و معاشرتی قوانین کا انکشاف نہ فرمایا ہوتا جن پر انسانی زندگی کی راحت و مسرت کا دارومدار ہے، تو انسان ان سے کبھی آگاہ ہونے نہ پاتا۔

انسانی معاشرہ کی تنظیم کے سلسلے میں اسلامی نظریہ کی واضح برتری کے باوجود آج مسلمانوں کی ذہنی گمراہی کا یہ عالم ہے کہ وہ قومی منشا کے اُس اصول کو ترجیح دے رہے ہیں جو شریعت کی حاکمیت کے اصول سے نہ صرف کوئی مطابقت نہیں رکھتا بلکہ اُس کا مدِ مقابل بھی ہے ——— مسلمان "دانشوروں" کی آنکھیں مغربی معاشرہ کی مادی خوشحالی اور طاقت سے اسقدر چکا چوند ہو چکی ہیں کہ وہ مغرب کی اس بالادستی کی مدح و تعریف میں رطب اللسان ہیں اور اسے قومی حکومت کے اصول کا اعجاز قرار دیتے ہیں۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ شریعت کو مسلمان ریاست کا معیار اور ماخذ ہونے کی جو حیثیت حاصل رہی ہے، اُسے ختم کر دیا جائے۔ ہمہ مقتدر قومی حکومت کا یہ نظریہ، حکومت کے ان تمام دوسرے نظریات کی طرح غلط اور گمراہ کن ہے جو قبل ازیں مغرب میں مروج رہے ہیں۔ قومی حکومت ایک خیالی نظریہ پر قائم ہوتی ہے جس کی رُو سے کوئی قوم اپنے معاملات کا فیصلہ خود اپنے اختیار اور حقِ قانون سازی کے ذریعے کرتی ہے ——— ان حکومتوں کی تہ میں ہمیشہ قوت کا اصول کارفرما رہا ہے جس کا نتیجہ حصولِ اقتدار کی مسلسل کشمکش کی صورت میں نکلا ہے اور یہ کشمکش ہمیشہ اپنے جلو میں معاشرتی بُغض و عناد کی زہرناکی اور قومی طاقت کا مکمل ضیاع لائی ہے۔ لہٰذا ایسی حکومتیں محض بے قید اختیارات کا دوسرا نام ہیں جنہیں بہیمانہ قوت کے بل پر لوگوں پر مسلط کیا جاتا ہے۔ ان اصولوں کا احترام ان

کی فطرت میں گندھی ہوئی اخلاقی قدروں کی عظمت و شہرت کی بنا پر نہیں کیا جاتا وہ غضب و نہب اور ظلم و ناانصافی کی علامت ہوتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ حقیقی حکومت صرف ادائے فرض سے وجود میں آتی ہے اور وہ ادائے فریضہ کی محافظ ہوتی ہے۔ بصورتِ دیگر وہ غضب اور ظلم و ناانصافی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

لوگ جب یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انسان اس دنیا میں کچھ فطری حقوق لے کر آتا ہے، جن میں سے ایک حق یہ ہے کہ وہ آزاد ہے، تو وہ اپنے خیال میں بڑی آزاد خیالی کا ثبوت دیتے ہیں، حالانکہ اس سے بڑھ کر غلط اور گمراہ کن، بلکہ میں تو یہ کہوں گا، آزاد خیالی کا مخالف دعویٰ اور کوئی نہیں ہے۔ انسان کوئی فطری حق نہیں رکھتا۔ وہ فطرتاً اپنے آپ کو صرف اپنے ماحول کے مطابق ڈھالنے یا بالفاظِ دیگر ان فطری قوانین کی پابندی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے جن کی بحکم اس کی اخلاقی اور مادی زندگی ہے۔ زیادہ واضح الفاظ میں وہ فرائض انجام دینے کی استعداد سے بہرہ ور ہے۔ فرض انجام دینے کے بعد ہی وہ یہ حق حاصل کر سکتا ہے کہ اُس کی تائید و حمایت کی جائے اور اُسے سہارا دیا جائے۔ نیکی پر عمل پیرا ہونے کے بعد وہ عزت و احترام کا مستحق گردانا جا سکتا ہے اور اپنے اخلاقی و معاشرتی فرائض کی تعمیل کر کے ہی آزادی کا کسی قدر محدود حق حاصل کر سکتا ہے۔ اس آزادی کا جوہر بھی ان اخلاقی اور معاشرتی فرائض میں پنہاں ہے جنہیں وہ انجام دیتا ہے اور جس انداز میں انجام دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے لوگوں کو شریعت کے ذریعے اپنے فرائض انجام دینے کی تعلیم دی اور اس کے نتیجے میں مکمل اور پائیدار مسرت و راحت کے حق سے بہرہ اندوز ہونے کا مژدۂ جانفزا سنایا۔

آج مغربی ممالک میں ریاست کے اعلیٰ منصب کا دروازہ صرف دو قسم کے لوگوں کے لیے کھلا ہے۔ ایک وہ جو پیدائشی حق کی بنیاد پر چُپ چاپ اندر پہنچ

جاتے ہیں، خواہ اپنے فرائض انجام دینے کے اہل ہوں یا نااہل۔ دوسرے وہ جنہیں عوام اپنے ووٹوں سے منتخب کرتے ہیں۔ موخر الذکر طریقہ ہمارے دینی نقطۂ نظر سے قطعاً قابلِ اعتراض نہیں ہے بشرطیکہ انتخاب خوب غور وفکر کے بعد کیا جائے اور قوم کے بہترین اور آزمودہ خدام میں سے کیا جائے اور قوم کے بہترین اصحابِ عقل ودانش کی مجلسِ شوریٰ منتخب کرے۔ پھر اُسے زندگی بھر کے لیے یا اُس وقت تک کے لیے منتخب کیا جاتا ہے جب تک وہ اپنے فرائض دیانت وامانت اور حق وصداقت کے ساتھ انجام دے[1]۔ یہاں پھر یہ مغالطہ جڑ پکڑ چکا ہے کہ اکثریت

---

[1] یہ مقام ان متعدد مقامات میں سے ہے جن سے مترجم کو اختلاف ہے۔ موجودہ حالات میں اس سے چونکہ سخت غلط فہمی پیدا ہونے کا احتمال ہے اس لیے چند سطور قلم بند کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ یہ رائے شہزادہ سعید حلیم پاشا کی ذاتی رائے ہے۔ بے شک یہ بعض فقہا کی رائے پر مبنی ہے، لیکن قرآن وحدیث میں کہیں بھی مسلمانوں پر یہ واجب نہیں کیا گیا ہے کہ مسلمان ریاست کے سربراہ کا انتخاب صرف چیدہ اصحاب دانش کی مجلس کرے اور سربراہ لازماً زندگی بھر ہی کے لیے منتخب کیا جائے۔ قرآن وحدیث نے بس اصول دیئے ہیں۔ ان اصولوں کو پوری طرح ملحوظ رکھتے ہوئے انتخابی اداروں کی ہیئت وقت کے تقاضوں کے مطابق تبدیل کی جا سکتی ہے۔ خلفائے راشدین کے انتخاب کی نوعیت پر اگر گہری نظر ڈالی جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ مدینہ کی پہلی اسلامی مملکت میں حقِ انتخاب چند افراد کے بجائے بتدریج عامۃ المسلمین کی طرف منتقل ہو رہا تھا۔ اگر خلافتِ راشدہ کی جگہ ملوکیت نہ لے لیتی تو اسلامی ریاست کے دستوری اور انتخابی اداروں کی ہیئت واضح ہو کر سامنے آجاتی اور اس ہیئت میں عامۃ المسلمین کی رائے کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی۔ رہا زندگی بھر کے لیے سربراہِ مملکت کا انتخاب، تو خود اسلامی تاریخ کے اس سبق کے بعد کہ اس کا نتیجہ شخصی حکومت، آمریت یا بادشاہت کی صورت میں نکلتا ہے اس کو اپنانا عقل ودانش کا اچھا مظاہرہ نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً جب کہ نص میں اس کے وجوب کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

ہمیشہ حق پر ہوتی ہے؛ اسی مغالطہ کی بنا پر رائے دہندگی کا حق ایسے انبوہ کو دے دیا گیا ہے جو اس سلسلے میں صحیح فیصلہ کرنے کی اہلیت سے عاری ہے۔ یہ انتخاب بالعموم ان لوگوں میں سے ہوتا ہے جن کے متعلق عقل ودانش کہتی ہے کہ انہیں پہلے ہی مرحلے میں میدانِ انتخاب سے بالکل خارج کر دیا جائے۔ یہ لوگ بذاتِ خود طالع آزما ہوتے ہیں اور اقتدار پر قبضہ کرنے کے لیے ہر ممکن حربہ اختیار کرتے ہیں ——— مبارزتی (contested) انتخابات اسلامی اداروں کا جزو نہیں ہوتے کیونکہ اسلام نہ تو یہ تسلیم کرتا ہے کہ انفرادی طور پر نااہل اور خطا کار لوگ اجتماعی حیثیت سے اہل اور معصوم ہو جاتے ہیں اور نہ وہ جاہلوں کی اکثریت پر اعتقاد رکھتا ہے۔ حکمران کا انتخاب نہایت اہم معاملہ ہے اور صرف دانشمند اصحاب کو تفویض کیا جاتا ہے جو متعلقہ شخصیتوں سے گہرے واقف ہوتے ہیں۔ مجموعی طور پر مسلمان انتخاب میں کوئی حصہ نہیں لیتے، وہ محض اس انتخاب کی توثیق یا اُسے نامنظور کر سکتے ہیں۔ مسلمان ریاست کا سربراہ ایک مختصر مدت کے لیے نہیں زندگی بھر کے لیے منتخب کیا جاتا ہے۔ اُسے حکومت کے تمام اختیارات دیئے جاتے ہیں۔ بلحاظ عوام وہ ایک مطلق العنان فرمانروا ہوتا ہے، لیکن بلحاظ شریعت وہ اپنی رعیت کے ایک ادنیٰ فرد کے برابر ہوتا ہے۔ مسلمانوں میں ہر ایک مسلمان، جس کی نظر قیامت پر ہوتی ہے جب اُسے اپنے پورے کارنامۂ حیات کا حساب دینا ہوگا۔ جب تک وہ راستبازی سے حکومت کرتا ہے، عامۃ المسلمین اُس سے نجات پانے کا کوئی اختیار نہیں رکھتے، لیکن اگر وہ راہِ راست سے بھٹک جاتا ہے تو خود شریعت انہیں یہ حق دیتی ہے کہ اُس کا احتساب کریں اور ضرورت پڑے تو معزول کر دیں۔ مغربی جمہوری ملکوں میں عوام کے ووٹ سے کسی صدر کو راست روی پر بھی معزول کیا جا سکتا ہے، ہاں وہ ایک راست رو صدر کو اس بنا پر معزول کر سکتے ہیں کہ غلط روی کو ترجیح

دیتے ہیں ——— اسلامی ریاست میں نئے قانون آ قانون کے بنیادی اصولوں کے ماہر افراد ہی بنا سکتے ہیں۔ وہ ماہر افراد جنہیں روشن خیال اور قومی ضروریات کا فہم رکھنے والے علماء و فضلاء کے گروہ میں سے مجلس عمومی نے منتخب کیا ہو۔ پھر اسلام میں قانون سازی روزمرّہ کا کاروبار نہیں ہے بلکہ بہت کم اس کی نوبت آتی ہے۔ اسلامی قوانین اسمبلی کی مشتعل فضا میں وہ لوگ نہیں بناتے جو اپنے مفادات کی خاطر قانون سازی پر تُلے ہوئے ہوں۔ ان لوگوں کے علی الرغم جو مفاد پرستی ہی کی بنا پر اس کی مزاحمت کرتے ہیں۔ اسلامی قوانین کی بنیاد محکم شریعتِ الٰہی ہے؛ چنانچہ یہ قوانین بحیثیت مجموعی سب لوگوں کے مفاد میں ہیں۔ اسلامی قانون سازی باہم مخالف سیاست دانوں کا نہیں سنجیدہ اور ہوش مند ماہرینِ قانون کا کام ہے۔

قومی حکومت چونکہ ایک باطل اصول کی ارتقائی صورت ہے اس لیے ارتقا کے تسلسل کی بدولت اپنی پیشرو حکومتوں کی طرح مٹ جانے والی ہے۔ مزید براں جس چیز کو لوگ پوری قوم کی مرضی قرار دیتے ہیں وہ فی الحقیقت قوم کی اکثریت کی مرضی ہوتی ہے۔ یہ اکثریت صرف ایک ووٹ کی بھی ہو سکتی ہے۔ یعنی ایک کمزور سی اکثریت کی مرضی کے مقابلے میں ایک بہت مضبوط اقلیت کی مرضی غیر مؤثر ہو کر رہ جاتی ہے۔ لہٰذا قومی حکومت کا اصول بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ اکثریت کو اقلیت پر اپنی مرضی مسلط کرنے کا حق دیدیا جاتا ہے۔ ایسی مرضی جو ہر لحاظ سے قانون ہوتی ہے، جس کے فیصلوں کے خلاف کوئی اپیل نہیں کی جا سکتی، جس کا بالعموم عقل و انصاف سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔

اسلام نے اپنے حلقہ بگوشوں کو ایک ایسے مستقل مطمحِ نظر سے نوازا جو ہمیشہ ان کے تہذیبی و معاشرتی ارتقا میں صدرنشین رہا۔ اس کی بدولت تیرہ صدی سے

زیادہ عرصہ تک، عروج و زوال کے تمام ادوار میں، مسلمان قوموں نے اپنی روش کو شریعت کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی، حتی الامکان اس کے اوامر کی پابند رہیں اور اپنی نجات کے لیے ہمیشہ اسی قانون کی طرف دیکھا۔ اسلام کے معاشرتی نظام کا ایک اور ثمرہ یہ تھا کہ اقتدار کو وہ سطوت اور اثر و نفوذ حاصل ہوا جس کی نظیر کہیں اور یا تاریخ کے کسی دوسرے دَور میں نہیں ملتی۔ یہ وہ اقتدار تھا جس سے لوگ بیک وقت خوف بھی کھاتے، اُسے عزت و احترام کی نظر سے بھی دیکھتے اور دل و جان سے محبت بھی کرتے تھے۔ وہ محبوب اس لیے تھا کہ شریعت اُس کا موجب تھی؛ چنانچہ اسے بے داغ قانونی جواز حاصل تھا۔ وہ کسی قزاقی یا غضب و نہب کے خیال تک سے آلودہ نہ تھا۔ اُس سے لوگ خوف اس لیے کھاتے تھے کہ وہ ہمہ مقتدر تھا۔ یہ قوت اُس نے اپنے یکسر بے عیب ماخذ سے اخذ کی تھی، نیز اُسے اخلاقی و معاشرتی صداقت کے معیار کی حیثیت حاصل تھی۔ اس کے نام پر غلطیوں اور فروگذاشتوں کا ارتکاب اُسے اُس احترام و اعتماد سے محروم کر دیتا تھا جس سے وہ شریعت کی بدولت بہرہ مند تھا۔ پھر اس کا ازالہ کبھی نہ ہو سکتا۔

ہر دَور میں مسلمان عوام میں یہ احساس برقرار رہا ہے کہ وہ اپنے حکمرانوں کے سامنے میں جس بے انصافی اور استبداد کا شکار ہوتے ہیں، اُس کا سبب نہ تو شریعت کا اقتدار و حکومت ہے اور نہ اس سے مستنبط کیے جانے والے قوانین اور ادارے بلکہ ساری ذمہ داری ان لوگوں پر عاید ہوتی ہے جنہوں نے اقتدار پر زبردستی قبضہ کر لیا اور قانون کے نام پر من مانی کرتے رہے ——— ایسی افراط و تفریط اور بے انصافیوں کا علاج انہوں نے یہ سوچا کہ حکمرانوں کو بدل کر زمامِ اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں دیدی جائے جن سے بادی النظر میں یہ توقع کی جا سکے کہ وہ شریعت

کی بہتر نمائندگی اور قانون کی مؤثر تطبیق کریں گے۔ شریعت نے ہمیں جو ہدایات
دی ہیں ان کی قدر و قیمت تجربے سے ثابت ہو چکی ہے۔ ان کی بدولت مسلمان
معاشرہ اس نسلی و طبقاتی افتراق اور جنگ و جدال سے محفوظ رہا جس نے مغربی
قوموں کو پیہم پریشانی میں مبتلا رکھا ہے۔ عقل و دانش کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ان ہدایات
پر مضبوطی سے قائم رہیں۔ ہمیں اپنے معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی نظام کو وجود
میں لانے اور منضبط کرنے کے لیے لازماً فقہ کی طرف رجوع کرنا ہوگا، جو شریعت
کی اساس پر وضع کی گئی ہے اور اس کی روح اور منشا کی مکمل مظہر ہے۔ ہمیں اس
کے دامن میں مثبت قوانین کے وہ تحفظات ملیں گے جو کسی معاشرہ کو ان تمام
خرابیوں سے محفوظ اور پاک رکھ سکتے ہیں جن میں مغربی معاشرے اور نظام مبتلا ہیں۔

ان سطور سے بلاشبہ مغرب گزیدہ اصحاب چراغ پا ہوں گے۔ مغربی
قوموں کے طور اطوار خصوصاً ان کے معاشرتی نظام سے محبت کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان
قوموں کی مادی خوش حالی سے مسحور ہو چکے ہیں۔ ٹھیک جس طرح مسلمان معاشرہ
کی مادی پستی کا مسید زبوں پاکر وہ بڑے طمطراق کے ساتھ پورے اسلامی نظام سے
اپنی نفرت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ حالانکہ کسی معاشرہ کی مادی خوش حالی فنی وادی
میں اس کی تگ و دو کا حاصل ہوتی ہے۔ اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ اس
معاشرہ کا اجتماعی نظام بھی فائق و برتر ہے۔ بنا بریں کہا جا سکتا ہے کہ مغرب میں
اگرچہ خوش حالی کا دور دورہ ہے، لیکن اس کے معاشرتی احوال کی منزل آج
بھی اصلاح و تکمیل سے بہت دور ہے۔ مغربی اقوام اپنے اجتماعی وجود کی متعلقہ
قدر کو تبدیل کرنے کا تجربہ بار بار کر چکی ہیں، بایں ہمہ اس تجربے کی ضرورت ختم
ہونے نہیں پاتی۔

اس نقطۂ نظر سے معاشرتی ارتقاء تلاش و جستجو اور تحقیق و تجربہ کے تسلسل

کے سوا اور کچھ نہیں ہے جو باعتبار نوعیت ہمیشہ تجربی رہا ہے اور جس کے معیار عمل
میں تعصبات، وقتی ضروریات اور عارضی حالات کار فرما رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ
مغربی معاشرہ اپنے لیے آج تک کوئی مستقل معاشرتی تصور مہیا نہیں کر سکا۔ اس
کا معاشرتی تصور تغیر پذیر جذبات، مادی ضروریات اور فنی معلومات کی پکار پر
پیہم بدلتا رہا ہے۔ چنانچہ یہ تصور، بلکہ صحیح تر الفاظ میں یہ تصورات ارتقائے عام
کی قیادت نہیں کرتے بلکہ خود اس کا اتباع کرتے ہیں۔ اگر معاشرتی نظریہ مستحکم و
متعین نہ ہو اور واقعات سے متاثر ہو کر ہر آن بدلتا رہے اور اگر وہ معاشرتی
ارتقاء کا رخ معین کرنے کے بجائے اس پر انحصار کرے تو اس کا مطلب یہ ہے
کہ وہ نظریہ بالکل کھوکھلا ہے اور اس کی بنیاد فطری، معاشرتی اور اخلاقی سچائیوں
سے محروم ہے۔ ایسا نظریہ نہ تو انسان کی آزادانہ مرضی کا مرہون منت ہوتا ہے اور
نہ انسان کی ذاتی قدر و قیمت کی بنا پر اسے اپناتا، اس کا احترام کرتا اور خوش دلی
کے ساتھ اس کو اپنے اوپر نافذ کرتا ہے۔ اس کے برعکس وہ حکمرانوں کے ایک
گروہ کے مستبدانہ اور من مانے فیصلہ پر مبنی ہوتا ہے۔

کسی معاشرتی نظام کا فقدان اور عدم استحکام اس بات کا صریح ثبوت
ہے کہ وہ معاشرہ کے صرف ایک حصے کو اطمینان بخشتا ہے جب کہ دوسرا حصہ
غیر مطمئن رہتا ہے۔ بالفاظ دیگر وہ ایک طبقے کے لیے تو مفید ہوتا ہے اور دوسرے
کے لیے مضرت رساں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک معاشرتی نظام جتنا زیادہ غیر مستحکم ہوتا
ہے اتنا ہی وہ جابر و متشدد بن جاتا ہے اور اتنی ہی شدت سے اس کی مخالفت
کی جاتی ہے۔ لہٰذا یہ امر اپنے دامن میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ حکمرانی شاہی
خانوادہ کرتا ہے یا کلیسا۔ زمام اختیارات عوام کے ہاتھ میں ہے یا اہل کلیسا کے۔
چند خواص کی حکومت کی جگہ نام نہاد جمہوریت لیتی ہے یا سرمایہ داری کے بجائے

سوشلزم اور کمیونزم تختِ اقتدار بچھاتا ہے۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ بُرائی اپنا لبادہ اور لیبل تبدیل کر لیتی ہے۔ پُرانی خرابیوں اور مظالم کی جگہ نئی خرابیاں اور تازہ ناانصافیاں لے لیتی ہیں، جو خود اپنے وقت پر نئی خرابیوں اور ناانصافیوں کو جنم دیتے ہیں۔ اس طرح یہ شیطانی چکر رواں دواں رہتا اور آنے والی نسلوں کو مصائب میں مبتلا رکھتا ہے۔ لہٰذا ایسا معاشرہ خواہ وقتی طور پر کیسی ہی اقتصادی خوشحالی، طاقت اور مالی بہبود سے بہرہ مند ہو اُس کی راحت و مسرت چند روزہ اور ادھوری ہے، کیونکہ وہ استحکام سے محروم اور حقیقی اخلاقی بہبود سے تہی دامن ہے۔

اگر مغرب زدگی کے حامی کسی مسلمان قوم میں برسرِ اقتدار آ جائیں تو عملاً کیا صورت رونما ہوگی؟ معاشرتی استحکام، جو اسلام کا ایک نہایت امتیازی وصف ہے، اس کی جگہ مغرب میں پائی جانے والی طبقاتی و نسلی رقابت اور نفرت و عداوت لے لے گی۔ وہ انفرادی آزادی اور مساوات کو تباہ کر کے رکھ دیں گے۔ اس ضمن میں اُس قوم کی حالت پہلے سے بھی بدتر ہو جائے گی۔ وہ از سرِ نو اس متاعِ گم گشتہ کی تلاش میں نکلے گی، لیکن دوبارہ نہ پا سکے گی۔ اسلام کی دل پذیر اخوت کی جگہ مغرب کی بے رحم اور صبح کُش نفرت لے لے گی۔ وہ مشترکہ نظریہ جس نے مسلمانوں کو متحد کر رکھا ہے، غائب ہو جائے گا اور خود غرضی اور لوگوں کی وقتی ضروریات سے جنم لینے والے ہر قسم کے گریز پا، غلط اور خیالی نظریات در آئیں گے۔ اس طرح معاشرہ افراد اور طبقات میں منقسم ہو جائے گا اور انہیں ایک دوسرے سے متنفر اور باہم جنگ و جدال کا شکار بنا دے گا۔ پھر جب پانی سر سے گزر جائے گا اُس وقت انہیں پتہ چلے گا کہ قوم کو اخلاقی اور معاشرتی طور پر پراگندہ کرنے اور

معاشرتی انارکی میں دھکیل دینے سے نہ تو اقتصادی خوشحالی اور سیاسی طاقت کا احیاء ہو سکتا ہے اور نہ اُسے غیر ملکی استیلاء سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ عالمِ اسلام جس نسبت سے مغرب زدگی کا شکار ہوگا اُسی نسبت سے اُسے نقصان پہنچے گا۔ یہ تہذیبی و نظریاتی تغیر جس قدر مکمل ہوگا عالمِ اسلام پر اُس کے مضر اثرات اتنے ہی شدید مترتب ہوں گے حتیٰ کہ آخر کار وہ اسے مکمل تباہی سے دوچار کر دیں گے۔

آخر میں مَیں یہ کہوں گا کہ جب مسلمان دانش ورِ مغرب کی نقالی کے متعلق سوچتے اور اُس کے اصولوں سے فیضان حاصل کرتے ہیں تو گویا اپنے واحد نصب العین بلکہ مقصدِ وجود ہی کو پسِ پُشت ڈال دیتے ہیں۔ ان کا مقصدِ وجود یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی میں اسلامی اقدار کی ٹھیک ٹھیک اور بدرجہ اتم نمائندگی کریں۔ انہیں حتی الامکان اس طرح اپنانا ہی کہ اغیار سے رہنمائی حاصل کرنے کے بجائے اپنی رہنمائی آپ کریں اور دوسروں کی تقلید کرنے کے بجائے خود نمونہ بنیں۔"

کاہیوں کے زیرِ سایہ ترکی جس الم ناک انجام سے دوچار ہوا، اُسے اگر نظر میں رکھا جائے تو مندرجہ بالا اقتباس کی شدت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ شہزادہ سعید حلیم پاشا نے عالمِ اسلام میں مغرب زدگی کے خطرناک نتائج کے متعلق جو پیشین گوئیاں کی تھیں وہ سب کی سب آج دردناک حقیقت بن کر سامنے آ چکی ہیں۔ اگر مسلمانوں کا سانام رکھنے والے حکمرانوں نے ان حکیمانہ باتوں پر دھیان دیا ہوتا تو ان کے ممالک آج جس معاشرتی انتشار اور اخلاقی بدعنوانی کا شکار ہو رہے ہیں اُس سے بچ سکتے تھے۔

بدیع الزّماں سعید نورسی

اسلامی تاریخ کے ہر دَور میں ایسے عظیم مصلح پیدا ہوتے ہیں جنہوں نے تجدید و احیائے اسلام کی جدّوجہد کی۔ ترکی کے بدیع الزماں سعید نورسی ایسے ہی ایک مجدّد تھے جنہیں اللہ تعالےٰ نے مصطفےٰ کمال اتاترک کے بدنام عہدِ حکومت کے مروجہ مفاسد اور بُرائیوں سے لڑنے کے لیے مسلمانوں کو عطا کیا۔ اس امر کو مرے کئی عشرے ہو رہے ہیں، لیکن نورسی کی تحریک احیائے دین آج بھی زندہ ہے۔ ان کے پیروکاروں میں بسرعت اضافہ ہو رہا ہے۔ وہ ہر طرح کی رکاوٹوں اور مزاحمتوں کے علی الرغم اسلامی نشاۃِ ثانیہ کی جدّوجہد میں مصروف ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ تمام باامن ذرائع سے کام لے رہے ہیں اور ادب، تحریر و تصنیف، تعلیم اور دوسرے میدانوں میں بڑی سرگرمی سے تگ و دو کر رہے ہیں۔

بدیع الزماں صوبۂ بطلیس میں ضلع ہزان کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ۱۸۷۲ء میں پیدا ہوئے۔ وہ نسلاً کُرد تھے۔ ماں اور باپ دونوں طرف سے ان کا سلسلۂ نسب کُردوں کے ایک قدیم ممتاز خاندان سے جا ملتا ہے۔ نو برس کے تھے کہ اُن کے بڑے بھائی نے انہیں گاؤں کے مکتب میں بٹھایا۔ چند سال بعد وہ اعلیٰ تعلیم کی طلب میں اپنے مولد سے نکل کھڑے ہوتے، اُس عہد کے متعدد بڑے بڑے علمی مراکز میں پہنچے اور فیض یاب ہوئے۔ تھوڑی ہی مدّت میں

قرآنِ کریم، فقہ اسلامی، خطابت، فلسفہ، تاریخ، جغرافیہ اور دیگر علوم وفنون پر عبور حاصل کر لیا۔
اللہ نے انہیں غیر معمولی قوتِ حافظہ دی تھی، چنانچہ قرآن مجید کے علاوہ لغت اور اسلامی قانون
کی متعدد کتابیں از بر تھیں۔ بچپن ہی سے انہیں علومِ طبیعی کی ضرورت واہمیت کا احساس تھا، چنانچہ
اپنی مصروف زندگی کے ہر مرحلے میں ان علوم میں روز افزوں دلچسپی لیتے رہے۔ انہوں نے مختصر
سی مدت میں ریاضی، حیاتیات اور بعض غیر ملکی زبانوں میں استعداد بہم پہنچائی۔ رسائل وجرائد میں
ان کی حیرت انگیز قابلیت اور علم وفضل کا زبردست چرچا تھا۔ وہ سیاست میں شروع ہی سے
دلچسپی رکھتے تھے اور روزانہ ہر صبح اخبارات کا باقاعدہ مطالعہ کرتے تھے۔ ان کی زندگی بڑی سادہ،
راست بازانہ اور منضبط تھی۔ مشتبہ امور سے کلیتہً مجتنب رہتے اور اس باب میں رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر عمل پیرا تھے کہ "اگر تمہیں کسی معاملے میں کوئی اشتباہ پیدا ہو تو اُسے چھوڑ
دو اور وہ کام کرو جو شک وشبہ سے پاک ہو۔" چنانچہ جب بھی کسی بے ڈھب اور خطرناک صورتِ
حال سے دوچار ہوتے تو رہنمائی حاصل کرنے کے لیے قرآن مجید اور احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کی طرف رجوع کرتے۔ مشتبہ غذا سے اجتناب میں بڑا اہتمام کرتے تھے۔ ترکاریاں حتیٰ کہ
گھاس بھی کھا لیتے، لیکن مشتبہ کھانے کو ہاتھ نہ لگاتے۔ معمول تھا کہ اپنا کچھ کھانا چیونٹیوں کو ضرور
ڈالتے۔ جب وجہ دریافت کی گئی تو کہا، یہ خراجِ عقیدت ہے جو میں اس ننھی سی مخلوق کو اس کی
حیرت انگیز تنظیم اور جمہوری رُوح کی بنا پر پیش کرتا ہوں۔"

ایک روز ان کی توجہ برطانیہ کے وزیر نوآبادیات کے ایک بیان کی طرف مبذول کرائی
گئی۔ اُس نے کہا تھا: جب تک مسلمانوں کے پاس قرآن موجود ہے وہ ہمارے راستے میں مزاحم
رہیں گے اس لیے ہمیں قرآن کو اُن کی زندگی سے خارج کر دینا چاہیے۔ بدیع الزمان نے اپنے
رفقاء سے کہا: "میں اپنی زندگی اللہ کے نام پر قرآنِ کریم کی تبلیغ واشاعت کے لیے وقف کرتا
ہوں۔ برطانوی وزیر کے ناپاک عزائم جیسے کچھ بھی ہوں میں اپنی زندگی کو خطرات میں ڈال دینے
سے بھی گریز نہ کروں گا۔"

اس عزم واعلان کے بعد وہ استنبول چلے گئے اور قاہرہ کی جامعہ الازہر کے خطوط پر زہرا
یونیورسٹی قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ حُسنِ اتفاق سے اُسی زمانے میں جامعہ ازہر کے شیخ استنبول گئے۔
دونوں دینی رہنما متعدد مرتبہ آپس میں ملے اور اسلامی امور پر طویل گفتگو ہوتی رہی۔

۱۹۰۸ء میں جب نوجوان ترکوں نے سلطان عبدالحمید ثانی کو معزول کر دیا تو بدیع الزمان
کی مڈھ بھیڑ ایک سیاسی تنظیم مجلس اتحاد وترقی سے ہوئی۔ اس جماعت نے اگرچہ مشہور کر رکھا
تھا کہ وہ ایک مذہبی جماعت ہے، لیکن درحقیقت ان کی قیادت فری میسنوں Freemasons
کے ہاتھوں میں تھی۔ بدیع الزمان نے بلا تاخیر اس چیلنج کو قبول کر لیا، جوابی تحریک شروع کی اور اتحادِ
محمدی کے نام سے ایک نئی سیاسی جماعت قائم کی۔ اس جماعت کے نعرے بھی وہی اتحاد، آزادی
اور اصلاحات تھے جو مجلس اتحاد وترقی نے اپنا رکھے تھے، لیکن فرق یہ تھا کہ اتحادِ محمدی کی پالیسی،
پروگرام اور مقاصد اسلام کے قانون اور نظریے کے عین مطابق تھے۔ انہوں نے اپنی دعوت کو فروغ
دینے کے لیے مضامین لکھے۔ لوگوں کو قرآنِ کریم کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے اور اُسے نہ چھوڑنے
کی تاکید کی۔ انہوں نے متنبہ کیا کہ قرآن کے نظامِ حیات کو چھوڑ کر کوئی دوسرا نظامِ زندگی اختیار کر
لیا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ مغرب کی غلامی قبول کر لی گئی ہے۔ پھر ترک صرف برائے نام تُرک رہ
جائیں گے۔

مجلس اتحاد وترقی کے رہنما اس تحریک کو برداشت نہ کر سکے اور مارچ ۱۹۱۹ء میں بدیع الزمان
کو گرفتار کر لیا۔ ان کے ۱۵ رفیق پھانسی پر لٹکا دیئے گئے۔ جس عدالت نے ان لوگوں کو سزائے
موت دی اُسی نے بدیع الزمان کے مقدمے کی سماعت کی۔ پندرہ رفقاء کو سزائے موت
دینے کا اعلان کرنے کے بعد جج خورشید پاشا بدیع الزمان کی طرف متوجہ ہوا اور پوچھا: "کیا تم
بھی اسلامی قوانین کا نفاذ چاہتے ہو؟" بدیع الزمان کا جواب عزیمت کا آئینہ دار تھا: "اگر
مجھے ایک ہزار زندگیاں بھی مل جائیں تو میں انہیں اسلام کی خاطر بصد مسرت قربان کر دوں گا۔
میں ہر اس چیز کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہوں جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ علاوہ میں عالم

برزخ میں سفرِ آخرت کے لیے پابرکاب کھڑا ہوں، مَیں اپنے ان ساتھیوں کے ساتھ جا ملنا چاہتا ہوں جو پھانسی پاکر تمہارے ظلم و ستم سے نجات پا چکے ہیں۔ مَیں آخرت کی زندگی کے لیے بے تاب ہوں۔ ذرا اُس دیہاتی کا تصوّر کرو جو استنبول کی عیش و عشرت اور شان و شوکت کی داستانیں زندگی بھر سنتا رہا ہو، لیکن اُسے دیکھنے کا موقعہ نصیب نہ ہوا ہو، اُس کی ذہنی کیفیت کیسی ہوگی؟ ٹھیک وہی میری حالت ہے۔ اسی سے تم آخرت کی زندگی سے ہمکنار ہونے کے لیے میری بے تابی اور بے قراری کا اندازہ کر سکتے ہو۔ مجھ پر الزام ہے کہ مَیں نے دہریوں، ملحدوں اور اُن کے اجیر صحافیوں پر سخت تنقید کی ہے۔ مَیں اب بھی یہ کہتا ہوں کہ جس طرح ایک مُجرم کا لبادہ کسی آبرومند شریف انسان کو زیب نہیں دیتا اسی طرح یورپ کی ثقافت اور نظامِ حیات استنبول کے لوگوں کے لیے زیبا نہیں ہے۔ العظمة لله و الفتح للاسلام۔

بدیع الزمان پر مقدمہ چلایا گیا، لیکن عوام کے زبردست احتجاج پر فوجی عدالت نے انہیں جلد ہی بری کر دیا۔

کچھ مدّت استنبول میں مقیم رہنے کے بعد وہ دمشق چلے گئے۔ وہاں مسجدِ اموی میں فاضل علماء کے زبردست اجتماع میں ایک جوش انگیز تقریر کی اور ان امراض کی تشخیص کی جن میں عالمِ نَو بالعموم اور عالمِ اسلام بالخصوص مبتلا تھا۔ اپنی اس تقریر میں انہوں نے خاص طور پر مندرجہ ذیل امور پر روشنی ڈالی۔

۱۔ قنوطیت کا دَور دورہ۔

۲۔ معاشرتی اور سیاسی معاملات میں دیانت کا فقدان۔

۳۔ محبت کی جگہ عداوت کا ظہور۔

۴۔ افتراق بین المسلمین۔

۵۔ کلیت پسندانہ استبداد میں اضافہ۔

۶۔ خود غرضی اور انانیت۔

بدیع الزماں نے عربوں اور ترکوں کے اتحاد پر زور دیا اور کہا کہ اسلامی نشاۃِ ثانیہ کا دارومدار اسی اتحاد پر ہے۔ انہوں نے بڑے یقین افروز انداز میں فرمایا کہ اگر مسلمانوں نے سرتوڑ جدوجہد کی تو اسلامی تہذیب مغربی ثقافت کو پسپا کر دے گی، کیونکہ مؤخرالذکر ثقافت انسان کے سفلی جذبات، باہمی افتراق اور ہدایتِ الٰہی کے فقدان سے عبارت اور فطرۃً سخت فساد انگیز ہے۔

سفرِ دمشق کے بعد بدیع الزماں دینی و دنیوی تعلیم کی ہم آہنگی پر مبنی ایک نئی اسلامی یونیورسٹی کی تاسیس میں ہمہ تن لگ گئے۔ اپنا وقت اور صلاحیتیں اس مقصد کی راہ میں جھونک دیں، لیکن جنگِ عظیم چھڑ گئی اور یہ کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

پہلی جنگِ عظیم چھڑی تو بدیع الزماں ترکی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ انہوں نے مختلف میدانوں میں بہادری اور سرفروشی کے نمایاں کارنامے انجام دیئے، چنانچہ جلد ہی ترقی دے دے کر انہیں افسر بنا دیا گیا۔ بدیع الزمان اپنے کیمپ میں قرآنِ مجید کے مختلف پہلوؤں پر درس دیا کرتے جس کو سننے کے لیے سینکڑوں سپاہی امڈ آتے۔ ایک جنگ میں ان کی بٹالین کے تقریباً تمام جوان شہید ہو گئے۔ وہ اپنے تین چار ساتھیوں کے ہمراہ دشمن کی صفوں کو چیرتے ہوئے ایک نہر میں چھپ گئے۔ ان کی ایک ٹانگ ٹوٹ چکی تھی، بایں ہمہ وہ ۳۰ گھنٹے تک رائفلیں ہاتھوں میں لیے ڈٹے رہے۔ آخر کار رُوسیوں نے انہیں گرفتار کر لیا۔

ایک روز روسی جنرل نکولاس نے جنگی قیدیوں کے کیمپ کا دَورہ کیا۔ جونہی وہ پہنچا سارے قیدی اُچھل کر کھڑے ہو گئے اور اُسے سلامی دی، لیکن بدیع الزمان نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کی۔ جنرل نے پوچھا:

"کیا تم جانتے ہو، مَیں کون ہوں؟"

بدیع الزماں نے بڑی بے نیازی سے جواب دیا:

"ہاں، مَیں خوب جانتا ہوں، تم نکولاس نکولاوش ہو، لیکن تم جو کچھ بھی ہو، مجھے کیا!

یَیں ایک مسلمان ہوں ۔ میرے نزدیک مسلمان کافر سے برتر و فائق ہے ۔ یَیں خدائے واحد کا پرستار ہوں ، تمہاری تعظیم و تکریم نہیں کر سکتا ۔ "

بدیع الزمان کا فوراً کورٹ مارشل ہوا ۔ فوجی عدالت نے سزائے موت دینے کا حکم دیا ۔ جب روسی انہیں گولی مارنے کے لیے لے گئے تو انہوں نے درخواست کی کہ پہلے مجھے دو رکعت نماز پڑھنے کی اجازت دی جائے ۔ ان کے بعض دوستوں نے بہت کہا کہ وہ روسی جنرل سے معافی مانگ لیں ، لیکن اُن کا صرف ایک جواب تھا : "شاید یہ سزا مجھے ابدی جنّت میں پہنچا دے ــــ "

آخر روسی جنرل ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے معذرت چاہی : "براہِ کرم مجھے معاف کر دیجیے ۔" اُس نے کہا ۔ "میں آپ کی جرأت اور اپنے مذہب کے ساتھ مخلصانہ وابستگی سے بے حد متاثر ہوا ہوں ؛ چنانچہ آپ کی سزا منسوخ کی جاتی ہے ۔"

بدیع الزمان ڈھائی برس تک سائبیریا میں مقید رہے ۔ پھر فرار ہو گئے اور پیٹرز برگ ، وارسا اور ویانا کے راستے استنبول پہنچ گئے جہاں علماء و مشائخ اور عامۃ المسلمین نے ان کا پُرجوش استقبال کیا ۔ ۱۹۲۰ء میں ترکی میں انقلاب آیا تو مصطفٰے کمال آتا ترک نے انہیں انقرہ آنے اور یوم استقلال کی تقریب میں شریک ہونے کی دعوت دی ۔ بدیع الزّماں انقرہ پہنچے ، لیکن یہ دیکھ کر سخت دل شکستہ ہوئے کہ مصطفٰے کمال میں ایمان و کردار کا شائبہ تک نہیں ؛ چنانچہ تقریبِ آزادی میں شرکت کیے بغیر انقرہ سے چلے گئے ۔ بایں ہمہ دس نکات پر مشتمل ایک بیان پارلیمنٹ کو بھیجا جس کا اجلاس مصطفٰے کمال کی صدارت میں ہو رہا تھا ۔ بیان میں کہا گیا تھا :

"پارلیمنٹ کے ارکان ، اُس دن کو یاد کرو جب تم روزِ جزا کے مالک ، اللہ کے حضور پیش کیے جاؤ گے ۔ اغیار کو شکستِ فاش دے کر جو نیکنامی تم نے حاصل کی ہے ، اُسے اپنی بداعمالیوں اور نفس کی بدکاریوں سے ملیامیٹ نہ

کرو ۔ اگر تم مغربی قوموں اور غیر اسلامی طور اطوار کی نقالی کو ترجیح دو گے تو عالمِ اسلام اپنی مدد اور حمایت کے لیے دوسروں کی طرف دیکھنے لگے گا ــــ "

بیان کاظم پاشا نے پارلیمنٹ میں پڑھ کر سنایا جس کا معجزہ نما اثر ہوا ۔ تقریباً ایک سو ساٹھ ارکان نے وہیں بیک آواز اسلامی زندگی بسر کرنے اور پنجگانہ نماز باقاعدہ پڑھنے کا حلف اٹھایا ۔ اِس صورتِ حال سے مصطفٰے کمال سخت جھنجلایا ، اُس نے بدیع الزماں کو بُلا بھیجا اور کہا : "ہمیں ایک قائد کی حیثیت سے آپ پر فخر ہے ، لیکن آپ نے آغازِ کار ہی میں نماز کی اہمیت پر زور دے کر قوم میں افتراق پیدا کر دیا ہے ۔" بدیع الزّماں نے سختی سے سرزنش کی :
"پاشا ، نماز پہلی علامت ہے جس سے ایک مسلمان پہچانا جاتا ہے اور تم اسی کے منکر ہو ۔ نماز کا منکر اللہ کا باغی ہے ، بنابریں تمہاری حکومت ناقابلِ قبول ہے ۔"

مصطفٰے کمال نے تحریص کا دام پھینکا ۔ بدیع الزّمان کو مطمئن کرنے کے لیے اس سے بڑا حربہ اور کیا ہو سکتا ہے ؟ اُس نے سوچا ؛ چنانچہ انہیں اناطولیہ کا میر واعظ اور دارالحکمت یونیورسٹی کی مجلسِ عاملہ کا رکن نامزد کر دیا ۔ رہائش کے لیے ایک عالیشان عمارت دی ، لیکن بدیع الزمان نے ان سب چیزوں کو ٹھکرا دیا ، انقرہ سے نکل گئے اور وان کے نزدیک گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے لگے ۔ یہاں انہوں نے گرد و نواح کے نوجوانوں کو جمع کر لیا اور انہیں قرآن کی تعلیم دینے لگے ۔ ان کا اندازِ تعلیم بے حد موثر تھا ۔ پہلے معانی بیان کرتے ، پھر ان کے دقیق مطالب و مفہوم واضح کرتے ، آیات کی فصاحت و بلاغت اور دِل کشی کی نشان دہی کرتے اور دنیوی و اخروی زندگی کے سلسلے میں ان کی روحانی ، مادّی اور فکری اہمیت پر خاص زور دیتے ۔ انہوں نے ان لوگوں پر فطرت کے اسرار اور ان مختلف طاقتوں کو بالوضاحت آشکارا کیا جو انسان کی دسترس میں ہیں اور اگر کتاب و سُنّت کے مطابق فطری ، راست باز اور سادہ زندگی بسر کی جائے تو ان سے بہرہ اندوز ہوا جا سکتا ہے ۔

جلد ہی حکومت نے انہیں اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا ۔ بدیع الزّمان کو آٹھ

سال کے لیے بارلا جیل بھیج دیا گیا۔ یہ سارا عرصہ انہوں نے کڑے پہرے میں قیدِ تنہائی میں گزارا کسی دوست کو ملنے کی اجازت دی گئی نہ اعزہ واقارب کو۔ وہ خود کھانا پکاتے تھے اور کپڑے دھوتے تھے۔ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ جیل کے پہریدار ان سے متاثر ہوتے گئے اور آخر ان کے پُرجوش مرید بن گئے۔ یہیں انہوں نے قرآن کی تفسیر "رسالۂ نور" کے عنوان سے لکھنا شروع کی۔ پہرے داروں کے ذریعے یہ رسائل جیل کی چاردیواری سے باہر پہنچتے، جن لوگوں کو ملتے اپنے ہاتھ سے ان کی نقلیں تیار کرتے اور وسیع حلقے میں پھیلاتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں قلمی پمفلٹ دیہات، قصبات، شہروں، سکولوں، کالجوں اور سرکاری دفاتر میں پہنچ گئے۔ تنہائی کے ان سالوں کا ذکر کرتے ہوئے بدیع الزمان نے کہا: "جلاوطنی، قید وبند اور قیدِ تنہائی کے ان مصائب وشدائد میں مجھے قرآنِ حکیم کی صداقت پر غور وفکر کرنے اور اللہ کی رحمت سے اپنا دامن بھرنے کا موقع ملا۔"

سات سال کے بعد رہا ہوئے تو اسپارٹا چلے گئے اور وہاں کچھ مدت تک تن تنہا رہے۔ یہاں تک کہ انہیں ۱۲۰ مریدوں کے ساتھ دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ الزام یہ تھا کہ ان لوگوں نے حکومت کا تختہ اُلٹنے کی سازش کی ہے۔ ایسکی شہر کی فوجداری عدالت میں ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ بدیع الزمان نے اپنے بیان میں کہا:

"میری دلیل یہ ہے کہ کسی تحریک کی کامیابی کے امکان کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ فی الحقیقت کامیاب ہو چکی ہے یا حکومت کا تختہ اُلٹ دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر دیا سلائی سے کسی مکان کے جلنے کا امکان ہے، لیکن جب تک مکان کو آگ نہیں لگتی مجھے آتش زنی کا مجرم نہیں گردانا جا سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ میں حکومت واقتدار کی زمام اپنے ہاتھ میں لینے کا خواہشمند نہیں، میں تو لوگوں کو اللہ کے راستے پر چلانا چاہتا ہوں۔ ہمارا رہنما قرآن مجید ہے، ہمارے ہادی رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور ہمارا قانون شریعت

مطہرہ ہے ——— ہماری کوئی تنظیم نہیں ہے اور نہ ہم کسی سیاسی سرگرمی میں مصروف ہیں۔ ہمارا رسالۂ نور یقین وایمان کا ایک مدرسہ ہے۔ اس مدرسہ کی عمارت ہے نہ لائحہ عمل، تنظیم ہے نہ مالیات، منتظم ہیں نہ آجر اور اجیر یہ صرف دلوں کی جمعیت ہے، اس کی درسی کتاب قرآن مجید اور اس کی تشریح وتفسیر پر مبنی رسائلِ نور ہیں۔ یہ مدرسہ زمان ومکان کی حدود سے بالا ہے اور ہر مخلص مسلمان اس کا رکن ہے۔ وکیل استغاثہ کے اندازہ کے مطابق ۱۹۴۷ء میں سارے اناطولیہ میں کم از کم پانچ چھ لاکھ افراد رسالۂ نور کے باقاعدہ قاری ہیں۔ یہ سب لوگ ——— مزدور، طلبہ، اساتذہ اور سرکاری ملازم ——— ایثار روزمرہ کا کام بڑی مستعدی سے کرتے ہیں۔ ان میں سے آج تک ایک شخص سے بھی کسی عام بدنظمی میں حصہ لینے کا قصور سرزد نہیں ہوا۔ کسی نے قانون کی خلاف ورزی نہیں کی، لہٰذا ایسا مدرسہ جو ترک عوام کی اس قدر بھاری تعداد کے دلوں میں قائم ہے، کیا اُسے کبھی بند کیا جا سکتا ہے؟ آپ کہتے ہیں، میں جو کچھ کر رہا ہوں اُسے حکومت کی منظوری حاصل نہیں ہے، نیز اس مقصد کے لیے حکومت نے ایک شعبہ قائم کر رکھا ہے اور مجھے اس کام کے لیے حکومت سے لائسنس حاصل کرنا چاہیے۔ چہ خوب، اللہ تعالیٰ کے احکام پر چلنے کے لیے لائسنس لیا جاتے؟ کیا تم قبرستان بند کر کے موت کو ابد الآباد تک روک سکتے ہو؟ تم مجھے ہیٹ نہ پہننے پر مطعون کرتے ہو، لیکن تمہارا حال یہ ہے کہ معزز عدالت کے احترام میں اسے سر سے اُتار لیتے ہو۔ یاد رکھو، صرف چند لوگ ہیں جنہوں نے اس لعنت کو برضا ورغبت اپنے سر پر اوڑھا ہے، ورنہ لاکھوں آدمی ظلم وجبر کے بل پر مجبور کر دیے گئے ہیں۔ ماسونیوں (Freemason) کو اسلام پر حملے کرنے کی مکمل اجازت ہے، مغربی ثقافت کو مقبول عام کرنے کے لیے سرکاری

طور پر شراب خوری، قمار بازی اور زناکاری کی حوصلہ افزائی کی جارہی ہے۔ یہ سب کچھ نہ تو حکومت کے لیے خطرناک ہے نہ مؤثر ہو سکتی، البتہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو قرآن کے پیغام کی تبلیغ واشاعت اور اللہ کا کام کرنے سے روکنا نہایت ضروری ہے۔

مجھ پر جمہوریت کے خلاف بغاوت کا الزام عائد کیا گیا ہے، حالانکہ میں ایامِ طفلی ہی سے اس کا نقیب وداعی رہا ہوں۔ میں اپنا کچھ کھانا پیونٹیوں کے آگے جو ناغہ ڈالتا ہوں، اس لیے کہ میں ان کے جمہوری نظام کا مداح ہوں۔ میرا ایک جرم یہ بھی ہے کہ میں صوفی ہوں، حالانکہ انسان صوفی بنے بغیر تو جنت میں داخل ہو سکتا ہے، لیکن اللہ پر ایمان لاتے اور اُس کے قوانین کی پابندی کیے بغیر آخرت کی اس مسرت بخش زندگی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔ گزشتہ تیس برس میں تین حکومتیں، دو عدالتیں، حتیٰ کہ خود مصطفےٰ کمال میری زندگی کی چھان بین کر چکے ہیں، لیکن میری ادنیٰ سی کمزوری بھی ان کے ہاتھ نہیں لگ سکی۔ دشمنِ ریاست ہونے کا الزام تو بہت بڑی بات ہے۔ لہٰذا مجھے اپنا مشن پُرامن طریقے سے جاری رکھنے کی اجازت ہونی چاہیئے ——"

چند سال بعد بدیع الزّماں پر افیون کی عدالتِ عالیہ میں پھر مقدمہ چلایا گیا۔ وہی پرانا الزام۔ ریاست کے خلاف بغاوت تھا، لیکن جلد ہی عدالتِ عالیہ نے اس الزام کو بے بنیاد قرار دے دیا۔ کیا کوئی شخص یہ گمان کر سکتا ہے کہ میرے پیشِ نظر مفاد پرستی اور خود غرضی کے سوا کچھ نہیں ہے اور میں اللہ کا کام اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لیے کر رہا ہوں؟ میں نوّے برس کا ہو چکا ہوں اور قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں۔ میرے پاس نہ تو دولت ہے اور نہ میں نے کوئی جائیداد بنائی ہے۔ میری ساری زندگی جنگ کے میدانوں، جنگی قیدیوں کے کیمپوں، جیل خانوں اور عدالتوں میں پے در پے پریشانیاں جھیلتے ہوئے گزری ہے۔ مجھے دنیاوی مسرّتوں سے کیا سروکار ہو سکتا ہے؟ مجھے شہر بشہر گشت کرا دیا گیا، اپنے خاندان اور احباب

سے ساتھ ملنے جلنے سے روک دیا گیا۔ ایسی زندگی پر تو ایک عام انسان موت کو ترجیح دیتا ہے، لیکن میں مسلمان ہوں اور اپنے دین پر ایمانِ محکم رکھتا ہوں، رسائلِ نور لکھ کر میں نے پانچ لاکھ مسلمانوں کو عذابِ آخرت سے بچا لیا ہے جس پر اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ میں جنت کا مشتاق ہوں نہ جہنم سے خوف کھاتا ہوں۔ اگر زمین قرآن کے ماننے والوں سے خالی ہو تو میں جنت میں رہ کر بھی مضطرب اور پریشان رہوں گا۔ اس کے برعکس اگر میں دیکھوں کہ میرے ملک میں دینِ حق محفوظ وسلامت ہے تو آتشِ جہنم میں جلتے ہوئے بھی میں مسرور وشاداں رہوں گا۔

یہ ایک معروف قانونی اصول ہے کہ کسی شخص کو ایک ہی جرم میں دو بار سزا نہیں دی جا سکتی، چنانچہ بعض ججوں اور اکثر وکلاء کو اس مقدمے کے جواز کے بارے شک ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ شدید حفاظتی اقدامات کے باوجود وہی جج جنہوں نے میرے مقدمہ کی سماعت کی تھی، میرے مداح اور میرے مشن کے حامی بن گئے۔

لیکن جیسا کہ کلیت پسند آمریتوں کا خاصہ ہوتا ہے کمالیوں کی ظالم لادینی حکومت کے لیے اللہ تعالیٰ کی وفاداری کا جذبہ ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ جو پروگرام لے کر اٹھی تھی اور جو مقاصد اپنے سامنے رکھتی تھی، یہ جذبہ اُس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا، چنانچہ وہ بدیع الزماں کو آزادی اور دعوتِ دین کی اشاعت وتبلیغ سے محروم کر دینے پر تُلی ہوئی تھی۔ آخرکار مقدمہ عدالتِ مرافعہ کو بھیج دیا گیا، جہاں وہ اگلے بیس ماہ تک زیرِ سماعت رہا۔ اس اثناء میں یہ بوڑھا مجاہد اسپارٹا کے جیل میں پڑا سڑتا رہا۔

وفات سے صرف دو مہینے پہلے بدیع الزمان اجازتِ خصوصی سے پہلے انقرہ گئے اور پھر استنبول۔ جہاں لوگوں نے ان کا والہانہ استقبال کیا۔ اخبارات کا رویہ بھی گرم جوش تھا۔ پہلے صفحے پر ان کی تصویر شائع کی جس میں انہوں نے عمامہ باندھ رکھا تھا، لیکن ماسونی اور یساری (leftist) عناصر ان پر پوری سفاکی سے ٹوٹ پڑے، چنانچہ انہیں دوبارہ حوالۂ زنداں کر دیا گیا۔

وسطِ رمضان میں وہ اچانک شدید بیمار ہو گئے۔ اپنے دو شاگردوں سے کہا کہ انہیں خفیہ طور پر اُڑ نا لے جائیں، جہاں وہ ۲۷ر رمضان ۱۳۰۹ھ کو وفات پا گئے۔ انتقال کے وقت ۵۶ برس کے تھے۔ اس طرح اسلام کی راہ میں جلاوطنی اور قید و بند کے مصائب سہتے ہوئے بدیع الزمان کی مجاہدانہ زندگی ختم ہو گئی۔ وہ زندگی جو ہمیشہ قرآنِ کریم کے اس ارشاد پر عمل پیرا تھی:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (المائدہ ۵:۳۵)

"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کے حضور میں باریابی کا ذریعہ تلاش کرو اور اس کی راہ میں جدوجہد کرو شاید کہ تم کامیابی سے ہمکنار ہو جاؤ۔"

سیّد جمال الدّین افغانی رحمۃ اللہ علیہ

اتحادِ عالمِ اسلامی کے معمار

غالباً جمال الدین افغانی رحؒ سے بڑھ کر عالمِ اسلام کی کسی شخصیت نے معاصر تاریخ پر اثر نہیں ڈالا۔ وہ ۱۸۳۹ء میں افغانستان کے شہر اسد آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مقامی مسجد کے مکتب میں پائی۔ ذرا بڑے ہوئے تو افغانستان اور ایران میں فاضل اساتذہ کے آگے زانوئے ادب تہ کیا۔ اٹھارہ برس کی عمر تک تمام علومِ اسلامی میں دستگاہ حاصل کر لی۔ ہندوستان میں بھی وہ ڈیڑھ برس رہے۔ یہاں انہوں نے کچھ انگریزی بھی پڑھی اور مغربی علوم کا مطالعہ بھی کیا۔ ۱۸۵۵ء میں وہ حج کرنے مکہ معظمہ گئے۔ پھر اپنے وطن واپس چلے آئے اور کئی سال تک مقیم رہے، حتیٰ کہ ناسازگار سیاسی حالات نے وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

افغانی رحؒ کی زندگی کا اہم ترین دور وہ ہے جو انہوں نے قاہرہ میں گزارا۔ یہاں وہ جامعہ الازہر میں پڑھاتے بھی تھے اور طلبہ اور اساتذہ کے ساتھ مختلف موضوعات پر بحث مباحثہ اور تبادلۂ خیال بھی کرتے تھے۔ فلسفۂ دینی کو اپنا کر احیائے اسلامی کا کام کیونکر انجام دیا جا سکتا ہے؟ جدید تعلیم خصوصاً طبعی علوم کی تحصیل ضروری ہے اور معاصر علم اور قرآنِ کریم کی تعلیمات میں کوئی تصادم نہیں ہے۔ سب سے بڑھ کر ان کا موضوعِ بحث یہ تھا کہ عالمِ اسلام کی سیاسی آزادی کو مغربی جہانگیری کے خطرے سے محفوظ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان ایک مضبوط قیادت

کے پرچم تلے متحد و مجتمع ہوں۔ افغانی کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اسلام کی "حقیقی رُوح" اُس کے متحرک کردار "جدید تصورات" کو جذب کرنے کے اشتیاق اور اسلامی نظریات کی لبرل تعبیر اور انہیں جدید افکار کے ساتھ ہم آہنگ کرنے میں پوشیدہ ہے۔ افغانی رح اپنے خطبات میں عالم اسلام کے شاندار ماضی، اس کی عظیم سیاسی بالادستی، مادّی آب و تاب اور ثقافتی و فکری کارناموں پر مفصّل بحث کرتے۔ اس طرح اپنے شاگردوں میں یہ احساس پیدا کرنے کی کوشش کرتے کہ اسلامی اصولوں کی پیروی کا لازمی نتیجہ دنیا اور آخرت میں خوش حالی اور کامیابی کی صورت میں نکلے گا۔ الازہر ہی میں اُن کی مُلاقات شیخ محمد عبدہ سے ہوئی جو ان کے ممتاز ترین شاگرد اور معاون ثابت ہوئے اور آگے چل کر جامع کے شیخ اور مصر کے مفتی بنے۔ اس طرح ملک کے ایک اہم ترین منصب پر فائز ہو گئے۔

افغانی رح کے انقلابی نظریات ہی کچھ کم خطرناک نہ تھے۔ اس پر مزید یہ کہ وہ برطانوی سامراجیت کے سخت مخالف تھے؛ چنانچہ مصر کے حکمران توفیق پاشا نے ۱۸۷۹ء میں انہیں ملک سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ مصر سے اخراج کے بعد وہ ہندوستان گئے اور حیدر آباد دکن میں مقیم ہو گئے۔ یہیں انہوں نے اپنی کتاب "ابطال المطمدین" لکھی۔ افغانیؒ اگرچہ جدید علوم کی تحصیل کے زبردست حامی تھے؛ تاہم سرسید احمد خاں کی اسلام کو فوق الفطرت تصورات سے محروم کر دینے کی مساعی اور برطانیہ کے ساتھ اشتراک و تعاون کی روش کے سخت مخالف تھے۔ انہوں نے سرسید کی اس روش اور ان کے افکار و نظریات پر شدید تنقید کی۔

۱۸۸۴ء میں جمال الدین افغانی رح پیرس میں مقیم تھے کہ ان کے شاگرد اور ساتھی شیخ محمد عبدہ بھی پہنچ گئے۔ انہیں عرب قوم پرستوں کی بغاوت کے ساتھ ہمدردی کے جرم میں مصر سے نکال دیا گیا تھا۔ اب استاد اور شاگرد دونوں نے مل کر عربی کا مشہور ہفت روزہ اخبار "العروۃ الوثقیٰ" نکالا۔ اخبار کا مقصد تمام مسلمان قوموں کو بیدار کرنا اور مغربی غلبے اور استیلاء کے خلاف متحد کرنا تھا۔ برطانوی حکومت نے مصر اور ہندوستان میں "العروۃ الوثقیٰ" کا داخلہ بند کر دیا اور جن لوگوں کے پاس یہ اخبار آتا تھا، ان کے خلاف شدید اقدامات کیے۔ چونکہ اخبار کے زیادہ تر خریدار انہی دو ملکوں میں تھے اس لیے اس کی اشاعت جاری نہ رہ سکی اور بند ہو گیا؛ تاہم بند ہونے سے پہلے وہ عالم اسلام کے ایک کونے سے دوسرے تک ذہنوں میں ہلچل برپا کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

اخبار بند ہونے کے بعد جمال الدین افغانی رح روس تشریف لے گئے، جہاں وہ چار سال مقیم رہے اور اخبارات میں متعدد مضامین شائع کرتے رہے۔ ان مضامین کا مقصد عالم اسلام کو برطانیہ کی ناپاک ریشہ دوانیوں سے متنبہ کرنا تھا۔ ۱۸۸۹ء میں شاہ ایران یورپ کے دورے پر گئے تو جمال الدین افغانی رح میونخ (جرمنی) میں تھے۔ شاہ سے ملاقات ہوئی تو اُس نے انہیں وزارتِ جنگ کا منصب قبول کرنے کی ترغیب دی۔ افغانی رح ایران آ گئے، مغربی سامراجیت کے خلاف ان کی فصیح و پُرجوش تقریروں نے لوگوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کر دیا اور وہ افغانی رح کے گرد جمع ہونے لگے۔ شاہ کو فکر پیدا ہو گیا کہ کہیں افغانی کی شخصیت اُس کے اقتدار کے لیے خطرہ نہ بن جائے؛ چنانچہ اُس نے انہیں ایران سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ جمال الدین افغانی رح ترکی چلے گئے اور اپنی وفات (۱۸۹۷ء) تک قسطنطنیہ میں قیام پذیر رہے۔

جمال الدین رح نے اپنی ساری زندگی دنیا بھر کے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر دی تھی۔ وہ محدود قوم پرستانہ تعصبات سے بالکل آزاد تھے۔ وہ ہر ملک ملک ماست کے قائل تھے اور اقبال کی طرح اسلام کو اپنا وطن سمجھتے تھے۔

ولفرڈ کنٹویل سمتھ اپنی کتاب (Islam in Modern History) میں لکھتے ہیں:

> وہ غیر معمولی طور پر ذہین تھے۔ صورتِ حال کے ہر پہلو کو ٹھیک ٹھیک بھانپ لیتے تھے۔ وہ خوب اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ کسی ایک مُسلمان ملک کو نہیں سارے کے سارے عالم اسلام کو مغرب کے طاقت ور اور متحرک وجود سے زبردست خطرہ

ہے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اس وجود کے مقابلے میں ——— سارا عالمِ اسلام
کمزور و ناتواں ہے۔ انہیں کسی حد تک یہ احساس بھی تھا کہ دنیا خود اپنی کمزوری
کے ہاتھوں خطرے میں ہے ——— مزید براں وہ پہلے مسلمان مجدد تھے
جنہوں نے یہ تصور دیا کہ اسلام ایک تاریخی فلسفہ ہے اور مغرب کا حریف ہے۔
جیسا کہ ہمیں اچھی طرح علم ہے اُس وقت سے یہ تصور اسلامی فکر میں ایک معیار
بن چکا ہے۔ وہ افغانی رح ہی تھے جن کے طفیل مسلمان مغرب کی بدنیتی سے آگاہ
ہوئے اور اس کی دہشت ناک قوت ان پر اس طرح عیاں ہو گئی کہ اس کے جواب
میں سرگرم عمل ہو گئے۔"[1]

جمال الدین افغانی رح کے لائحہ عمل کا سیاسی پہلو بے حد گورج پر درد اور جوش آفریں تھا۔
وہ خارجی طور پر زندگی بھر جارح سامراج کے خلاف بڑے استقلال سے معرکہ آرا رہے اور داخلی
محاذ پر قوم پرستانہ فرقہ بندی اور اخلاقی بگاڑ کے خلاف جہاد کیا۔ افغانی رح خوب جانتے تھے کہ معاند
غیر ملکی اقتدار کے سائے میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اس بات سے
بھی اچھی طرح واقف تھے کہ مسلمانوں کو اعلیٰ درجے کی قیادت کی شدید ضرورت ہے۔ ایسی قیادت
جو کسی شخصی دنیاوی منفعت کو خاطر میں نہ لائے اور ہمیشہ اپنی قوم کے مفاد کو سامنے رکھے۔ اُن
کے کام کا یہ حصہ ان کی معذرت خواہانہ جدت پسندی کے مقابلے میں زیادہ عظیم قدر و قیمت کا حامل
ہے۔ المیہ یہ پیش آیا کہ اُن کے مصری شاگرد شیخ محمد عبدہ اس کو سمجھنے سے قاصر رہے اور انہوں
نے مؤخر الذکر کی خاطر اوّل الذکر کام کو چھوڑ دیا۔

افغانی رح کی مابہ الامتیاز حب الوطنی کو نظر میں رکھ کر دیکھا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ
ان کی معذرت خواہانہ جدت پسندی ایک سنگین غلطی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ افغانی رح ایک

---

[1] ص ۴۹۔

عالمگیر خلافت کے پرچم تلے مسلمانوں کے اتحاد کی ضرورت پر ہمیشہ زور دیتے رہے، تاہم مصر، ترکی
اور ایران میں ان کی سرگرمیوں کا نتیجہ بجز اس کے اور کچھ نہ نکلا کہ وہ جس قسم کی ابن الوقتی اور اخلاقی
اعتبار سے دیوالیہ قیادت کی ہمیشہ پُر زور مذمت کرتے رہے تھے اسی کے سائے میں تُند اور
کٹر قوم پرستی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ مسلمانوں کو اگر اسلام کے اتباع و اطاعت کی دعوت اس لیے دی
جاتی ہے کہ اس طرح وہ سیاسی قوت، اقتصادی خوشحالی اور سائنسی یا فنی مہارت سے
ہمکنار ہوں گے تو یہ بجائے خود اسلام کی بے حرمتی اور توہین ہے۔ اسلامی نشاۃ ثانیہ اپنے جلو میں
بے شک دنیوی فوائد بھی لے کر آئے گی، لیکن یہ دنیوی فوائد تو کسی سچے اور مخلص مسلمان کی
منزل ہی نہیں ہو سکتے ہیں۔ مسلمان کو کسی چیز سے اوّل و آخر کوئی سروکار ہے تو وہ آخرت
کی زندگی میں کامیابی اور نجات ہے۔ افغانی رح نے اسلام کے دنیوی کامرانیوں کی کلید ہونے پر
جو زور دیا وہ درحقیقت مادہ پرستانہ نقطۂ نظر تھا۔ اسی تناقض نے ان تمام بھیانک اور مکروہ
رجحانات میں اضافہ کیا جن کا آج عالمِ اسلام میں دور دورہ ہے اور جن کے خلاف افغانی رح
نے بڑی شدید جدوجہد کی تھی۔

سیّد رشید رضاؒ اور تحریکِ منار

سیّد محمد رشید رضاؒ شیخ محمد عبدہؒ کے نہایت مخلص اور ممتاز شاگرد، سوانح نگار اور اُن کی تعلیمات کے نہایت مستند ترجمان تھے۔ وہ شام کے ایک گاؤں کلامون میں ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوئے۔ اُن کا خاندان سادات سے تعلق رکھتا تھا اور اپنے علم و فضل، اتباعِ کتاب و سُنّت میں سارے علاقے میں ممتاز تھے۔ اُس کے پاس اسلامی کُتب کا عظیم الشّان ذخیرہ تھا۔ گاؤں کی مسجد سیّد رشید رضاؒ کے اجداد میں سے ایک بزرگ نے تعمیر کروائی تھی۔ جس گھر میں سیّد رشید رضاؒ پیدا ہوئے اور بچپن گزارا وہ اس مسجد سے کچھ فاصلے پر تھا۔ بچپن کے زمانے کا جو نقش اُن کے ذہن پر ہمیشہ اُجاگر رہا وہ مؤذن کی آواز تھی۔ یہ آواز اتنی مؤثر اور دلکش تھی کہ گاؤں کے عیسائی تک اپنے کام سے ہاتھ روک لیتے اور تحیر خیز عالم میں سُننے لگتے۔

رشید رضاؒ نے اسی مسجد کے مکتب میں اپنی تعلیم کا آغاز کیا۔ قرآن حفظ کیا، لکھنا پڑھنا اور ابتدائی حساب کتاب سیکھا۔ شیخ محمد عبدہؒ بچپن میں نوتت طلب کھیلوں کے شوقین تھے، وہ زبردست شہسوار اور پیراک تھے۔ رشید رضاؒ اپنے استاد کے بالکل برعکس تھے۔ بچوں کے ساتھ کھیلنے کودنے کے بجائے اپنا وقت کتابوں کی صحبت میں تنِ تنہا گزارتے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کر چکے تو اُن کے والد نے اسلامی موضوعات کی اضافی تعلیم کے لیے ایک اتالیق رکھ لیا۔ سترہ برس

کی عمر میں انہیں اعلیٰ تعلیم کے لیے طرابلس بھیج دیا گیا۔

زمانۂ طالب علمی میں امام غزالی رح کی کتاب "احیائے علوم الدین" ان کی پسندیدہ کتاب تھی۔ آگے چل کر انہوں نے اپنی آپ بیتی میں لکھا کہ یہ کتاب میرے دل پر براہِ راست اثر انداز ہوتی، تاہم وہ انقلابی مجلہ "العروۃ الوثقیٰ" تھا جس نے اُن کی زندگی کا رُخ ہی بدل ڈالا۔ یہ مجلہ جمال الدین افغانی رح اور شیخ محمد عبدہ پیرس سے نکالتے تھے۔ اس کی دعوت یہ تھی کہ دُنیا بھر کے مسلمان مغربی سامراج کے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے متحد ہو جائیں اور عظمتِ رفتہ حاصل کرنے کی جدوجہد کریں۔ سید رشید رضاؒ کو اس مجلہ کی خبر محض اتفاقیہ طور پر ہوئی۔ ایک شام وہ اپنے دوستوں کی ایک محفل میں شریک ہوئے۔ اس محفل میں لالٹین کی مدھم روشنی میں ایک شخص بلند آواز سے "العروۃ الوثقیٰ" پڑھتا اور باقی خاموش بیٹھے سُنا کرتے تھے۔ اسلامی نشاۃِ ثانیہ کی اس پکار کو سُن کر یہ نوجوان طالب علم بے قرار ہو گیا اور جب تک اس مجلہ کی مکمل جلد اپنے والد کے ایک دوست کے ہاں سے نہ لی گئی چین سے نہ بیٹھا۔ اس نے اس کا ایک ایک شمارہ اوّل سے آخر تک جوش انگیز جذبے کے ساتھ پڑھا۔

۱۸۹۷ء میں سید رشید رضاؒ نے "عالم" کی سند حاصل کر لی، چنانچہ طرابلس میں تعلیم مکمل کرتے ہی استنبول جانے اور جمال الدین افغانی رح کے ساتھ احیائے اسلام اور مغربی سامراجیوں کے خلاف عالم اسلام کو متحد کرنے کی جدوجہد میں شریک ہونے کا مصمم ارادہ کر لیا، لیکن اُسی سال افغانی رح انتقال کر گئے۔ اس طرح ان کے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے، تاہم افغانی رح کا انتقال انہیں اپنی زندگی کے نو یافتہ مشن سے باز نہ رکھ سکا۔ اب سید رشید رضاؒ نے قاہرہ جانے اور شیخ محمد عبدہ کے حلقۂ تلامذہ سے وابستہ ہونے کا فیصلہ کیا۔ ان کے والدین نے اپنے صاحبزادے کے اس فیصلے کی مکمل حمایت و تائید کی۔ رشید رضا، شیخ محمد عبدہ کی پیاری شخصیت، بلند کرداری اور تصوریت سے بیحد متاثر ہوئے۔ اس طرح استاد اور شاگرد نے باہمی تعاون سے جمال الدین افغانی رح کا کام جاری رکھا۔ اس گہری رفاقت میں وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ۱۹۰۵ء میں شیخ محمد عبدہ فوت ہو گئے اور سید رشید رضاؒ اپنے اُستاد کے کام کو جاری رکھنے کے لیے تنہا رہ گئے۔

برطانوی حکومت نے "العروۃ الوثقیٰ" بند کر دیا تو سید رشید رضا نے ۱۸۹۸ء میں اپنا مجلہ "المنار" شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ شروع میں یہ ہفت روزہ تھا، مگر جلد ہی ماہوار شائع ہونے لگا۔ اس کا مقصد "العروۃ الوثقیٰ" ہی کے نظریات کی تبلیغ و اشاعت تھا، لیکن چونکہ برطانوی حکومت کے سائے میں اشتعال انگیز سیاسی تحریک کا جاری رکھنا ممکن نہ رہا تھا اس لیے اسے اپنے پروگرام سے خارج کر دیا۔ المنار کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اُس کا ایک حصّہ شیخ محمد عبدہ کی تفسیر قرآن اور ان کے فتاویٰ کے لیے وقف کر دیا گیا تھا۔ اگرچہ زیادہ تر مضامین خود سید رشید رضاؒ کے قلم سے ہوتے تھے، تاہم اس کے قلمی معاونین میں مصر اور متعدد مُلکوں کے ممتاز اصحابِ قلم مثلاً امیر شکیب ارسلان اور فرید وجدی وغیرہ شامل تھے۔ علاوہ بریں عالمِ اسلام کے ہر حصّے سے تعلق رکھنے والے ہمدرد اہلِ قلم بھی حصّہ لیتے تھے۔

اپنے کیرئیر کے آغاز ہی سے رشید رضاؒ نے اُس اصلاحی لائحہ عمل کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی جو ان کے اُستاد سے مرتب کیا تھا۔ یہ لائحہ عمل مندرجہ ذیل امور پر مشتمل تھا:

۱۔ اسلام کو فاسد اثرات خصوصاً توہمات اور تصوف کے مختلف سلسلوں کی بے اعتدالیوں سے پاک صاف کرنا۔

۲۔ عصرِ جدید کی ضروریات اور تقاضوں کے مطابق اعلیٰ تعلیم کی اصلاح۔

۳۔ فکرِ جدید کی روشنی میں اسلام کی تعبیرِ نَو۔

۴۔ یورپی اثر و نفوذ اور مسیحی حملوں کے خلاف اسلام کا دفاع۔

شیخ محمد عبدہ کے نزدیک تیسرا نکتہ اوّلین اہمیت رکھتا تھا۔ سید رشید رضاؒ نے اپنی ساری توجہ چوتھے نکتے پر مرکوز کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ استاد اور شاگرد کے نظریات میں اختلاف بڑھتا چلا گیا۔

شیخ محمد عبدہ سمجھتے تھے کہ اسلام کے بدترین دشمن یورپ کے وہ مسیحی مشنری ہیں جو مصر اور دوسرے مسلمان ملکوں کی پسماندگی کا ذمہ دار اسلام کو گردانتے ہیں، لیکن اب یہی الزامات خود مغرب زدہ مصریوں کے فکر و ذہن کا اہم حصہ بن چکے تھے۔ اس لیے رشید رضاؒ کی حتمی رائے یہ تھی کہ اصل خطرہ داخلی ہے اور اس خطرے سے نبرد آزما ہونا ہی سب سے بڑا کام ہے۔ (Nadav Safran) لکھتا ہے:-

"رشید رضاؒ اور المنار فطری طور پر مسلمانوں میں کام کرنے والی جدید قوم پرست تحریکوں کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ کسی ایک معاملے میں نہیں بلکہ بہت سے معاملوں میں سید رضاؒ مصر کے ان چند مسلمان مفکرین میں سے تھے جنہوں نے اس خطرے کو ابتدا ہی سے اور صاف طور پر بھانپ لیا تھا جو قوم پرستی کے تصور کے ہاتھوں اسلامی مبادی و عقائد کو درپیش تھا ——— انہوں نے ہمیشہ قوم پرستی کے ان نظریاتی پہلوؤں کی مذمت کی جو پچھلی صدی کے اواخر سے مصر اور دوسرے عرب ملکوں میں رواج پذیر ہوتے آرہے تھے۔ سید رضاؒ کہا کرتے، مغرب زدہ قوم پرستوں کی اس خواہش سے بڑھ کر خطرناک شے اور کوئی نہیں ہے کہ اسلامی اتحاد کے جذبے کی جگہ قومی و نسلی افتخار کو دے دی جائے۔ ان کے نزدیک قوم پرستی مسلمانوں میں انتشار کا نیا دروازہ کھولنے ہی کے مترادف نہ تھی بلکہ وہ اس کو ارتداد کے لگ بھگ قرار دیتے تھے۔ سید رضاؒ نے قوم پرستوں پر نکتہ چینی کرتے ہوئے بڑے طنزیہ انداز میں لکھا: اگر ایک مسلمان اور ایک عرب اُس ملک کی خاک سے تعلق نہیں رکھتے جس سے وہ رکھتے ہیں تو یہ قوم پرست انہیں اجنبی اور بیگانہ قرار دیتے ہیں۔ ایسا بیگانہ کہ ان کے نزدیک حجاز یا شام کا شریف (اولادِ رسولؐ) چین کے کسی کافر سے بہتر نہیں ہے ——— سید رضاؒ خود ان کی اپنی زبان میں استدلال کرتے ہوئے کہتے: کیا یہ لغویات نہیں ہے

کہ یہ لوگ بدیسی نظریات کی غلامانہ جستجو میں ان تمام چیزوں کو ملیامیٹ کر دینا چاہتے ہیں جو کسی قوم کی قوت تخلیق اور علامتوں کو وجود میں لاتی ہیں[1]"

۱۹۰۸ء میں جب نوجوان ترکوں نے سلطان عبدالحمید کی حکومت کا تختہ اُلٹا تو سید رشید رضاؒ نے ان کی مذمت کی اور کہا کہ یہ ملحدین کا ایک گروہ ہے جو فرانسیسی ماسونیت (Freemasonry) کے زیرِ اثر ہے اور انہی کے اشارے پر چل رہا ہے۔ مصطفےٰ کمال اتاترک نے اصلاحات نافذ کیں تو سید رشید رضاؒ نے ان کی بھی اسی شدومد سے مخالفت کی، خصوصاً عربی زبان کے خلاف اس کی مہم کے خوب لتے لیے اور اسے کھلی بے اعتقادی اور ارتداد قرار دیا۔ ۱۹۲۵ء میں شیخ علی عبدالرزاق نے ایک مقالہ شائع کیا جس میں لکھا تھا کہ اسلام کا جزو نہیں ہے اور مصر کو چاہیے کہ وہ ترکی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے مکمل لادینی قومی ریاست کی صورت اختیار کرے۔ ۱۹۲۶ء میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے زمانۂ جاہلیت کی شاعری پر اپنی بدنام زمانہ کتاب لکھی جس کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کے دلوں میں قرآن و سُنّت کے مستند ہونے کے متعلق شکوک و شبہات پیدا کیے جائیں۔ سید رشید رضاؒ نے ان دونوں کتابوں پر بڑی سخت تنقید کی اور المنار میں پے در پے اداریے قلم بند کیے اور انہیں بدعقیدگی قرار دیا۔

اپنے کیریر کے اس مرحلے میں سید رشید رضاؒ پر یہ حقیقت صاف طور پر آشکارا ہو گئی کہ موجودہ صورتِ حال کی ذمہ داری بڑی حد تک اُن کے اُستاد کے مرعوبانہ استدلال کے بڑے پن پر عاید ہوتی ہے۔ بایں ہمہ چونکہ وہ اپنے استاد کے ساتھ گہرا جذباتی تعلق رکھتے تھے اس لیے اُن پر براہِ راست زبانِ تنقید دراز کرنے سے ہمیشہ احتراز کیا، لیکن اُستاد و شاگرد میں بڑا واضح فرق تھا اور آپس میں کوئی مشابہت نہ تھی۔

---

[1] *Egypt in Search of a Political Community*, Nadav Safran, Harvard University, Press, 1961, p 8

اپنے استاد کی تعلیمات میں انہیں سب سے بڑا نقص یہ نظر آیا کہ شیخ محمد عبدہ نے احادیث کی بڑی تعداد کو ساقط الاعتبار قرار دے دیا اور دعویٰ کیا کہ جدید عقلیت کی روشنی میں قرآن کریم کی تعبیر ہی اصل اسلام ہے۔ رشید رضاؒ خوب سمجھتے تھے کہ ان کے استاد کی یہ تعلیم اسلامی احیاء کی امیدوں پر ضرب کاری ہے کیونکہ اس سے مغرب زدہ لوگوں کو قرآن و حدیث کے ساتھ من مانے تصرف کی کھلی چھٹی مل جاتی ہے۔ چنانچہ سید رشید رضاؒ نے لادینی اور یورپ زدہ فلسفے کی مذمت کی اور قرآن و سنت کو بلا چون و چرا لفظ بہ لفظ قبول کرنے پر زور دیا۔

ترکی میں جمہوری حکومت کے ہاتھوں عثمانی خلافت کی تباہی کے بعد سید رشید رضاؒ نے اپنی ساری توجہ بحالی خلافت پر مرکوز کر دی۔ ۱۹۲۶ء میں مکہ معظمہ میں مؤتمر عالم اسلامی کا اجلاس اسی مقصد کے لیے منعقد ہوا۔ اس میں جن ممتاز ترین مندوبین نے شرکت کی ان میں سید رشید رضا بھی تھے۔ اس وقت ان کے خیال میں شاہ ابن سعود کی حکومت اسلام کی نشاۃِ جدیدہ کی روشن ترین توقعات کا مرکز تھی۔ انہی توقعات کے نتیجے میں انہیں امام احمد بن حنبل رح کے مکتبِ فکر کی اس تعبیر نے اپنی جانب کھینچ لیا جو امام ابن تیمیہ رح اور عرب کے مصلح محمد بن عبدالوہابؒ نے پیش کی تھی۔

شیخ محمد عبدہ اور ان کے شاگرد رشید کے مابین نمایاں ترین امتیاز مغربی تہذیب کے بارے میں ان کا طرزِ عمل تھا۔ شیخ یورپ اور اس کی ثقافت کے پُرجوش مداح تھے۔ وہ اکثر انگلستان اور فرانس جاتے رہتے تھے۔ یورپ کے بعض نامور اشخاص کے ساتھ ان کے دوستانہ روابط تھے۔ وہ زندگی بھر اس بات پر زور دیتے رہے کہ فکرِ جدید کی روشنی میں اسلام کی تعبیرِ نو کی جائے۔ ان کے برعکس سید رشید رضاؒ کے دل میں جدید مغرب کے خلاف شدید نفرت و عداوت پروان چڑھتی رہی۔ ایک مرتبہ انجمن اقوام میں شام پر فرانس کی جارحیت کا مسئلہ پیش کرنے کے لیے جنیوا گئے۔ اس کے علاوہ بھی کئی بار یورپ کا سفر کیا، لیکن جب بھی وہ یورپ گئے کسی شدید ضرورت کے تحت گئے۔ اپنے استاد کے برعکس یورپیوں کے ساتھ معاشرتی تعلقات قائم کرنے سے ہمیشہ محترز رہے۔

سید رشید رضاؒ نے بحالی خلافت اور قانونِ شریعت پر مبنی ایک خالص اسلامی ریاست کے ظہور و قیام کی جو امیدیں اپنے دل میں پال رکھی تھیں وہ پوری نہ ہو سکیں، چنانچہ اکثر مسلم و غیر مسلم مبصرین کی غلط طور پر یہ رائے ہے کہ سید رشید رضاؒ اپنے مقصد میں ناکام رہے۔ مزید برآں زیادہ سے زیادہ چند دانشور ان سے متاثر ہو سکے۔ ندوت سفران (Nadav Safran) رقمطراز ہے:

"ان کی تنقیح پسندی (Revisionism) قدامت پرستوں کے لیے نہایت جرأت آزما تھی تو ان کی احتیاط پسندی (Puritanism) عامۃ الناس کے لیے حد سے زیادہ خشک۔ اسی طرح ان کی بندشیں اور قیود مغربی تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے بہت سخت تھیں۔ ان کی پوزیشن اس قدر کمزور ہو گئی کہ جب ۱۹۳۵ء میں فوت ہوئے تو بہت کم لوگوں کی توجہ ان کی طرف مبذول ہو سکی۔"

بے شک مصر میں جنم لینے والے رجحانات حوصلہ شکن تھے اور سید رشید رضاؒ کی کامرانی کے راستے کا پتھر بنے ہوئے تھے، لیکن صورتِ حال اس قدر مایوس کن نہ تھی جس قدر کہ مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتی ہے۔ سید رشید رضا کے حلقۂ احباب و معاونین میں بلاناغہ شریک ہونے والوں میں ایک ذہین نوجوان بھی تھا جو اسلام کی عظمت اور نشاۃِ ثانیہ کے جذبے سے سرشار تھا۔ اس کا نام شیخ حسن البناءؒ تھا۔ اسی نوجوان نے آگے چل کر الاخوان المسلمون کی بنیاد رکھی جو عرب دنیا میں سب سے بڑی اور ممتاز مذہبی تحریک ہے۔ یہ حسن البناء ہی تھے جنہوں نے سید رشید رضاؒ کے انتقال پر المنار کی ادارت اور اشاعت کا کام سنبھالا۔ یہ حسن البناء ہی تھے جنہوں نے زبردست جوش و جذبے کے ساتھ رشید رضاؒ کے پروگرام کے انتہائی ضروری پہلوؤں کی تجدید کی بلکہ

Egypt in Search of a Political Gommunity, op. cit., p. 84.

طرح عملاً یہ ثابت کیا کہ ان کی زندگی بھر کی جدوجہد رائیگاں نہیں گئی۔

شیخ حسن البنّاءؒ

مصر کے قصبے محمودیہ میں ۱۹۰۶ء میں وہ لڑکا پیدا ہوا جس کے مقدر میں اللہ تعالیٰ نے اسلام کی راہ کا پُرجوش مجاہد بننا لکھ دیا تھا۔ یہی وہ لڑکا تھا جسے جدید دَور کی عرب دنیا شیخ حسن البنّاءؒ کے نام سے جانتی ہے۔

حسن البنّاءؒ نے ایک ایسے دیندار مسلمان گھرانے میں پرورش پائی کہ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ اسلام میرا باپ ہے۔ ان کے والد خود اپنے دَور کے زبردست عالم اور صاحبِ ورع و تقویٰ بزرگ تھے۔ وہ ماہر گھڑی ساز تھے اور اسی پر پُورے خاندان کی گزر بسر ہوتی تھی۔ یہ ایک خاصا خوش حال گھرانا تھا۔ وہ رات کے وقت کام کرتے تھے۔ دن بھر تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے، مقامی مسجد میں امامت کے فرائض انجام دیتے اور وعظ کہتے۔ فراغت کے اوقات اپنے کتب خانے میں گزارتے۔ فقہ اسلامی سے ان کو خاص طور پر دلچسپی تھی۔ مؤطا امام مالکؒ اور مُسند امام شافعیؒ ان کی نہایت پسندیدہ کتابیں تھیں۔ انہوں نے مُسند امام احمد بن حنبلؒ کی شرح بھی لکھی تھی۔ حسن البنّاءؒ نے قرآنِ کریم اپنے والد ماجد ہی سے حفظ کیا۔ جب وہ کچھ بڑے ہوئے تو باپ نے اپنے کُتب خانے کے دروازے ان پر کھول دیئے اور اجازت دیدی کہ وہ جو کتاب چاہیں پڑھ سکتے ہیں۔ اس طرح حسن البنّاءؒ نے خالص اسلامی تعلیم

اپنے پدر بزرگوار سے حاصل کی۔ عربی زبان پر انہیں زبردست قدرت تھی۔ اس کے سوا اور کوئی زبان انہوں نے نہیں سیکھی۔

اسلام کی خاطر جوش و جذبہ اور قیادت کی فطری صلاحیت بچپن ہی سے آشکار ہونے لگی۔ ابھی چھوٹے سے تھے کہ حسن البناء اور ان کے بھائی نے ایک انجمن "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" قائم کی۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے ایک اشتہار لکھا جس میں مردوں کو نصیحت کی کہ وہ سونے کی انگشتریاں یا ریشمی کپڑے نہ پہنیں۔ یہ اشتہار مساجد کے دروازوں پر چپاں اور شہر کے بڑے بڑے لوگوں میں تقسیم کیا گیا۔ بارہ برس کی عمر میں ہم حسن البناء کو نماز پڑھاتے اور اذان دیتے دیکھتے ہیں۔ وہ صبح صادق کے وقت اٹھتے، گلی کوچوں میں گشت کرتے، گھر گھر جا کر دروازوں اور کھڑکیوں پر دستک دیتے، لوگوں کو جگاتے اور نماز پڑھنے کی تلقین کرتے۔ وہ مؤذنین کو بھی بیدار کرتے۔ رمضان کے علاوہ رجب اور شعبان کے مہینوں میں بھی روزے رکھتے۔ گھر میں ہوتے یا مدرسے اور کوچہ و بازار میں، قرآن کریم وردِ زبان رہتا۔

سولہ برس کے تھے کہ ان کے والد نے انہیں قاہرہ کے دارالعلوم میں داخل کرنے کا فیصلہ کیا جہاں اساتذہ کو تربیت دی جاتی تھی۔ قاہرہ پہنچے تو لوگوں کو اخلاقی انحطاط اور اسلام سے بے اعتنائی کا شکار دیکھ کر سخت برہم ہوتے۔ ابھی وہ دارالعلوم میں زیر تعلیم ہی تھے کہ ڈاکٹر طہٰ حسین نے اپنی گمراہ کن کتاب "جاہلی عرب کی شاعری" لکھی۔ اس کتاب میں انہوں نے قرآن و سنت کو مشکوک اور ساقط الاعتبار ٹھہرانے کی کوشش کی تھی۔ انہی دنوں شیخ علی عبدالرزاق کی بدنامِ زمانہ کتاب "اسلام اور حکومت کے بنیادی اصول" شائع ہوئی جس میں مسلمانوں کو لادینیت اختیار کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ ادھر اخبارات اور جرائد میں "مصر یورپ کا حصہ ہے" ایسے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ اُدھر قوم پرست ملک کو ثقافتی فیضان سے بہرہ اندوز کرنے کے لیے فرعونوں کے دور کی طرف پلٹنے کی دعوت دی جا رہی تھی۔ اتاترک نے ترکی کے مسلمانوں پر مغرب زدگی کی جو لعنت بزورِ قوت مسلط کی تھی اس کی نقالی کا

واقعتاً ہی شور و غوغا بڑھتا جا رہا تھا۔ حسن البناء نے یہ دیکھا کہ مصر کی انتہائی معزز اور بااثر شخصیتیں تجدد پسندوں کی صف میں شامل ہو چکی ہیں اور عوام الناس کو گمراہ کرنے میں مصروف ہیں تو بے حد مضطرب ہوئے۔ اسی غم و اندوہ کے عالم میں وہ تسکینِ قلب کی تلاش میں سید رشید رضا اور ان کے شاگردوں کی مجلس میں پہنچے۔ انہی مجالس میں ان کے دل میں ایک ایسی عظیم و منظم تحریک شروع کرنے کا خیال پیدا ہوا جو جدید دور کی اس تاریک خیالی کو ملیا میٹ کر کے رکھ دے اور اہلِ وطن کے دل میں ایک ایسی لگن پیدا کر دے کہ وہ دین کو شخصی اور عوامی زندگی کا رہنما بنا لیں۔ جب آخری امتحان میں طلبہ سے پوچھا گیا کہ مستقبل کا کون سا منصوبہ ان کے پیشِ نظر ہے، تو حسن البناء نے لکھا:

"میں مرشد اور استاد بنوں گا۔ صرف بچوں ہی کو تعلیم نہ دوں گا بلکہ ان کے والدین کو بھی اسلام سکھاؤں گا اور اس راہ میں دن رات ایک کر دوں گا۔ مضامین لکھوں گا، تقریریں کروں گا، مذاکرات میں حصہ لوں گا اور قریہ قریہ شہر شہر دورہ کروں گا۔ اول الذکر کام کو جذبۂ تشکر و رجا کے ساتھ اور موخر الذکر کو صبر و ثبات اور سرفروشی کے ساتھ انجام دوں گا۔ اس کے لیے میں بالکل تیار ہو چکا ہوں۔

ایک مصلح کے لیے یہ دونوں کام ضروری ہیں اور اس کی کامیابی کا راز انہی میں پنہاں ہے۔ ایک مصلح کے علم و مسائل میں دو باتیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں: طویل عرصے تک مطالعہ اور اسلامی نظریات کو اپنانے اور ان سے ہمدردی رکھنے والے لوگوں کے بارے میں علم۔ میں نے ایک جسم، جو چھوٹا اور دبلا پتلا ہونے کے باوجود سختیاں سہنے کا خوگر اور مشکلات سے مانوس ہے اور ایک جان خدا کے حوالے کر دی ہے۔ یہ میرے اور میرے خدا کے درمیان ایک معاہدہ ہے جس کو میں یہاں ضبطِ تحریر میں لا رہا ہوں، جس کا گواہ میں اپنے استاد کو بناتا ہوں، جس پر سوائے ضمیر کے کوئی چیز اثر انداز نہیں ہو سکتی اور جو خدائے لطیف و خبیر کے سوا کسی

فہم و ادراک میں نہیں آسکتا۔ وَمَنْ اَوْفٰی بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا۔

حسن البنّاء نے ۱۹۲۷ء میں دارالعلوم سے سند حاصل کی۔ اُس وقت وہ ۲۱ برس کے تھے۔ وہ ایک ذہین طالب علم تھے اور اپنی جماعت میں اوّل آتے تھے۔ جلد ہی اسمٰعیلیہ کے سرکاری پرائمری سکول میں اُستاد مقرر ہو گئے۔ اسمٰعیلیہ منتقل ہوئے چند ماہ گزرے تھے کہ انہوں نے "الاخوان المسلمون" کی بنیاد رکھی۔ اس عظیم الشان تحریک کی اوّلیں اینٹ رکھنے میں ان کے چھ وفادار ساتھی اور طالب علم بھی اُن کے ساتھ شریک تھے۔ حسن البنّاء اکثر بڑے بڑے قہوہ خانوں میں جاتے اور جہنم کی ہولناکیوں اور جنت کی مسرتوں کا ذکر کرتے۔ اُن کی آواز بڑی ہی پُر تاثیر اور درد و سوز سے مملو تھی۔ رفتہ رفتہ غفلت کی نیند کے ماتے جاگنے لگے۔ اُن کا معمول تھا کہ مغرب کی نماز ایک قریبی صوفی زاویے میں پڑھتے اور پھر قہوہ خانوں میں پہنچ جاتے جہاں رات گئے تک تذکیر و تدریس کا سلسلہ جاری رہتا۔ موسم گرما کی تعطیلات ہوتیں تو اسمٰعیلیہ سے نکل کھڑے ہوتے۔ مصر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سفر کرتے۔ پیدل بھی اور گاڑی سے بھی۔ جس قصبے کے پاس سے گزر ہوتا وہاں ضرور جاتے۔ غریب کسانوں کے دُور افتادہ ڈیروں تک میں پہنچتے۔ رات وہیں گزارتے، مسجد میں لوگوں سے خطاب کرتے، انہیں خواب غفلت سے جگاتے۔ دن کے پر اور کارگاہوں میں جاتے، لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے اور اسلامی زندگی بسر کرنے کی دعوت دیتے۔

اس کارِ عظیم کے لیے اللہ نے حسن البنّاء کو زبردست صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ نہ صرف بلا کی ذہانت عطا کی تھی بلکہ ایک مضبوط و توانا جسم بھی دیا تھا۔ قد تو اُن کا چھوٹا تھا، لیکن مردانگی اور شجاعت کا پیکر تھے۔ ساری زندگی بھرپور صحت سے بہرہ ور رہے۔ عربوں کے دل پر خطابت کے سحر کا سب سے زیادہ اثر ہوتا ہے اور حسن البنّاء اس وہبی کمال کے مالک تھے۔ ان کی سحر طراز خطابت اور کشش انگیز شخصیت سے اَن پڑھ مزدور بھی متاثر ہوتے تھے اور

فاضل شیوخ بھی، چنانچہ ان کی بڑی تعداد ان کے ارد گرد جمع ہو گئی۔

۱۹۳۲ء میں حسن البنّاء نے اخوان کا مرکز اسمٰعیلیہ سے قاہرہ منتقل کر دیا۔ اگلے تین برس تحریک نے لوگوں کو اسلامی زندگی کو اپنانے کی دعوت و تعلیم اور مصر کے ہر حصے میں مسجدوں، مدرسوں اور سماجی بہبود کے مراکز کا جال بچھانے میں گزارا۔ وہ نوجوان جو چند سال پہلے خوابیدہ مؤذنین کو جگایا کرتا تھا اب سارے مُلک کو جگا رہا تھا۔ حسن البنّاء نے وہ کام کیا جو الازہر کے معزز علماء بھی نہ کر سکے۔ قاہرہ ایسے شہر میں جہاں جاہلیت جدیدہ کے اثرات اتنے زبردست تھے کہ مسلمان پبلک مقامات پر نماز پڑھتے ہوئے گھبراتے تھے، جہاں سکول کے بچوں کو اسلام کے ذکر تک سے متنفر کیا جا رہا تھا۔ حسن البنّاء نے سینکڑوں جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کی زندگیوں میں انقلاب برپا کر دیا۔ ان میں سے بعض آگے چل کر ان کے جانثار مرید بن گئے۔

الاخوان المسلمون شدید مرکزیت کی حامل تحریک تھی جس پر اُس کے بانی کو مکمل اختیار حاصل تھا۔ اخوان حسن البنّاء کے احکام کی بے چون و چرا اطاعت کرتے۔ وہ ان کے مخلص وفادار اور سچے جانثار تھے۔ اس باب میں دنیا کے بڑے بڑے بادشاہ بھی ان کے ہمسر نہ تھے۔ جب یقین ہو گیا کہ اخوان ملک میں ایک مؤثر قوت بن چکے ہیں تو حسن البنّاء نے اپنے لائحہ عمل کو وسیع تر پیمانے پر عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کر لیا۔ ان کا مطمحِ نظر شریعت کی کڑی پابندی کرتے ہوئے مصری معاشرہ کی مکمل اصلاح تھا۔

اخوان پہلی مرتبہ ۱۹۳۶ء میں حکومت کا مرکزِ توجہ بنے۔ شیخ حسن البنّاء نے بادشاہ اور ملک کے عالی مرتبت وزراء کے نام خطوط لکھے جن میں انہیں مغربی طور اطوار کو چھوڑ دینے اور اسلامی قوانین کی اطاعت کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ اختلاطِ مرد و زن، سرکاری تقریبات میں شراب نوشی، قمار خانوں کے طواف، گھڑ دوڑ میں شرکت، شبینہ کلبوں میں شمولیت اور سینما بینی سے باز رہیں، اپنی بیوی بیٹیوں کی تصویریں اخبارات میں شائع نہ کروائیں، پانچوں وقت نماز پڑھیں، گھروں میں انگریزی یا فرانسیسی بولنے کے بجائے عربی بولیں، اپنے

بچوں کے لیے یورپی اطالیق رکھنے یا انہیں غیر ممالک میں بھیجنے سے احتراز کریں۔اس طرح مصری عوام کے لیے ایک نمونہ قائم کریں۔

تحریک کے تمام مختلف پہلوؤں میں سے حسن البنّا سب سے زیادہ اہمیت نوخیز نسل کی تعلیم کو دیتے تھے۔ مختلف مواقع پر انہوں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ درس گاہوں اور تعلیمی اداروں کو اسلام کی بنیادوں پر از سرِ نو منظم کیا جائے، مخلوط تعلیم پر پابندی لگائی جائے اور لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے علیحدہ نصاب تیار کرنے کی ضرورت پر غور کیا جائے۔ خاص طور پر ان کی خواہش یہ تھی کہ طبیعی علوم کو جدید مادیت کے سیاق و سباق سے الگ کر کے رائج کیا جائے، تاکہ مصری تمام مفید علوم سے مکمل طور پر بہرہ مند ہو سکیں اور مضر رساں نتائج سے محفوظ رہیں۔

دوسری عالمگیر جنگ کے اختتام تک اخوان المسلمون کے اثر کا یہ عالم تھا کہ وہ عملاً حکومت در حکومت کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ مصر بھر میں مشکل ہی سے کوئی شہر اور قصبہ ایسا ہو گا جہاں اس کی ایک دو شاخیں موجود نہ ہوں۔ حسن البنّا نے خود اپنا ایک جامع اور مکمل نظامِ تعلیم قائم کر لیا تھا۔ اخوان درس گاہیں، مسجدیں اور معاشرتی بہبود کے مراکز اور دمبدم نمو پاتے اور بڑھتے ہوئے تجارتی ادارے ملک بھر میں پھیلے ہوتے تھے۔ ان کے اخبارات، پمفلٹ، رسائل اور کتابوں کا حلقۂ اشاعت روز افزوں تھا۔ اب اخوان کا اثر مصر کی سرحدوں سے باہر بھی پھیلنے لگا تھا۔ پڑوسی ملکوں کے نوجوانوں کی نظریں رہنمائی کے لیے حسن البنّا کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ شام، لبنان، اردن، فلسطین، مراکش اور سوڈان میں اخوان المسلمون کی شاخیں قائم ہو گئی تھیں۔

جمال الدین افغانیؒ کی طرح شیخ حسن البنّا بھی اس حقیقت کو خوب سمجھتے تھے کہ دشمن اجنبی اقتدار کے سائے میں کسی اسلامی معاشرہ کا پنپنا ناممکن ہے۔ چنانچہ انہوں نے مطالبہ کیا کہ برطانیہ کے سیاسی اور اقتصادی سامراج کے خلاف جہاد کا اعلان کیا جائے اور آخر دم تک جنگ کی جائے۔ برطانیہ کو مجبور کیا جائے کہ وہ نہر سویز سے اپنا قبضہ اٹھا لے۔ حسن البنّا کو صیہونیت

اور اس کے عزائم سے شدید دلی نفرت تھی۔ انہوں نے اس خطرے کے خلاف آخر دم تک لڑنے کا حلف اٹھایا۔ ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کے خلاف جنگ میں اخوان عرب فوجوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ شجاعت سے لڑے۔ اخوان کے رضاکار لشکروں نے صیہونیوں کو ناکوں چنے چبوائے۔ ایسے مہلک اور سخت دشمن سے اُسے پہلے کبھی واسطہ نہ پڑا تھا۔

اخوان کی ہر دلعزیزی اور اثر و نفوذ میں اضافے کے ساتھ ساتھ حکمران گروہ انہیں اپنے اقتدار کے لیے سخت خطرہ سمجھنے لگے۔ دسمبر ۱۹۴۸ء میں مصری حکومت، برطانیہ کے دباؤ اور جبر کے آگے جھک گئی۔ اور تحریک کو خلافِ قانون قرار دے دیا۔ ہزاروں اخوان جیل خانوں میں ٹھونس دیئے گئے۔ ان کی جائداد ضبط کر لی گئی۔ اس اقدام پر بمشکل دو مہینے گزرے تھے کہ ۱۲ فروری ۱۹۴۹ء کو کسی نامعلوم قاتل نے قاہرہ کے ایک بھرے بازار میں حسن البنّا کو گولی مار کر شہید کر دیا۔ لیکن اخوان کے حوصلے اپنے محبوب مرشد کی شہادت سے بھی پست نہ ہوئے۔ تحریک پہلے سے بھی زیادہ تیزی سے بڑھنے اور پھلنے پھولنے لگی۔ ۱۹۵۴ء تک یہ تحریک زور و شور سے ترقی کرتی رہی۔ پھر اسے نہایت سنگدلی اور غیر انسانی طریقوں سے کچل ڈالا گیا۔ ایسے غیر انسانی طریقوں سے جو کمیونسٹ پسند آمریتوں کا طرۂ امتیاز بن چکے ہیں اور جن سے ساری دنیا خوب واقف اور آشنا ہے۔

شیخ حسن البنّا نے بچپن کے اوائل سے آخر دم تک اپنی ساری صلاحیتیں، سارے افکار، ساری توانائی، سارا وقت اور ساری جائداد حتیٰ کہ آخر میں اپنی جان بھی اللہ کی راہ میں دے دی۔ بلاشبہ انہوں نے ہر وہ چیز قربان کر دی جو ان کے پاس تھی۔ وہ حقیقی اور اعلیٰ ترین معنوں میں راہِ خدا کے شہید تھے۔ اللہ ان پر اپنی برکتیں نازل فرمائے اور ان کی روح کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ ان کی یاد ہمارے دلوں میں ہر دم تازہ رہے اور ہم سب ان کی زندگی سے جوش و جذبہ حاصل کرتے رہیں۔

الاخوان المسلمون

پہلی عالمی جنگ کے بعد مصر میں مغربیت کی حامی قوتیں نہایت زور پکڑ گئیں۔ مصطفےٰ کمال اتاترک نے خلافت ختم کردی۔ یہ گویا عالمِ اسلام میں قوم پرستی کی انتہا تھی۔ تحریکِ نسواں بھی خاصی قوت اختیار کر گئی۔ اونچے طبقے کی مصری عورتوں نے پردہ اتار پھینکا۔ مغربی طرز کا لباس پہننے لگیں۔ معاشرتی تقریبات کے سلسلے میں جو مخلوط محفلیں سرکاری یا غیر سرکاری طور پر منعقد ہوتیں ان میں شریک ہونے لگیں اور مطالبہ کیا کہ مردوں کی طرح انہیں بھی یونیورسٹیوں میں داخلہ دیا جائے۔ اس زمانے میں شیخ حسن البنّاء دارالعلوم میں استاد بننے کی تربیت حاصل کر رہے تھے۔ ان دنوں وہ خود اور اُن کے رفقاء اس صورتِ حال سے کس قدر متفکر اور مضطرب تھے اس کا ذکر انہوں نے اپنی یادداشت میں کیا ہے:

"بس خدا ہی جانتا ہے کہ ہم نے کتنی راتیں قومی امور اور ان کی بگڑتی ہوئی کیفیت پر غور و خوض کرنے، زندگی کے مختلف شعبوں کے ساتھ اس کے تعلق کا جائزہ لینے، اس بیماری کے اثرات اور اُس کے مداوا کے مختلف طریقے تلاش کرنے میں گزاریں۔ ہم اپنے فیصلوں پر بار بار ایسے جذباتی انداز میں غور کرتے کہ ہماری آنکھیں اکثر اشکبار ہو جاتیں۔ پھر جب ہم اپنے جذباتی فیصلوں کا مقابلہ قہوہ خانوں

میں بیکار وقت ضائع کرنے والے بے فکرے اور حالات سے بے تعلق اور غیر جانبدار عوام کے ساتھ کرتے تو ہمیں شدید صدمہ ہوتا۔"

اسی یادداشت میں حسن البناء بتلاتے ہیں کہ انہیں تحریک شروع کرنے کا خیال پہلے پہل قاہرہ میں لوگوں کی اسلام سے بے خبری اور غفلت کو دیکھ کر ہوا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ لوگوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لیے محض مسجدیں اور ان کے واعظ کافی نہیں ہیں۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ روایتی علماء تجدد پسندوں کا سدِ باب کرنے سے قاصر ہیں اور کفر و الحاد کے فتوے صادر کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے۔ انتہائی یاس انگیز بات یہ تھی کہ نام نہاد "رجال الدین" (مذہبی لوگ) حکمران طبقے کی کاسہ لیسی اور دنیا کی خوشنودی کے لیے اسلامی اصولوں کا سودا کرنے پر ہر وقت آمادہ رہتے تھے۔ قاہرہ کے علماء تو ذلت و پستی کی انتہا کو پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے شیخ الازہر کے اس فتویٰ کی توثیق کر دی تھی کہ شاہ فاروق خلافت کے لیے موزوں ترین امیدوار ہیں۔ وہ ایک متقی اور خدا ترس مسلمان ہیں اور نسباً خانوادۂ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے تعلق رکھتے ہیں۔

حسن البناء نے فیصلہ کیا کہ وہ اس اندوہناک منظر کو بدل کر رہیں گے اور اس سلسلے میں ان سے جو کچھ بن آئے گا اس سے دریغ نہ کریں گے۔ چنانچہ دارالعلوم سے فارغ ہوتے ہی ۱۹۲۹ء میں الاخوان المسلمون کی بنیاد رکھ دی۔ جمال الدین افغانی رح، شیخ محمد عبدہ رح اور سید رشید رضا رح ایسی با اثر مسلمان شخصیتوں نے اپنی اسلامی سرگرمیوں کو تحریر و تقریر کے دائرے تک محدود رکھا تھا۔ شیخ حسن البناء ابتداء ہی سے ایک ایسی ہمہ گیر اسلامی تحریک جاری کرنا چاہتے تھے جو پوری قوم کی رہنمائی کرے اور اس کے سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی زندگی کے تمام میدانوں کو اسلامی نظریات کے رنگ میں رنگ دے۔

الاخوان المسلمون ایک نہایت منظم تحریک تھی۔ اس کے ارکان مختلف مدارج میں منقسم تھے۔ صف اوّل، صف دوم، ہمدرد اور فعّال کارکن۔ کوئی رکن مقررہ آزمائشوں سے گزرے بغیر

اگلے مدارج کی طرف نہیں بڑھ سکتا تھا۔ جب کوئی رکن سرگرم کارکن بن جاتا تو ان خاص اجلاسوں میں شرکت کا مستحق قرار پاتا تھا جس کی صدارت خود حسن البناء کیا کرتے تھے۔ فعّال ارکان کی بہبود نگرانی کے لیے انہیں مرکزوں، زاویوں، گھرانوں اور کتائب میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ جب کسی شاخ کے ارکان کی تعداد بڑھ جاتی تو اسے ترقی دے کر انتظامی وحدت میں تبدیل کر دیا جاتا جس کی اپنی مجلس شوریٰ ہوتی۔ اس مجلس کے ارکان کو جمعیت عمومی (General Assembly) منتخب کرتی تھی۔ ہر شاخ کو ہدایت تھی کہ وہ اپنی سرگرمیوں کی رپورٹ اور لائحہ عمل کا گوشوارہ جمعیت عمومی کے اجلاس سے کم از کم دس دن پہلے مرکز عام کو بھیج دے تاکہ اس اجلاس میں وہ اپنا نمائندہ بھیج سکے۔ مقامی شاخ کی جمعیت عمومی جو فیصلے کرتی مرکز عام سے ان کی توثیق کروانی پڑتی۔ مرکز عام کسی بھی نئی شاخ یا انتظامی وحدت کو منظور یا نامنظور کر سکتا تھا۔ اس کو انہیں توڑ دینے کا اختیار بھی حاصل تھا۔ مرکز عام نے متعدد کمیٹیاں قائم کر رکھی تھیں تاکہ کام بے روک ٹوک ہو سکے۔ مثلاً ایک شعبہ معاشرتی خدمات کی نگرانی سے متعلق تھا۔ ایک اور شعبہ دنیائے اسلام سے رابطہ برقرار رکھنے کا فرض انجام دیتا تھا وغیرہ وغیرہ۔

قاہرہ کا مرکز عام تحریک کی سب سے اہم شاخ تھی۔ یہ شاخ مجلس تاسیسی کے تقریباً ایک سو ارکان اور مکتب الارشاد العام (Office of the General Direction) کے بارہ ارکان سے عبارت تھی۔ مکتب کے ان ارکان کو حسن البناء خود مجلس تاسیسی کے ارکان میں سے چنتے تھے۔ جماعت میں شمولیت کے وقت تمام ارکان بیعت اور عہد کرتے تھے کہ وہ تحریک کی اپنی جان سے بڑھ کر حفاظت کریں گے، اپنے قائدین پر مکمل اعتماد کریں گے، ان کے فیصلوں کو نافذ کریں خواہ شخصی طور پر انہیں ان فیصلوں سے اختلاف ہی کیوں نہ ہو۔ ہر اجلاس میں ہر ایک رکن تجدید بیعت کرتا اور عہدِ اطاعت دہراتا۔

فعال ارکان کی زندگیوں سے شیخ حسن البناء خوب اچھی طرح واقف تھے۔ ہر رکن کو حکم تھا کہ وہ اپنی روزمرہ کی سرگرمیاں قلم بند کرتا رہے۔ ان سرگرمیوں میں حفظِ قرآن، نماز باجماعت میں

حاضری، قرآن و حدیث اور فقہ اسلامی کے مبادی کا مطالعہ، مختلف ہتھیاروں کا استعمال اور فوری طبی امداد کا طریقہ بھی شامل تھا۔ مطالعہ کے اختتام پر امتحان لیا جاتا۔ شیخ حسن البناء کی دعوت پر ہر دو سال کے بعد اخوان کی شاخوں کے تمام رہنماؤں کی کانفرنس منعقد ہوتی۔

اپنی تحریروں میں شیخ حسن البناء اخوان کو چند متعین اصول اپنانے کی تلقین کرتے۔ اوّل یہ کہ اخوان کو فروعی مذہبی اختلافات کی رزم گاہ ہرگز نہ بنائیں۔ اس ضمن میں وہ ایک پیر طریقت کی نصیحت پر عمل پیرا تھے۔ ان بزرگ کے وہ اپنے طالب علمی کے زمانے ہی سے بے حد مداح تھے۔ یہ صوفی بزرگ اپنے مریدوں کو ہمیشہ تنبیہہ فرماتے رہتے تھے کہ نہ تو وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اُلجھیں نہ ملحدوں، آزاد خیالوں یا عیسائی مشنریوں کے دلائل کو کھلے عام دُہرائیں۔ نجی محفلوں میں ان پر کلام بھی کیا جا سکتا ہے اور باہم دیگر بحث مباحثہ بھی، لیکن عام لوگوں کے سامنے صرف ایسی مؤثر باتیں کہنی چاہئیں جن سے وہ اطاعت خداوندی کی طرف راغب اور متوجہ ہوں۔

دوم شیخ حسن البناء نامور لوگوں سے سخت بدظن تھے۔ وہ جب تحریک میں شامل ہونے کی درخواست کرتے تو ان کے ارادوں کو مشتبہ نظروں سے دیکھتے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ لوگ صرف دولت کے پجاری اور دنیوی مفادات کے بندے ہیں۔ ان کے سب کاموں کے پیچھے یہی خواہش کارفرما ہوتی ہے۔ شیخ حسن البناء اور ان کے ہمدرد اپنی تحریروں میں اس بات پر بہت زیادہ زور دیتے کہ تحریک کو فطری تدریجی انداز میں ترقی کرنی چاہیئے اور اقتدار پر قابض ہونے سے پہلے عوام کی طرف سے اس کے نظریات کی زبردست حمایت و تائید ضروری ہے۔ اخوان اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے خالص دینی و اعتقادی طاقت اور اپنے ارکان اور ہمدردوں کی وحدت فکر و عمل اور مقاصد میں ہم آہنگی پر انحصار کرتے۔ وہ طاقت استعمال کرنے کے قائل نہ تھے اسے بس آخری چارۂ کار سمجھتے تھے۔ حسن البناء اپنی تقریروں اور تحریروں میں اس بات کی پُرزور تردید کرتے کہ ان کی تحریک انقلاب لانا یا حکومت کا تختہ اُلٹنا چاہتی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اخوان اس قسم کے طور طریقوں کے مؤثر اور مفید ہونے پر یقین نہیں کرتے۔ تحریک کی اہم ترین سرگرمیوں

میں اخوان تعلیم اور مختلف قسم کی درس گاہیں کھولنے میں بہت زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ انہوں نے متعدد مواقع پر مصری حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ سرکاری اسکولوں میں دینی تعلیم رائج کریں اور نوخیز نسل کو اعلیٰ اخلاقی نظریات کی تعلیم دیں۔ اس پروگرام کے چار اہم مقاصد تھے: دینی اعتقادات کا فروغ، اعلیٰ اخلاقی معیار، قوم کے اسلامی ماضی کی میراث پر فخر و ناز، سائنس کے تمام شعبوں میں مختصین (specialists) کی تیاری تاکہ ایک مضبوط و مستحکم بنیاد پر اسلامی نشاۃ نو کا دور شروع کیا جا سکے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ نصابِ تعلیم میں اسلامی تاریخ، قومی تاریخ اور عمومی اسلامی تہذیب پر خصوصی توجہ دی جائے۔ اسی طرح یونیورسٹی کی سطح پر مذہبی تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے۔ انہوں نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ جو لوگ اخلاقی طور پر بدکردار ہیں، اپنے دین و ایمان سے غافل اور ملک کی فلاح و بہبود میں غیر مخلص ہیں، انہیں تعلیمی پیشے سے نکالا جائے اور مخلوط تعلیم پر پابندی عائد کی جائے۔

اخوان نے تعلیم کے فروغ و اشاعت میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔ مرکز میں ایک کمیٹی بنائی جس کا کام لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے الگ الگ ابتدائی، ثانوی اور فنی مدارس قائم کرنا تھا، ایسے مدارس جن کی امتیازی شان اسلامی کردار ہو۔ ناخواندگی ختم کرنے کے لیے اخوان نے متعدد اسکول کھولے جن میں مزدوروں اور کسانوں کو مفت تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ اسکول رات کام کرتے تھے۔ دن کے وقت قرآن کریم حفظ کرایا جاتا اور تسبیعہ اسکولوں میں وہ بالغ تعلیم پاتے جنہیں دن کے وقت فرصت نہیں ملتی تھی۔ امتحان میں ناکام ہونے والے طلباء کے لیے خصوصی اسباق کا انتظام کیا گیا۔ یہ اسباق یونیورسٹی کے فارغ التحصیل نوجوان پڑھاتے تھے۔ اسی طرح لڑکیوں کی تربیت کے لیے "امہات المومنین" اسکول قائم کیے گئے۔ تعلیم کی اشاعت پر اخوان نے اتنا زیادہ زور دیا کہ تحریک کی کوئی شاخ ایسی نہ تھی جس کا اپنا اسکول نہ ہو۔

اخوان سماجی بہبود کی ہر طرح کی سرگرمیوں میں جوش و خروش سے حصہ لیتے تھے۔ مصری دیہات کا معیار زندگی بلند کرنے اور دیہاتی علاقوں کی اصلاح کے لیے انہوں نے ایک انجمن قائم کی۔ ایک شخص نے اپنی اراضی میں ایک ماڈل فارم بنایا۔ ایک اور گاؤں میں غریبوں کے لیے چار قبرستان

بنائے گئے۔ ایک اور گاؤں کے اخوان نے رمضان کے سارے مہینے میں دو سو مہاجروں کو کھانا کھلانے کا فیصلہ کیا۔ اخوان کی مختلف شاخیں رمضان کے مہینے میں غریبوں کو کھانا کھلانے، دیہات میں روشنی کرنے اور صدقات و خیرات جمع کرنے میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرتیں۔ بعض اخوان دیہات میں ثالث کی حیثیت سے مختلف جھگڑوں اور تنازعات کا فیصلہ کرتے۔ ایک اخ نے تو بے گھر اور محتاج بچوں کی مردم شماری کروائی۔ مقصد یہ تھا کہ انہیں ان کی عمر کے مطابق کوئی روزگار فراہم کیا جاتے اور جن اپاہج اور معذور بچوں کی گزر بسر کا کوئی ذریعہ نہیں انہیں مدد دی جاتے۔

اخوان نے ملک کے ہر حصے میں مسجدیں تعمیر کیں، اکثر ارکان مسجد کے لیے قطعۂ زمین دیتے باقی اس کی تعمیر کے اخراجات ادا کرتے۔ اخوان کی اکثر شاخوں کی اپنی مساجد تھیں۔

اخوان عوامی صحت کی فکر بھی کرتے، چنانچہ انہوں نے بہت سے مقامات پر بیماروں کے علاج کی خاطر شفا خانے اور ڈسپنسریاں قائم کیں۔ جس زمانے میں تحریک کی سرگرمیاں پورے عروج پر تھیں، طنطا میں اخوان کے شفا خانے نے صرف ایک سال میں کئی ہزار بیماروں کا علاج کیا۔

اپنے نظریات کی تبلیغ کے لیے اخوان نے نشر و اشاعت کے میدان میں بڑی سرگرمی کا مظاہرہ کیا۔ وہ ایک روزنامہ اور نصف درجن سے زائد رسالے شائع کر رہے تھے۔ المنار ماہنامہ التعارف، الشعائر، النذیر، الشہاب، المباحث، الدعوۃ اور المسلمون ہفتہ وار تھے۔ روزنامہ کا حلقۂ اشاعت دوسری تمام مطبوعات سے زیادہ وسیع تھا۔ ان کی مطبوعات کے مقاصد مندرجہ ذیل تھے:

اسلامی تعلیمات کو اسلوبِ جدید میں پیش کرنا تاکہ یہ ثابت کیا جاسکے کہ اسلام بہترین مذہب اور نظامِ حیات ہے، اسلامی تعلیمات پر عائد کیے جانے والے الزامات کی تردید اور مسلمانوں کو متحد کرنے کے لیے مختلف اسلامی مکاتبِ فکر کے نقطہ ہائے نظر کے درمیان تطبیق۔

شیخ حسن البناء کے اقوال اور مضامین ہر روز اخبار میں نمایاں انداز میں شائع کیے جاتے۔ یہ مضامین بڑی ہی فصیح اور خطیبانہ زبان میں ہوتے اور آیاتِ قرآنی، احادیثِ رسولؐ اور قدیم عربی

اشعار سے بھرپور ہوتے۔ پمفلٹوں کے عنوانات کچھ اس قسم کے تھے۔ "اخوان کا لائحہ عمل" "نظریہ اسلامی کا ارتقاء اور اس کے مقاصد" "ہم عوام تک اپنی دعوت کیونکر پہنچائیں" "روشنی کی طرف" "ہمارے مقاصد اور اصول" "ہماری دعوت" "ہماری تحریک" "امروز و فردا کے درمیان" "دعوتِ جہاد" "نوجوانوں سے خطاب" "اخوان المسلمون قرآن کے پرچم تلے" "مسلمان بہنوں کے فرائض" اور "روحانی تعلیم کا ایک پروگرام"۔ چند ایک کتابوں کے نام یہ ہیں "اخوان المسلمون صداقت کی میزان پر" "اسلامی ممالک کے مسائل" "فلسطین اور شمالی افریقہ" "جدید مغربی تہذیب کا زوال" "اسلام آگے بڑھتا ہے" اخوان نے حسن البناء کے انتہائی اہم علمی مضامین، خطوط اور مذاکرات کے مجموعے شائع کیے۔ اخوان کی مطبوعات اور رسائل و جرائد مصر ہی میں نہیں عربی زبان بولنے والے تمام ممالک میں بے حد مقبول ہوئیں۔ اس تحریک نے اسلامی نظریات کو بڑے جوشیلے اور کامیاب انداز میں پیش کیا۔ اس کے اعلیٰ درجے کے اصحابِ قلم نے، جن میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی، نہایت مؤثر اور توانا لٹریچر دیا۔ اس لحاظ سے زمانۂ قریب میں عرب ممالک میں ایسی کوئی اور اسلامی تحریک نظر نہیں آتی۔

اخوان نے اپنی تحریک میں خواتین کو روزِ اوّل ہی سے شامل کیا۔ "اخوات المسلمون" کی شاخوں کے بھی وہی نظریات تھے جو مردوں کے تھے۔ بس انہیں خواتین کی ضروریات کے مطابق بنا لیا تھا۔ ان کا مقصد خواتین کو عزت، نیکی اور عصمت و عفت کے مدارجِ عالیہ سے ہمکنار کرنا تھا۔ "اخوات" کی سرگرمیاں تعلیم اور سماجی بہبود کے امور پر مرکز تھیں۔

اخوان کی نمایاں ترین خصوصیت یہ تھی کہ وہ جہاد کی زبردست اہمیت پر مسلسل زور دیتے تھے۔ جہاد کے بارے میں اُن کا نقطۂ نظر وہی تھا جو ابتدا ہی سے مسلمانوں کا رہا ہے۔ اسی نقطۂ نظر کی وہ تبلیغ کرتے اور کسی قسم کی مرعوبانہ ذہنیت اور معذرت پسندانہ مصلحت سے کام نہ لیتے تھے اور نہ معذرت پسندوں کے ساتھ کسی قسم کی مصالحت روا رکھتے تھے۔ اخوان کی دعوت یہ تھی کہ جب تک کوئی مسلمان اپنے دین کے دفاع کے لیے جان تک قربان کرنے پر آمادہ نہیں

ہو تا اُس کا نماز روزہ اور دوسری عبادات بے فائدہ ہیں۔ پھر نیت بھی پاک صاف ہونی چاہیئے کوئی دنیوی منفعت مقصود نہ ہو بلکہ صرف اللہ کی خوشنودی، محبت اور آخرت پیش نظر ہے۔

اخوان المسلمون نے جذبۂ جہاد کو فروغ دینے کی خاطر نوجوانوں میں فوجی طرز پر ورزشوں اور جسمانی ریاضتوں کی حوصلہ افزائی کی، سکاؤٹ تحریک میں بھرپور دلچسپی لی اور بالآخر اپنی فوج قائم کرنے کی کوشش کی تاکہ بوقتِ ضرورت اپنا دفاع کر سکیں۔ حسن البنّا نے مصریوں کو برطانیہ کے خلاف جہاد کرنے پر اُبھارا اور انگریزوں کو ہمیشہ کے لیے اپنے وطن سے نکال باہر کرنے پر زور دیا۔ وہ اس معاملے میں کسی قسم کی مداہنت یا مصلحت گوارا کرنے پر تیار نہ تھے۔ وہ مذاکرات اور امن کانفرنسوں کے قائل نہ تھے جو ہمیشہ بے نتیجہ رہتی ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں جنگ فلسطین کے دوران میں اخوان کی رضاکار فوجوں نے عربوں کی طرف سے جنگ کرنے والی باقاعدہ افواج سے زیادہ ثابت قدمی اور بہادری کا مظاہرہ کیا۔ جب اقوام متحدہ نے صہیونی ریاست کے قیام کا اعلان کر دیا تو شیخ حسن البنّا نے اپنے ہفت روزہ اخبار "الدعوۃ" میں مسلمان ملکوں سے مطالبہ کیا کہ وہ اقوام متحدہ سے فوراً الگ ہو جائیں اور بنیان مرصوص بن کر یہودیوں کے خلاف جہاد کریں۔

شیخ حسن البنّا اور اُن کے حامی ہی پوری قوم میں اتنے جرأت مند تھے کہ وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور کھلے عام اعلان کیا کہ امت جن مفاسد میں مبتلا ہے ان سب کا حل اسلام اور صرف اسلام ہے۔ الاخوان المسلمون کا سب سے بڑا مقصد ایک اسلامی معاشرہ اور مقدس شریعت پر مبنی حکومت کا قیام تھا۔ حسن البنّا نے کہا:

"جب تک ہم قرآن کریم کو ایک مؤثر دستور کی حیثیت سے نافذ العمل نہیں دیکھ لیتے ہم نہ تو اطمینان سے بیٹھیں گے اور نہ خاموش رہیں گے۔ ہم یا تو اس مقصد کی خاطر زندہ رہیں گے یا اس کی جدوجہد میں ختم ہو جائیں گے۔"

الاخوان المسلمون کے لیے محض یہ بات اطمینان بخش نہ تھی کہ دستور میں اس مفہوم کی ایک دفعہ شامل کر لی جاتی ہے کہ مملکت کا مذہب اسلام ہوگا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ قانون سازی شریعت کے

مطابق کی جائے اور حکومت اور معاشرہ اسلامی قانون کی اطاعت کرے۔

حسن البنّا نے اپنی ایک اور تقریر میں کہا:

"اخوان المسلمون اسلام کو ایک ہمہ گیر اور مکمل نظام سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام معاملات کی نگرانی اسلام ہی کو کرنی چاہیئے۔ ہر چیز کو اس کی حکمرانی کے ماتحت اور اُس کی تعلیمات کے مطابق ہونا چاہیئے۔ وہ شخص جو عبادت کی حد تک تو مسلمان ہے، لیکن دوسرے تمام معاملات میں غیر مسلموں کے نقشِ قدم پر چلتا ہے کسی کافر سے بہتر نہیں ہے۔"

اپنے عہد کے ایک سیاسی لیڈر کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا:

"ہم آپ کو اسلام کی طرف بلاتے ہیں، اسلام کی تعلیمات کی طرف، اسلام کے ضوابط کی طرف اور اسلام کی ہدایت اور رہنمائی کی طرف۔ اگر آپ کے نزدیک یہ سیاست ہے تو ہم کہیں گے کہ ہاں یہ ہماری سیاست ہے۔"

چونکہ مصر میں صحیح معنوں میں جمہوریت موجود نہ تھی اس لیے شیخ حسن البنّا نے مطالبہ کیا کہ سیاسی جماعتوں اور پارلیمانی نظام کو ختم کر دیا جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ جماعتیں اور پارلیمانی نظام صرف ہوسِ اقتدار اور اخلاقی بگاڑ کو جنم دے رہے ہیں۔ شیخ حسن البنّا اور ان کے ہمدردوں کو یقینِ کامل تھا کہ ان سیاسی جماعتوں میں سے کوئی جماعت بھی نہ تو اسلامی قانون کے نفاذ کا ارادہ رکھتی ہے نہ اسلامی نظریات کو پسند کرتی ہے۔ اخوان مصر میں ایک مضبوط اور متحدہ اسلامی مملکت چاہتے تھے جس میں چھوٹی چھوٹی گروہ بندیوں کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ حسن البنّا اس اصول پر بہت زیادہ زور دیتے تھے۔ اتنا زور کہ اخوان کا رکن بننے والے ہر شخص کو یہ اعلان کرنا پڑتا تھا کہ وہ کسی سیاسی جماعت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

اخوان المسلمون اگرچہ مصر کو غیر ملکیوں کی غلامی سے چھٹکارا دلانے اور عرب اتحاد کو وقت کی ضرورت قرار دینے کی حد تک وطن عرب قوم پرستوں کے ہم خیال تھے، لیکن اُن کے نزدیک

یہ دونوں باتیں بجائے خود نصب العین نہ تھیں بلکہ نصب العین تک پہنچنے کا ذریعہ تھیں۔ عرب اتحاد اسلامی اتحاد کی منزل کی جانب محض ایک قدم تھا اور غیر ملکی اقتدار سے آزادی کا مطلب یہ تھا کہ اس طرح اسلامی قانون پر مبنی ایک ریاست قائم کرنے کا موقع ملے گا۔

۲۳ جولائی ۱۹۵۲ء کا انقلاب جس نے شاہ فاروق کی بساطِ اقتدار الٹ کر رکھ دی، بدقسمتی سے اپنی پیشرو حکومتوں کی مغرب پسندانہ پالیسی کو جاری رکھنے پر تُلا ہوا تھا؛ چنانچہ اُس نے خالصتًا قوم پرستانہ لادین ریاست قائم کر دی۔ وقت کی رفتار کے ساتھ یہ ثابت ہو گیا کہ نئی حکومت اخوان المسلمون کی اتنی ہی دشمن ہے جتنی کہ پُرانی حکومتیں تھیں۔ مطلق العنان اقتدار کی طلب میں تو وہ ان حکومتوں سے زیادہ حریص اور ظالم و جابر نکلی۔ اخوان اپنے لیے اقتدار کے طالب نہ تھے۔ انہوں نے بار بار یہ وعدہ کیا کہ جو حکمران بھی اسلامی قوانین نافذ کرے گا وہ اس کی حمایت کریں گے، لیکن نئی فوجی آمریت نے ان کی اس پیش کش کو دو ٹوک مسترد کر دیا۔ صدر جمال عبدالناصر نے کہا:

"میں نے اخوان المسلمون کے مرشدِ عام سے ملاقات کی۔ انہوں نے مجھ سے کئی مطالبات کر دیئے۔ پہلی بات یہ کہی کہ ہم عورتوں کو پردہ کرنے کا حکم جاری کریں۔ پھر مزید مطالبات کیے۔ مثلاً سینما اور تھیٹر بند کر دیئے جائیں۔۔۔۔۔ بالفاظِ دیگر زندگی کو تیرہ و تار اور افسردہ و حزیں بنا دیا جاتے۔ بلاشبہ ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔"[۱]

دسمبر ۱۹۵۴ء میں صدر جمال عبدالناصر پر قاتلانہ حملے نے وہ مثالی بہانہ فراہم کر دیا جس کی حکومت منتظر تھی۔ اخوان نے اگرچہ لاکھ انکار کیا، لیکن اس واقعہ کی ساری ذمہ داری ان کے سر تھوپ دی گئی۔ ہزاروں اخوان گرفتار کر کے جیلوں میں ٹھونس دیئے گئے اور چھ کو عالمِ اسلام کے گوشے گوشے سے اٹھنے والے احتجاج کے علی الرغم پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ بارہ برس کے

---

[۱] *Muslimnews International*, February 1968, Karachi, p. 25.

بعد ۱۹۶۶ء میں اسی حکومت نے اپنی ناکامیوں اور کوتاہیوں کے لیے اخوان کو ایک بار پھر قربانی کا بکرا بنانے کا فیصلہ کیا؛ چنانچہ صدر ناصر کی حکومت نے "اخوان المسلمون" کی رجعت پسند تحریک کے اثرات کو ختم کرنے اور شر پسند اخوان کو فوجی طاقت اور عدالتی چارہ جوئی کے ذریعے نیست و نابود کرنے کی تمام ممکن تجویزیں پیش کرنے کے لیے اعلیٰ اختیارات کی حامل ایک خصوصی کمیٹی قائم کی۔ اس کمیٹی نے جو تجاویز پیش کیں ان میں سے چند مکہ مکرمہ کے اخبار الندوہ کے حوالے سے درج کی جاتی ہیں:

۱۔ دینیات اور اسلامی تاریخ کے مضامین ملک بھر کے تعلیمی اداروں سے مکمل طور پر ختم کر دیئے جائیں اور اُن کی جگہ سوشلزم کے اصولوں سے ہم آہنگ نیا نصابِ تعلیم رائج کیا جائے۔

۲۔ مذہب کا نام و نشان مٹانے کے لیے کمیونزم کو ہر طرح کے حربے اختیار کرنے کے مواقع فراہم کیے جائیں تاکہ ملک میں مذہبی لوگوں کا مرتبہ و مقام ختم ہو جائے۔ ہماری حکومت کا فرض ہے کہ وہ تمام مذہب دشمن کمیونسٹ سرگرمیوں کو زور شور سے جاری رہنے کی اجازت دے۔ اس کے برعکس مذہب کو ان تمام مواقع سے محروم کر دے۔

۳۔ جن مذہبی لوگوں کا اخوان المسلمون سے تعلق تو نہیں ہے، لیکن ٹھیک انہی کا کردار ادا کر رہے ہیں، اُن کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ "مذہب باز" اور یہ دونوں گروہ فکر و عمل میں یک رنگ ہیں۔ بنابریں انہیں ایک دوسرے سے الگ تھلگ رکھا جائے، ان کے باہمی روابط بالکل کاٹ دیئے جائیں، ورنہ وہ دن قریب ہے جب یہ دونوں متحد ہو کر حکومت کے خلاف کھلی بغاوت کر دیں گے۔ اس وقت ان کے درمیان امتیاز کرنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ لہٰذا دانش مندی کا تقاضا ہے کہ اس خطرے کو ابتدائی مرحلے ہی میں کچل ڈالا جائے اور تمام "مذہب بازوں" اور رجعت پسندوں سے یکساں سلوک کیا جائے۔ ان کی ترقی کے تمام راستے بند اور فکری و عملی کام کرنے کے مواقع ختم کر دیئے جائیں۔ ان کی باہمی ملاقاتوں اور صلاح مشوروں کے بارے میں مسلسل تحقیقات کی جاتی رہے۔ مذہب کے تمام پرستار خواہ

ان کا تعلق کسی بھی تنظیم سے ہو، اُن کا تعقب بلا تاخیر کچل دیا جائے۔ اخبارات اور نشر و اشاعت کے ذرائع، قومی، معاشرتی اور سرکاری تقریبات کے دروازے ان پر ہمیشہ کے لیے بند کر دیئے جائیں۔

۴۔ اخوان اور ان سے ہمدردی رکھنے والے تمام لوگوں کو قید و بند کے عذاب اور تہدید و تخویف کا مسلسل ہدف بنایا جائے۔ ان کی املاک کو ہر قسم کے تحفظ سے محروم کر دیا جائے اور صاف صاف کہہ دیا جائے کہ حکومت ان کے تحفظ کی ذمہ دار بالکل نہیں ہے۔ ان لوگوں کو گوناگوں جبر و تشدد، تعذیب و اذیت کا ہدف بنایا جائے اور ان کے ساتھ اہانت آمیز سلوک روا رکھا جائے اور اس دردناک عذاب سے انہیں ایک لمحے کے لیے بھی نجات نہ ملنے پائے۔[1]

اس پالیسی کے نتیجے میں عورتوں سمیت ہزاروں اخوان گرفتار کر لیے گئے۔ انہیں صفائی کا قانونی حق بھی نہ دیا گیا اور انتہائی بے دردی سے تعذیب و اذیت کی بھٹی میں جھونک دیا گیا۔ حسن اسمٰعیل الہضیبی مُلک کے ایک نامور جج اور فاضل شخص تھے، شیخ حسن البناءؒ کی جگہ مرشد عام منتخب ہوئے انہیں بڑھاپے اور کمزور صحت کے باوجود بھاری بھرکم زنجیروں سے پیٹا گیا۔ ۲۹ر اگست کو اخوان کے تین رہنماؤں کو موت کی سزا دے دی گئی۔ ان شہداء میں ممتاز ترین شخص سیّد قطب تھے جن کا شمار عرب دنیا کے انتہائی نامور فضلاء اور مصنفین میں ہوتا تھا۔ ان کے بھائی محمد قطب، جو خود بھی ایک مشہور مصنف تھے، اور بہن امینہ قطب چند ماہ پہلے ظلم و تشدد کی تاب نہ لاکر جیل ہی میں فوت ہو چکے تھے۔ ان کی ایک اور بہن حمیدہ قطب کو دس سال قید بامشقت کی سزا دی گئی جو جیتے جی موت کے مترادف تھی۔

شیخ حسن البناءؒ کئی سال پہلے ان آفات و مصائب کی پیشین گوئی کر چکے تھے۔

---

[1] بحوالہ ڈیلی پاکستان ڈھاکہ ۳ر اکتوبر ۱۹۶۶ء ص ۷ مقالہ:

"Atrocious Methods to Crush Religion in Egypt."

انہوں نے اپنے پیروکاروں کو متنبہ کیا تھا کہ اُن کا تمسخر اُڑایا جائے گا، ان کی مخالفت کی جائے گی، ان کی راہ میں روڑے اٹکائے جائیں گے، انہیں کچلا اور ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا جائے گا، ان پر مصائب کے پہاڑ توڑے جائیں گے، لیکن بالآخر دنیا اور آخرت میں فتح و کامرانی انہی کو حاصل ہوگی۔

اخوان اگرچہ اپنی سرزمین میں کچلے جا چکے ہیں، تاہم شام[1]، اردن، لبنان اور سوڈان میں وہ اب بھی سرگرم عمل ہیں۔ شیخ حسن البناءؒ کے داماد ڈاکٹر سعید رمضان جنہیں جمال عبدالناصر کی حکومت نے عبدالقادر عودہ وغیرہ کے ساتھ سزائے موت دی تھی، لیکن وہ جان بچا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے، جینوا (سوئٹزرلینڈ) میں مقیم ہیں اور مغربی دنیا میں اسلام کی دعوت کو بڑے جوش و جذبے کے ساتھ پھیلا رہے ہیں۔ اخوان کی سرگرمیوں کے بارے میں جماعتِ اسلامی حلقہ کراچی کے امیر چودھری غلام محمد نے چند سال پہلے کہا تھا:

"یہ تصور غلط ہے کہ الاخوان المسلمون کی دعوت مر چکی ہے۔ ان سطور کا راقم مصر اور شام جا چکا ہے۔ وہاں اس نے اس تحریک کے اثرات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ایک غیر حقیقی صورتِ حالات کی بنا پر اخوان کی تنظیم عارضی طور پر منظر سے غائب ہو جانے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ تنظیم کا وجود فی الواقع ختم ہو چکا ہے۔ نظریاتی تحریکیں اس طرح کبھی نہیں مرتیں۔ ان کے پیغام کی اشاعت جاری رہتی ہے۔ اخوان کی دعوت آج بھی فکری، معاشرتی اور ثقافتی میدانوں میں ترقی پذیر ہے اور نئے نئے میدان فتح کر رہی ہے۔ جب بھی استبداد کی عائد کردہ بندشیں دور ہوں گی یہ

---

[1] جب سے بعث پارٹی نے فوج کے ذریعے ملک کی جمہوری حکومت کا تختہ اُلٹا ہے اخوان کی سرگرمیاں شام میں بھی ختم ہو چکی ہیں۔ سینکڑوں اخوان کارکن اور رہنما قید و بند کی سختیاں جھیل رہے ہیں اور متعدد دوسرے غیر سوشلسٹ عرب ممالک میں پناہ گزین ہیں۔ (مترجم)

تحریک انشاء اللہ پہلے سے کہیں زیادہ طاقت ور بن کر اُبھرے گی۔ یہ ہے اخوان کی حقیقی حیثیت، لیکن مصر کی لادین سیاسی پارٹیوں کا کیا بنا؟ وفد پارٹی آج کہاں ہے؟ سعد پارٹی کہاں گئی؟ ہمارے ملک کے دانشور ذرا مصر جائیں اور دیکھیں کہ کون سی جماعت زیادہ سخت جان ثابت ہوتی ہے؟"؎

؎ جماعتِ اسلامی اور خارجہ پالیسی ۱۹۶۴ء۔

مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ

آزادیِ ہند اور اسلام کی روحانی سالمیت و اتحاد کے پُرجوش نقیب مولانا محمد علی ۱۸۷۹ء میں رامپور میں طبقۂ امراء کے ایک خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد عبدالعلی، نواب رامپور کے درباری تھے اور رامپور کے ہر پابندِ وضع امیر کی طرح قرض کے بار تلے دبے ہوئے تھے۔ محمد علی ابھی بچّہ ہی تھے کہ ان کے والد کو ہیضہ ہُوا اور چند گھنٹے بیمار رہنے کے بعد جوانی ہی میں چل بسے۔ ان کی والدہ اس وقت صرف ۲۷ برس کی تھیں، تقریباً نصف درجن بچوں کی دیکھ بھال کا بار اُن پر آپڑا، لیکن وہ بڑی بہادر اور قابل خاتون تھیں۔ انہوں نے دوسری شادی کرنے یا کسی سے مالی امداد لینے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ ناخواندہ ہونے کے باوجود بے حد ذہین تھیں۔ انہیں خوب علم تھا کہ اُن کے بچوں کی دنیوی کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ انہیں انگریزی تعلیم دی جائے۔ جائداد کا انتظام محمد علی کے چچا کے ہاتھ میں تھا اور وہ انگریزی تعلیم کے سخت مخالف تھے۔ والدہ نے خفیہ طور پر اپنے زیورات رہن رکھ کر قرض لیا اور اپنے دو بڑے بیٹوں ذوالفقار اور شوکت کو سکول میں داخل کروا دیا۔ جب چچا کو پتہ چلا کہ اُن کے ساتھ داؤ کھیلا گیا ہے تو با دلِ نخواستہ محمد علی کو بھی سکول میں داخل کرنے کی اجازت دیدی۔ محمد علی نے پہلے رامپور میں پڑھا، پھر بریلی میں اور آخر کار علی گڑھ میں۔ بچپن میں محمد علی میں کوئی خاص امتیازی بات نظر نہ آتی تھی۔ وہ عام صحت مند

بچوں کی طرح اپنے سگے اور عم زاد بہن بھائیوں کے ساتھ دھما چوکڑی کرتے اور غل غپاڑہ مچا کر کھیلتے تھے۔ البتہ وہ بے حد اودہم باز اور شریر تھے اور اپنی ماں کے لیے جو سداکی روگی تھیں، وبالِ جان بنے رہتے تھے۔

زندگی کا دریا کسی ہنگامے کے بغیر خاموشی کے ساتھ رواں دواں تھا۔ ۱۸۹۷ء میں محمد علی نے الہ آباد یونیورسٹی کے بی اے کے امتحان میں اوّل آ کر سب لوگوں کو چونکا دیا۔ الہ آباد یونیورسٹی ان دنوں پورے اتر پردیش، بعض متصلہ صوبوں اور دیسی ریاستوں کے سکولوں اور کالجوں کے طلبا کا امتحان لیا کرتی تھی۔ یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ اُن کے بڑے بھائی شوکت علی نے جو ان دنوں سرکاری ملازم تھے، مصارف کا انتظام کر کے انہیں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان بھیج دیا۔ محمد علی نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے تاریخ میں آنرز کی ڈگری لی۔ وطن واپس آئے تو ریاست رامپور کے محکمہ تعلیم میں ایک اعلیٰ منصب پر فائز کر دیے گئے۔ پھر چار برس تک ریاست بڑودا میں ملازمت کرتے رہے۔ یہیں انہوں نے سول سروس چھوڑ کر صحافت کے ذریعے اپنے ملک کی خدمت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگرچہ انہیں اس میدان میں پہلے کوئی تجربہ نہ تھا تاہم انہوں نے بڑی جرأت مندی کے ساتھ انگریزی اخبار "کامریڈ" اور اردو اخبار "ہمدرد" کی بنیاد رکھی۔ انہیں انگریزی اور اردو دونوں زبانوں پر زبردست قدرت حاصل تھی اور اس میدان میں اُن کا کوئی ثانی نہ تھا۔ برطانوی حکومت کی کمزوریوں پر اُن کی تنقید بڑی ذہانت پر مبنی ہوتی۔ ملک کو جو انتہائی اہم مسائل درپیش تھے، اُن کا بڑا گہرا تجزیہ کرتے۔ اُن کی ان خوبیوں نے پوری قوم کی توجہ کو اپنی جانب کھینچ لیا۔ برطانوی حکومت ایسے شخص کو زیادہ دیر تک نظرانداز نہ کر سکتی تھی۔ اسی زمانے میں پہلی جنگِ عظیم چھڑ گئی۔ محمد علی نے ایک طویل اور یادگار اداریہ لکھا جس کا عنوان تھا "ترکوں کا انتخاب"۔ اس اداریے میں ترکوں کے مؤقف کی حمایت کرتے ہوئے انہوں نے لکھا کہ چونکہ انگلستان اور اس کے اتحادیوں نے مسلمانوں کے اقتدار کے ساتھ سخت دغابازی اور نفرت و عداوت سے کام لیا ہے اس لیے کوئی وجہ نہ تھی کہ ترک

جرمنی کا ساتھ نہ دیتے۔ انگریزی حکومت نے "کامریڈ" کو بند کر دیا اور محمد علی اور اُن کے بڑے بھائی شوکت علی کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔

جس زمانے میں وہ کامریڈ اور ہمدرد کے ایڈیٹر تھے، ان کا اسلامی شعور بیدار ہونا شروع ہوا۔ محمد علی اور شوکت علی اُس وقت بالکل نوجوان تھے اور دوسرے سینکڑوں انگریزی تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی طرح انگریزی بولتے اور مغربی طور اطوار رکھتے تھے۔ جیسا کہ محمد علی نے اپنی سرگزشت میں لکھا ہے کہ اُن کے اندر مسلمانوں کے ملّی وجود کا احساس ۱۹۱۱ء میں اس وقت پیدا ہوا جب جنگ بلقان میں ترکی اور عثمانی سلطنت کا وجود تک خطرے میں پڑ گیا تھا۔ قسطنطنیہ صرف ترکی کا دارالحکومت ہی نہ تھا بلکہ خلافت کا مرکز ہونے کی وجہ سے عالم اسلام کا دل بھی تھا۔ ایسا دل جس کے بارے میں ہندوستانی مسلمانوں کا احساس یہ تھا کہ ترکی کی سالمیت کو اگر کوئی خطرہ درپیش آتا ہے تو گویا خود ان کا اپنا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ محمد علی لکھتے ہیں:-

"مسلمانوں کے ملّی وجود کا احساس کس طرح پیدا ہوا اس کی وضاحت میرے بھائی شوکت علی کی داستان سے بڑھ کر اور کوئی چیز نہیں کر سکتی۔ ۱۹۱۳ء میں اُنہوں نے انجمن خدّامِ کعبہ کے قیام میں نمایاں حصّہ لیا۔ اس انجمن کا مقصد حرمِ مکّہ، حرمِ مدینہ اور حرمِ بیت المقدس (یروشلم) کی بزرگی اور تقدس کو برقرار رکھنے کے لیے تمام فرقوں کے مسلمانوں کو مجتمع اور متحد کرنا تھا۔ میرے بھائی کو فوری طور پر بمبئی جانا پڑا کیونکہ حاجیوں کو بحری سفر کے لیے جگہ حاصل کرنے میں سخت وقت پیش آ رہی تھی۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے محسوس کیا کہ اس متمول بندرگاہ میں اللہ کے ان ہزاروں مہمانوں کی تکالیف کا ازالہ کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ حاجیوں کا ایجنٹ بننے کا اجازت نامہ لیا جائے۔ اس پیشے نے ان کی زندگی کے رنگ ڈھنگ کو یکسر بدل ڈالا۔ وہ برطانوی حکومت کے ایک نہایت چاق چوبند

نیم فرنگی اور فیشن ایبل افسر تھے۔ علی گڑھ کی کرکٹ ٹیم کے مشہور کپتان ہونے
کی حیثیت سے کھیل کے میدان میں ان کے کارناموں کی دھوم تھی، چنانچہ
جم خانوں اور کلبوں میں اُن کی بڑی مانگ تھی، وہ ریشمی قمیصوں کا بڑا حسین
ذوق رکھتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ اب وہ لمبی والا بن گئے جس
کے جسم پر گھٹیا اور بوسیدہ کپڑے اور ایک عجیب وضع قطع کا ڈھیلا ڈھالا
سبز کوٹ تھا۔ ہموار چکنے رخساروں اور ٹھوڑی پر اب جھاڑ سی ناہموار داڑھی
نظر آتی تھی جس کے بارے میں وہ خود کہا کرتے تھے کہ یہ اُن کا یورپ اور عیسائی
دنیا کے خلاف انتہائی پُرجوش احتجاج ہے[1]

محمد علی جب بچے تھے تو انہیں قرآن کی چند چھوٹی سورتیں زبانی یاد کرائی گئی تھیں جن کے ایک
لفظ کے معنی بھی انہیں نہ آتے تھے۔ اسی طرح انہیں وضو کرنا اور روزانہ پنج وقتہ نماز پڑھنا بھی سکھایا
گیا تھا۔ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کو پھیلانے کے جوش و خروش میں علی گڑھ کے نصابِ تعلیم میں
اسلام کو تقریباً بالکل نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ "دینیات کے گھنٹے" میں عربی اور فارسی کی تعلیم دینے
کے لیے "بے کار سے لوگ" رکھے گئے تھے جنہیں تنخواہ بھی تھوڑی سی دی جاتی تھی۔ "دینیات
کا گھنٹہ" لڑکوں کے لیے اس قدر غیر دلچسپ ہوتا تھا کہ وہ یا تو کلاس سے بھاگ جاتے تھے یا
ہر طرح کا ستم ظریفانہ مذاق کرتے اور لطف اندوز ہوتے رہتے تھے۔ آکسفورڈ سے سند
فراغت حاصل کیے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ محمد علی کو یہ احساس ہوا کہ تعلیم پوری کرنا تو دور کی
بات ہے ابھی انہوں نے شروع ہی نہیں کی۔ نظر بندی کے دوران میں انہوں نے قرآن و حدیث
ترجمے سے پڑھی اور اس طرح زندگی میں پہلی مرتبہ ان کے معانی و مفہوم سے آشنا ہوئے۔ اسلام

---

[1] *My Life — A Fragment*, Mohammad Ali Jauhar, Shaikh Mohammad Ashraf, Lahore, pp. 67—68.

کے اس ذاتی مطالعہ نے محمد علی کی زندگی کی کایا پلٹ دی۔ اب وہ محض نام کے مسلمان نہ رہے
تھے بلکہ نومسلموں کے سے جوش و جذبہ سے بہرہ ور ہو چکے تھے۔ اپنے اس تجربے کا ذکر وہ
حسب ذیل الفاظ میں کرتے ہیں۔

"اب میں ایک ایسا آدمی تھا جس کے قبضے میں سچائی کا راز آ چکا تھا، جس کا
دل و دماغ پھٹنے کے قریب تھا، نبض کی دھڑکن فی منٹ ۱۵۰ تک پہنچ چکی
تھی اور خون جس کی رگ رگ میں جھنجھنا رہا تھا، جو انسان کے بجائے اپنے آپ
کو ایک ایسا بم محسوس کرتا تھا جو پھٹنے کے لیے بالکل تیار تھا، جو انسانی وجود
کے بجائے کسی اور وجود کے ارادے کا محکوم تھا، جو سوچ سمجھ سکتا تھا، فیصلہ کر سکتا
اور اس کے اعمال اور تقریباً نگرانی کر سکتا تھا۔۔۔۔۔۔۔ (ص ۱۵۰)۔۔۔۔۔۔۔
اب جب کہ چند سال گزر چکے ہیں، میں اپنے مستقل اعتقادات کی روشنی میں، جو
دیکھتے تو ہیں مگر اب الاؤ کی سی صورت برقرار نہیں رہی، ان ڈرنک بھرے
دنوں پر پلٹ کر نگاہ ڈالتا ہوں تو نومسلم مبلغ کے اس ابتدائی جوش و خروش پر
مسکرا اٹھتا ہوں، خدا کا شکر ہے کہ ہنستا نہیں ہوں۔ (ص ۱۵۲)۔۔۔۔۔
مَیں نے خدا کو دریافت کر لیا تھا اور اُسے دریافت کر کے مَیں نے اپنے آپ کو
دریافت کر لیا۔ مجھ پر زندگی کے نئے معانی آشکارا ہو گئے تھے۔ جیسے میں اب
تک پوری طرح نہ سمجھ سکا تھا۔ اس نئی زندگی کے مقابلے میں میری گزشتہ
زندگی بالکل کھوکھلی اور ویران نظر آتی تھی[1]۔۔۔۔۔ (ص ۱۲۰)

پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر ترکوں کو ایک انتہائی ذلت آمیز معاہدۂ صلح پر دستخط
کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔ چونکہ ہندوستانی مسلمانوں کو اندیشہ تھا کہ اس معاہدے کا مقصد

---

[1] حوالۂ سابق۔

دنیا کی سیاست سے اسلام کے اثرات کو ختم کرنا ہے اس لیے انہوں نے ترکی کی شکست کو اپنی شکست سمجھا۔ مدراس، لکھنؤ، دہلی اور دوسرے مقامات پر مسلمانوں نے زبردست مظاہرے کیے اور فاتحین ترکی کے ساتھ جو شرمناک سلوک کر رہے تھے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ پھر ۲۴ نومبر ۱۹۱۹ء کو بمبئی میں خلافت کمیٹی قائم کی۔ کیونکہ غیر مسلموں کو بھی اس میں حصہ لینے کی اجازت تھی اس لیے خلافت کے جلسوں میں مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو ایسے ممتاز رہنما بھی شریک ہوتے تھے۔ محمد علی اور ان کے بھائی شوکت علی جیل سے رہا ہوئے تو وہ تحریک خلافت کی روح رواں بن گئے۔ مولانا محمد علی ایک وفد لے کر انگلستان گئے اور برطانوی حکومت کے سامنے مسلمانوں کا یہ مطالبہ رکھا کہ عثمانی سلطنت کی سالمیت کو برقرار رکھا جائے اور اُس کے حصے بخرے نہ کیے جائیں۔ برطانوی وزیراعظم لائیڈ جارج نے اس مطالبے کو مسترد کر دیا۔ آخرکار محمد علی نے یورپ کی رائے عامہ کو ترکی کے حق میں ہموار کرنے کی کوشش کی۔ پیرس اور لندن میں زبردست تقریریں کیں اور بڑی طاقتوں کی دغابازیوں اور ناپاک مقاصد کو بے نقاب کیا۔ خلافت وفد ابھی لندن ہی میں تھا کہ ۱۹۲۰ء میں معاہدۂ سیورے طے پا گیا جس کی رُو سے عثمانی سلطنت کے حصے بخرے کر دیئے گئے۔ اسی موقع پر مہاتما گاندھی نے بڑی عیاری سے یہ تجویز پیش کی کہ تحریک خلافت اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ان کے عدم تشدد کے طریقوں کو اپنائے۔ اس طرح محمد علی سے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی سرزد ہو گئی۔ انہوں نے اس تجویز کو قبول کر لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس عظیم اسلامی تحریک کی قسمت ہندوؤں کے رحم و کرم پر منحصر ہو کر رہ گئی؛ تاہم اُس وقت محمد علی اپنی مہلک غلطی کا پورا اندازہ نہ کر سکے۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے قائل رہے جو ان کے نزدیک آزاد اور خوش حال ہندوستان کے لیے نہایت ضروری تھا۔ وہ کہا کرتے تھے: "جہاں تک خدا کے احکامات کا تعلق ہے میں اوّل و آخر مسلمان ہوں اور مسلمان کے سوا کچھ نہیں، لیکن جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے میں اوّل بھی ہندوستانی ہوں اور آخر بھی ہندوستانی ہوں اور ہندوستانی کے سوا کچھ نہیں ہوں۔"

۱۹۲۲ء میں تحریک خلافت اپنے پُورے عروج پر تھی۔ ٹھیک اسی وقت مہاتما گاندھی نے انگریزوں کے خلاف تحریک بند کر دینے کا اچانک اعلان کر دیا۔ اس اعلان کو جس نے بھی سنا بھونچکا ہو کر رہ گیا، خود ان کے ہندو حامی بھی اس فیصلے پر دم بخود تھے۔ گاندھی جی کے اس طرز عمل سے مسلمان بجا طور پر اس نتیجے پر پہنچے کہ گاندھی جی نے تحریک خلافت میں شرکت اس لیے نہیں کی تھی کہ انہیں تحریک کے نظریات اور مقاصد سے واقعی ہمدردی تھی بلکہ اس طرح وہ اپنی سیاسی طاقت کو بڑھانا اور مسلمانوں پر ہندوؤں کے اقتدار کو مسلط کرنا چاہتے تھے۔

مولانا محمد علی سے نادانستگی میں خواہ کیسی ہی غلطی سرزد ہوتی ہو، وہ اسلامی مقصد کی راہ میں ثابت قدم رہے۔ اسلامی نظریات سے ان کے اخلاص کامل اور ان کی خاطر اپنی زندگی وقف کرنے کا واضح ثبوت اس وقت ملا جب ۱۹۲۱ء میں خلافت کمیٹی نے ایک قرارداد منظور کی جس میں مسلمانوں سے کہا گیا تھا کہ وہ ترکوں سے لڑنے کے لیے برطانوی فوج میں شامل نہ ہوں۔ اس پر انہیں، ان کے بھائی مولانا شوکت علی کو اور ان کے دو ساتھیوں کو جن میں سے ایک مشہور ہندو مذہبی رہنما تھا، مسلمان فوجوں کو برطانوی تاج سے بغاوت پر اکسانے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ مولانا محمد علی نے عدالت میں اس الزام کا جواب دیتے ہوئے کہا:

"کیا برطانوی رعایا کے کسی فرد کے لیے خدا کا قانون زیادہ اہمیت رکھتا ہے یا بادشاہ کا قانون ——— ایک انسان کا بنایا ہوا قانون؟ اسلام میں ہر انسان کی نجات کا انحصار ان باتوں پر ہے: وہ خدا و رسولؐ پر اعتقاد و ایمان رکھے، اس اعتقاد و ایمان کے مطابق عمل کرے اور اس اعتقاد و ایمان کی تبلیغ و اشاعت کرے۔ وہ شخص جو اسلام پر ایمان رکھتا ہے نماز پڑھتا ہے، زکوٰۃ اور صدقات دیتا ہے، رمضان کے مہینے میں روزے رکھتا ہے، حج کے لیے مکہ معظمہ جاتا ہے اور کسی کو دکھ نہیں دیتا، لیکن کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ وہ محض ان باتوں سے نجات پا جائے گا؟ نہیں، کیونکہ

قرآن ان اصولوں کی تبلیغ و اشاعت کا حکم دیتا ہے ۔ وہ کہتا ہے تم محض اپنے آپ کو بچانے کے لیے پیدا نہیں ہوئے ۔ تم یہاں اپنے پڑوسیوں کو بھی بچانے کے لیے آئے ہو۔ اگر کوئی مسلمان یہ کہتا ہے کہ اس کا ایمان ہے کہ دوسرے مسلمان کو قتل کرنا حرام ہے، لیکن وہ جاتا ہے اور اُسے قتل کر دیتا ہے، ایسے شخص کو نجات نہیں مل سکتی۔

فرض کیجیے اُس کا ایمان ہے کہ مسلمان کو قتل کرنا حرام ہے، چنانچہ وہ خود تو قتل نہیں کرتا، لیکن ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا ہے اور دوسرے لوگوں کو کھلی چھوٹ دیدیتا ہے کہ وہ اس کو قتل کر دیں تو اس صورت میں بھی نجات سے ہم کنار نہیں ہو سکتا۔ نجات صرف اُسی شخص کو ملتی ہے جو دوسروں کو خبردار کرتا ہے کہ مسلمان کا قتل حرام ہے اور اگر اس کی جدوجہد ناکام ہوتی ہے تب بھی اس رائے پر ثابت قدم رہتا ہے۔ پھر اگر وہ اپنی کوششوں میں ناکام رہے اور تعزیراتِ ہند کی دفعہ ۵۰۵ اور دفعہ ۱۷ کے تحت مصائب میں گرفتار ہو جائے، تو اُسے کیا کرنا چاہیے؟ اُسے چاہیئے کہ صبر و تحمل کا مظاہرہ کرے۔ ممکن ہے اُس کو پھانسی دے دی جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ غرق کر دیا جائے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُس کی جاں بخشی کر دی جائے، لیکن اُس کو ہر حالت میں اپنے مشن میں صبر و استقلال کا مظاہرہ کرنا چاہیئے ۔ اسی صورت میں وہ نجات پا سکے گا اور ابدی عذاب سے محفوظ رہ سکے گا۔ اُسے خدا کے قانون میں ایک لفظ بدلنے کی کوشش بھی نہیں کرنی چاہیئے۔ ہمیں بہرصورت اس قانون کی اطاعت کرنی اور اس کے نتائج کا سامنا کرنا چاہیئے۔[۱]...."

---

[۱] *The Writings and Speeches of Maulana Mohammad Ali*, edited by Afzal Iqbal, Vol. II, pp. 72-73.

اگرچہ ہر شخص متوقع تھا کہ علی برادران کو موت کی سزا نہ ملی تو عمر قید کی سزا تو ضرور ملے گی، لیکن جوری نے متفقہ طور پر انہیں "بے قصور" قرار دیا۔

مولانا محمد علی صحیح معنوں میں "کٹر" مسلمان تھے۔ علی گڑھ مکتبِ فکر کے برعکس، جہاں اُن کی فکری تربیت ہوئی تھی، تجدد پسندی اُن کے عقائد کو چھو نے بھی نہ پائی تھی۔ اگر میرے سمیت کوئی بھی فانی انسان من گھڑت تعبیر و تطبیق کے نام پر خدا کے حکم میں کوئی ردّ و بدل کرتا ہے تو انتہائی سخت گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ اگر ہندو یا کسی دوسرے "ترقی پسند" مذہب کے پیرو اپنے مذاہب کے متعلق کوئی قانون سازی کرنا چاہتے ہیں تو بڑی خوشی سے کریں، مجھے ان پر ذرا بھی اعتراض نہیں، لیکن میرا مذہب ترقی پسند نہیں، وہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ دین ہے۔ دوبارہ جب کبھی متنوع عمل کا تقاضا ہوگا، میں دھیان رکھوں گا کہ اسلام انسانی قانون سازیوں سے بالا و برتر رہے۔ اِس حقیقت کو پسِ پشت ڈالے بغیر کوئی مسلمان کسی انسانی دستور کا وفادار رہنے کی حامی نہیں بھر سکتا، خواہ وہ دستور ہندوستانی پارلیمینٹ نے بنایا ہو یا برطانوی۔

ان الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ مولانا محمد علی نے بدنامِ زمانہ شاردا ایکٹ کی، جو ۱۹۱۹ء میں منظور کیا گیا تھا اور جس کے تحت ۱۴ سال سے کم عمر لڑکی اور ۲۱ سال سے کم عمر لڑکے کی شادی ممنوع قرار دیدی گئی تھی، کس قدر شدید مخالفت کی تھی۔ مولانا محمد علی خوب سمجھتے تھے کہ اس ایکٹ کے ذریعے شریعت پر مبنی مسلمانوں کے شخصی اور خاندانی قوانین کو ختم کر دینے کا آغاز ہو گیا ہے۔ انہوں نے اس ایکٹ کے خلاف رائے عامہ کو ابھارنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ ملک بھر کا دورہ کیا اور جوش انگیز تقریریں کر کے مسلمانوں کو اس قسم کی بے قید قانون سازی کے خطرات سے خبردار کیا۔ انہوں نے کہا:

"شخصی قانون میں عدمِ مداخلت کی ضمانت کو بنیادی قوانین کا ایک حصہ قرار دیا جائے اور مذہبی آزادی برقرار رکھنے کا یقین دلایا جائے۔ مسلمانوں نے نہرو رپورٹ کے مجوزہ نام نہاد ہندو مسلم سمجھوتے کو جو مسترد کر دیا ہے تو اس کی ایک

وجہ یہ ہے کہ اس میں مسلمانوں کے شخصی قانون کے تحفظ کی کوئی ضمانت نہیں دی گئی، حالانکہ برطانوی حکومت بار بار اس کی ضمانت دے چکی ہے ۔۔۔۔۔۔
اسلامی قانون مسلمان مردوں اور عورتوں کو آزادی دیتا ہے کہ وہ کسی عمر میں بھی نکاح کر سکتے ہیں ۔ اسلامی قانون کا اطلاق تمام ادوار، تمام ملکوں اور ہر قسم کے حالات پر ہوتا ہے ۔ اسی لیے یہ ایک مثالی قانون ہے ۔ لیکن اب جس قسم کا قانون نافذ ہونے چلا ہے وہ نہ صرف انسانی آزادی کو پابہ زنجیر کر دیتا ہے بلکہ خود قانون کو بھی سخت اور بے لچک بنا دیتا ہے ۔ قانون کے لیے ضروری ہے کہ وہ انسانی فطرت کو منضبط کرے نہ کہ اس کے راستے میں حائل ہو ۔ اسلام غلطی کرنے کو قبول نہیں کرتا، تاہم نہاد "مصلحین" انسان کی ۔۔۔ طبعی و اخلاقی ۔۔۔ فطرت کے متعلق اپنے خالق کے مقابلے میں یقیناً کچھ بھی نہیں جانتے ۔ اسلام اُن کے طور طریق کی پیروی کرنے کے بجائے معاشرے کی اخلاقی پاکیزگی کا تحفظ کرتا ہے ۔ (ص ۲۲۶) ۔۔۔۔۔۔۔
شاردا ایکٹ بچپن کی شادی کو مستوجبِ سزا ٹھہراتا ہے ۔ وہ ناجائز تعلقات کو ممنوع قرار نہیں دیتا ۔ بالفاظِ دیگر وہ کہتا ہے : "تم شادی نہیں کر سکتے، البتہ زنا کر سکتے ہو" بلکہ عملاً بعض حالات میں وہ کہتا ہے : "تمہیں شادی نہیں کرنی چاہیے ہاں اس کے بجائے تمہیں زنا ضرور کرنا چاہیے" اس کے برعکس اسلام کہتا ہے : "تم کسی عمر میں بھی شادی کر سکتے ہو، لیکن زنا کے قریب تک نہیں پھٹک سکتے" یہ تضاد اتنا واضح اور یقینی پر مبنی ہے کہ مسلمان اس امر کا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کون سا راستہ سیدھا اور مستقیم ہے جس پر چلنا چاہیے، کسی بھی ایسے صاحبِ فکر شخص پر چھوڑ سکتے ہیں جس کے دماغ پر تعصب نے پردہ نہیں ڈالا ۔ (ص ۲-۲۳۱)
۔۔۔۔۔۔ یہ درست ہے کہ آج کے انحطاط پذیر ادوار میں، جب کہ اسلام پر بُرے دن آگئے ہیں [illegible] اسلامی قانون کی رو سے

احترام اس کی پابندی سے زیادہ خلاف ورزی کی صورت میں کیا جاتا ہے، لیکن محض اس بنا پر قانون کے الفاظ کو ردی کے ڈھیر پر نہیں پھینکا جا سکتا ۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام نہ صرف قانونی عدالتوں کا، بلکہ قیامت کے دن کی آخری عدالتِ خداوندی کا تصور بھی دیتا ہے ۔ وہ علانیہ جرائم کو قانونی عدالتوں پر چھوڑ دیتا ہے، تاہم انسان جس "روح" سے کسی فعل کا ارتکاب کرتا ہے، اُس کا فیصلہ اُس نے صرف اللہ تعالیٰ کے لیے محفوظ کر رکھا ہے ۔ جو لوگ اِس دنیا میں اپنی بداعمالیوں کی پاداش سے بچ نکلتے ہیں ۔ اگلی دنیا میں نہیں بچ سکیں گے ۔ خواہ بچپن کی وہ شادیاں ہوں جو ضرر رساں ثابت ہوئی ہیں یا ایک معاندانہ نکاح جو ایک انسان یہ جانتے بوجھتے کر لیتا ہے کہ وہ اپنی بیویوں کے درمیان انصاف نہیں کر سکے گا یا طلاق ہو جو کسی شدید ضرورت کے بغیر دی جائے ۔ انسانوں کے خالق کے سوا کسی کو یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ اُس نے قانون کے الفاظ کی بظاہر پابندی کرنے کے باوجود اس کی گُروح کو کیسے نظر انداز کر دیا ہے ۔ چونکہ اللہ نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے اس لیے اُس کو اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے کا اختیار دے رکھا ہے ۔ قانونِ الٰہی بھی کا قانون کو تنہا نیک سیرت بنانے کا دعویٰ نہیں کرتا، پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قانون کے ذریعے انسان کو نیک سیرت بنانے کا خیال تو اور بھی زیادہ خام ہے ۔ مثالی قانون وہ ہے جو کسی ایک بے گناہ کو سزا دینے کے بجائے ہزار مجرموں کو چھوڑ دینا زیادہ پسند کرتا ہے ۔ چونکہ کوئی مجرم آخرت کی سزا سے بچ نہیں سکتا اس لیے ہم ایسا قانون بنانے کے لیے مضطرب کیوں ہیں، جس کی رُو سے ہزاروں انسان بے تقصیر سزا کے مستوجب قرار پاتے ہیں ۔۔۔۔۔۔ بچپن کی شادی کی روک تھام کا قانون اس وقت ہندوستان کی مجلسِ قانون ساز کے سامنے ہے اور بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ مجلس، اسلامی قانون کو انسان کی خود ساختہ قانون سازی کی نذر کر دینے پر تُلی ہوئی

ہے۔ یہ مسئلہ بڑی سنگین نوعیت کا ہے اور یہ پیشین گوئی کرنے کے لیے کسی خاص قوت کی ضرورت نہیں ہے کہ مسلمانوں کا شخصی قانون سخت خطرے میں ہے۔" (ص ۲۰۰-۲۳۱)

زندگی کے آخری دنوں میں مولانا محمد علی ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں متشکک ہوگئے تھے۔ وہ ذیابیطس کے مرض میں شدت سے مبتلا تھے اس کے باوجود ٹوٹتی ہوئی اُمید کی ایک کرن ان کے دل میں باقی تھی؛ چنانچہ سخت بیمار ہونے کے باوجود انہوں نے گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے ۱۹۳۱ء میں لندن کا سفر کیا۔ وہاں کانفرنس میں اپنی زندگی کی آخری تقریر کی۔ اس میں انہوں نے کہا:

"میں اپنے وطن صرف اس وقت واپس جاؤں گا جب میرے ہاتھ میں آزادی کا پروانہ ہوگا۔ بصورتِ دیگر میں ایک غلام ملک میں لوٹ کر نہیں جاؤں گا۔ اگر تم ہمیں آزادی نہیں دیتے تو پھر مجھے یہاں ایک قبر دینی ہوگی۔"

تقریر کے بعد مولانا محمد علی کا جلد ہی انتقال ہوگیا۔ ان کی آخری آرزو پوری ہوگئی۔ وہ ایک غلام ملک میں لوٹ کر نہ آئے۔ بعض ممتاز عرب رہنماؤں کی درخواست پر ان کی میت بیت المقدس بھیج دی گئی جہاں انہیں مسجد صخرہ کے جوار میں دفن کر دیا گیا۔

مولانا محمد علی کی نمایاں ترین خصوصیت ان کا اخلاص تھا۔ وہ عجیب و غریب شے، جو سیاست کی دنیا میں شاذ و نادر ہی پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے مقصد کے لیے مخلص تھے، اپنے آپ کے لیے مخلص تھے۔ راست باز، صاف گو اور بے باک تھے۔ خواہ مقصد درست ہوتا یا نادرست مرقع شناسی اور جوڑ توڑ تو گویا جانتے ہی نہ تھے۔ اگر مقصد درست ہوتا تو اُسے انجام تک پہنچانے کے لیے اپنی شخصیت کا سارا وزن اس کی جدوجہد میں ڈال دیتے۔ اگر نادرست ہوتا

تو اس کے خلاف آخر دم تک سخت جنگ لڑتے۔ ان کا یقین راز عان نہایت گہرا اور جوش و جذبہ بے پایاں تھا، ان کے قول و عمل میں کوئی تضاد نہ تھا۔"

یہ وصف مولانا محمد علی میں انتہا درجے کا تھا اور اسی کی بدولت وہ اسلام کے صفِ اوّل کے مجاہد بن گئے تھے۔

پیغامِ اقبال

اسلامی معاشرہ میں مغربی استیلاء کے لائے ہوئے تند و تیز تہذیبی انتشار کے درمیان حکیم الامت شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبال جدید مسلم لٹریچر میں یکتا مقام رکھتے ہیں۔ عرب دنیا میں مصر کے احمد شوقی (۱۸۶۸-۱۹۳۲ء) اور ابراہیم حافظ (۱۸۷۱-۱۹۳۲ء)، شام کے خلیل مطران (م ۱۹۴۹ء) اور عراق کے معروف الرصافی (۱۸۷۵-۱۹۴۵ء) ان کے ہم عصر شعراء تھے۔ اوّل الذکر تینوں شاعر اسلامی موضوعات کو اپنی شاعری میں لادین قوم پرستی کے مقاصد پورا کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے اور آخر الذکر مادہ پرستانہ فلسفے کا مبلغ تھا۔ ان کے مقابلے میں علامہ اقبال نے اپنی تمام خداداد ادبی صلاحیتیں بجان و دل اسلام کے لیے وقف کر دیں۔ اگرچہ ان کے کلام کا بڑا حصہ فارسی میں ہے، تاہم انہوں نے وجودی خیالات، عشق و محبت اور حد سے بڑھی ہوئی جذباتیت سے گریز کیا جو فارسی زبان کے تمام کلاسیکی شعراء کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ان کی شاعری سے بلا ریب و شک یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اسلام میں فن کے صحیح کردار کا گہرا ادراک رکھتے تھے۔ فی الحقیقت یہ دعویٰ مبالغہ آمیز نہیں ہے کہ اقبال عصرِ حاضر کے ان معدودے چند فن کاروں میں سے تھے جنہوں نے اپنی لازوال اور اعلیٰ ادبی قدر و قیمت کی حامل شاعری میں ایک مسلمان کے نقطۂ نظر کو بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا۔

علامہ اقبال اونچے طبقے کے ایک کشمیری برہمن خاندان کی نسل سے تھے۔ یہ خاندان کوئی تین سو برس پہلے مشرف بہ اسلام ہوا تھا۔ اقبال پنجاب میں ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے اور مسلم اور مغربی دونوں تہذیبوں کے سائے میں کمل طور پر تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۹۹ء میں گورنمنٹ کالج سے ڈگری لی اور چھ برس تک لیکچرار رہے۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک انہوں نے کیمبرج اور میونخ میں فلسفے کی تعلیم حاصل کی اور قانون کا امتحان بھی پاس کیا۔ لاہور لوٹے تو وکالت شروع کی۔ وکالت میں بس اتنا وقت صرف کرتے جس سے معمولی گذران ہو سکے۔ فاضل وقت شعر و سخن میں گزارتے۔

”شعر کی اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کے باوجود علامہ اقبال غلطی سے محفوظ نہ تھے۔ بدقسمتی سے ان کی تحریریں بحیثیت مجموعی تناقضات سے یکسر پاک نہیں ہیں۔ اقبال اپنی زندگی میں ذہنی ارتقاء کی مختلف منزلوں سے مسلسل گزرتے رہے اور زندگی کے بالکل آخری چند سالوں میں اسلام کے ایک بے آمیزش تصور کا نقشہ اپنے ذہن میں تیار کر سکے۔ ابتدائی سالوں میں ان کے اسلامی خیالات کے ساتھ بہت سے خارجی نظریات و اثرات بھی بے روک ٹوک خلط ملط رہے ہیں[1]......“

ان سے چند ایک انتہائی قابلِ اعتراض فروگزاشتیں بھی سرزد ہوئی ہیں۔ یہ وہ اقتباسات ہیں جو ان کی انگریزی کی منثری کتابوں میں پائے جاتے ہیں اور جن کی اشاعت بڑے وسیع پیمانے پر کی گئی ہے، جن سے عالمِ اسلام کی تجدد پسند تحریکوں کو مدد ملتی ہے اور جن میں کمال اتاترک کی ترکی کا خاص طور پر حوالہ دیا گیا ہے۔

۱۹۲۸ء میں مسلم ایسوسی ایشن مدراس کی درخواست پر علامہ اقبال نے مدراس، حیدر آباد اور علی گڑھ یونیورسٹیوں میں خطبات دیئے۔ بعد ازاں ان خطبات کو ان کے صاحب زادے جاوید اقبال نے یکجا اور مرتب کر کے (The Reconstruction

---

[1] مصنفہ کے نام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے مکتوب مورخہ ۱۶ دسمبر ۱۹۶۰ء سے ایک اقتباس۔

of Religious Thought in Islam) کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا[1] دوسری قابلِ اعتراض تحریر ان کے ایک پمفلٹ (Islam and Ahmadeism with a reply to Questions raised by Pandit Nehru) (اسلام اور احمدیت) میں ملتی ہے۔ یہ پمفلٹ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے انہوں نے پنڈت نہرو کی طرف سے اٹھائے ہوئے سوالات کے جواب میں لکھا تھا۔ اس پمفلٹ میں ترکی میں کمالی اصلاحات پر بڑی طول طویل بحث کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ اصلاحات غیر اسلامی نہیں ہیں۔ عیسائی مشنری، مغربی مستشرقین اور ہمارے دیسی متجددین، سب اسلامی اقدار کے خلاف اپنے تخریبی دلائل کی تائید میں ان تحریروں کو پیش کرنے سے کبھی نہیں چوکتے۔ چونکہ یہ اقبال ایسی عظیم شخصیت کی تحریریں ہیں اس لیے جب یہ لوگ انہیں اپنے موقف کی تائید میں پیش کرتے ہیں، تو ان کے شر میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ بدترین پہلو یہ ہے کہ انگریزی بولنے والی دنیا اقبال کی فارسی اور اردو شاعری سے بے خبر ہے۔ وہ یہی سمجھتے ہیں کہ یہ کتابیں علامہ اقبال کے نظریات کی ٹھیک ٹھیک ترجمانی کرتی ہیں۔ اس طرح مصنف خود جس نصب العین پر گرمجوشی سے یقین رکھتا ہے اور جس کے لیے اس نے زبردست جدوجہد کی ہے، اس کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔

”پچھلے پانچ سو برس سے الٰہیات اسلامیہ پر عملاً جمود کی کیفیت طاری ہے۔ ایک زمانہ تھا جب یورپ کے افکار دنیائے اسلام سے متاثر ہوا کرتے تھے۔ تاریخ حاضرہ کا سب سے زیادہ توجہ طلب منظر یہ ہے کہ فکری اعتبار سے عالمِ اسلام نہایت تیزی کے ساتھ مغرب کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس تحریک میں بجائے خود کوئی قباحت نہیں کیونکہ جہاں تک علم و حکمت کا تعلق ہے، مغربی تہذیب

---

[1] اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی ”تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ“ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

دراصل اسلامی تہذیب ہی کے بعض پہلوؤں کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔"[۱]

ہمارے متجددین عالمِ اسلام کو مغرب کے رنگ میں رنگنے کے حق میں بالعموم یہی دلیل پیش کرتے ہیں۔ معتزلہ جنہیں تمام جمہور علماء بدعتی قرار دے کر مسترد کرتے ہیں، انہی نے یونانی فلسفے کو یورپ میں منتقل کیا تھا۔ یہ محض ایک تاریخی اتفاق تھا۔ اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ یونانی فلسفہ یونانی فلسفہ ہی رہے گا، خواہ اس کے رنگ میں رنگے ہوئے لوگوں کا نام مسلمانوں جیسا ہی کیوں نہ ہو۔ پھر اقبال اسی کتاب میں مندرجہ بالا دلیل کی خود تردید کرتے ہیں اور جدید مغربی فلسفے کی روشنی میں اسلامی اصولوں کی تعبیرِ جدید کی کوشش کو بالکل بے کار اور بے نتیجہ قرار دیتے ہیں:

> "عالمِ انسانی کو آج تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ کائنات کی روحانی تعبیر، فرد کا روحانی استخلاص اور وہ بنیادی اصول جن کی نوعیت عالمگیر ہو اور جن سے انسانی معاشرے کا ارتقاء روحانی اساس پر ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یورپ نے ان خطوط پر متعدد عینی نظام قائم کیے، لیکن تجربہ کہتا ہے کہ جس حق و صداقت کا انکشاف عقلِ محض کی وساطت سے ہو اس سے ایمان و یقین میں وہ حرارت پیدا نہیں ہو سکتی جو وحی و تنزیل کی بدولت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عقلِ محض نے انسان کو بہت کم متاثر کیا۔ اس کے برعکس مذہب نے افراد کو سربلند کرنے کے ساتھ ساتھ پورے کے پورے معاشروں تک کو بدل ڈالا۔ یورپ کی عینیت پرستی اس کی زندگی کی زندہ و مؤثر قوت کبھی نہ بن سکی ۔۔۔ یقین کیجیے آج انسان کے اخلاقی ارتقاء میں یورپ سب سے بڑی رکاوٹ بنا ہوا ہے۔"[۲]

۱؎ الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید (اردو ترجمہ) ص ۱۱

۲؎ حوالہ سابق ص ۲۷۶

علامہ اقبال نے اپنی کتاب "الٰہیات اسلامیہ کی تشکیلِ جدید" میں ایک اور غلطی بھی کی ہے۔ متجددین علامہ کی شہرت و عظمت کے سہارے اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لیے اس غلطی کو اُچک کر اپناتے ہیں، حالانکہ اقبال جتنے عظیم شاعر ہیں ان کی یہ غلطی بھی اتنی ہی عظیم ہے:

> "پچھلی متعدد صدیوں میں جب عالمِ اسلام پر ذہنی غفلت اور بے ہوشی کی نیند طاری تھی، یورپ نے ان عظیم مسائل میں نہایت گہرے غور و فکر سے کام لیا جن سے کبھی مسلمان فلسفیوں اور سائنس دانوں کو دلی شغف رہا ہے۔ قرونِ وسطیٰ سے لے کر اب تک، جب مسلمانوں کے الٰہیاتی مکاتب کی تکمیل ہوئی، انسانی فکر اور تجربے کی دنیا میں بے پایاں ترقی ہوتی ہے ۔۔۔۔۔۔ لہٰذا اگر ایشیا اور افریقہ کے مسلمانوں کی نئی پود کا مطالبہ ہے کہ ہم اپنے دین کی تعلیمات کا رُخ پھر سے متعین کریں تو یہ کوئی عجیب بات نہیں، لیکن مسلمانوں کی اس تازہ بیداری کے ساتھ اس امر کی تحقیق نہایت ضروری ہے کہ مغربی فلسفہ و فکر کیا ہے۔ علیٰ ہذا یہ کہ الٰہیات اسلامیہ کی نظرِ ثانی بلکہ ممکن ہو تو تشکیلِ جدید میں ان نتائج سے کہاں تک مدد مل سکتی ہے جو اس سے مرتب ہوتے ہیں خواہ اس باب میں ہمیں اپنے پیشروؤں سے اختلاف ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔"[۱]

علامہ اقبال نے اپنی مشہور فارسی مثنوی "اسرارِ خودی" میں بالکل متضاد خیالات کا اظہار کیا ہے:

سوزِ عشق از دانشِ حاضر مجو　　　کیفِ حق از جامِ ایں کافر مجو

۱؎ حوالہ سابق (اردو ترجمہ) ص ۲۰۷

مدتے محوِ تگ و دو بودہ ام	راز دانِ دانشِ نو بودہ ام
باغباناں امتحانم کردہ اند	محرم ایں گلستانم کردہ اند
گلستانِ لالہ زارِ عبرتے	چوں گُلِ کاغذ سرابِ نکہتے
دانشِ حاضر حجابِ اکبر است	بت پرست و بت فروش و بتگر است
پا بزندانِ مظاہر بستۂ	از حدودِ حس بروں ناجستۂ
در صراطِ زندگی از پا فتاد	بر گلوئے خویشتن خنجر نہاد

علامہ اقبال کی ایک قابلِ اعتراض تحریر اور بھی ہے جسے ہمارے متجددین حقیقی اسلامی اقدار کو ترک کرنے اور عالمِ اسلام کو مغربی رنگ میں رنگنے اور جدید طرز پر استوار کرنے کے حق میں اجتہاد کا دروازہ کھول دینے کے نام پر پیش کرتے ہیں:

• مسلمانوں نے گردو پیش کی قوموں سے تہذیب و ثقافت کے جو عناصر اخذ کیے ان کو ہمیشہ اپنے مذہبی مطمحِ نظر کے ڈھال لیا .... اسلام کی رُو سے قانون کی دنیا میں اور بھی نمایاں ہے .... قرآن کوئی قانونی ضابطہ نہیں۔ اس کا حقیقی منشا، جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، یہ ہے کہ ذہنِ انسانی میں اس تعلق کا جو اسے کائنات اور خالقِ کائنات سے ہے، اعلیٰ و برتر شعور پیدا کرے .... اس سلسلے میں غور طلب امر قرآن مجید کا وہ مطمحِ نظر ہے جو اس نے زندگی کے بارے میں قائم کیا اور جس میں اس کی نگاہیں جمود کے بجائے حرکت پر ہے۔ ظاہر ہے کہ جس کتاب کا مطمحِ نظر ایسا ہوگا اس کی روش ارتقا کی مخالف کیسے ہو سکتی ہے؟ .... دنیائے اسلام ان نئی نئی قوتوں سے متاثر اور دوچار ہو رہی ہے جو فکرِ انسانی کے ہر سمت میں غیر معمولی نشوونما کے باعث پھیل رہی ہیں۔ مجھے اجتہاد کے دروازے کو اب مزید کچھ مدت تک بند رکھنے کا کوئی حقیقی سبب نظر نہیں آتا۔ اندریں صورت اگر آزاد خیال مسلمانوں

کی نئی پود یہ دعویٰ کرتی ہے کہ اُسے اپنے تجربات اور زندگی کے بدلتے ہوئے احوال و ظروف کے پیشِ نظر فقہ و قانون کے بنیادی اصولوں کی از سرِ نو تعبیر کا حق پہنچتا ہے تو میرے نزدیک وہ اس بات میں پوری طرح حق بجانب ہیں۔ قرآن کریم کی یہ تعلیم کہ زندگی ایک مسلسل تخلیقی عمل ہے بجائے خود اس امر کی مقتضی ہے کہ مسلمانوں کی ہر نسل اپنے اسلاف کی رہنمائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مسائل آپ حل کرے اور اس راہ میں اسے کوئی رکاوٹ پیش نہ آنے پائے۔[1]

یہ متجددین جو اسلام کے خلاف اپنے غلط استدلال کی تائید میں علامہ اقبال کی عظمت کا حوالہ دیتے ہیں اس حقیقت کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں کہ خود اقبال نے "رموزِ بے خودی" میں بڑے فصیح انداز میں بالکل متضاد رائے ظاہر کی ہے:

ہر کہ تسخیرِ مہ و پرویں کند	خویش را زنجیریِ آئیں کند
باز اے آزادِ دستورِ قدیم	زینتِ پا کن ہماں زنجیرِ سیم
شکوہ سنجِ سختیِ آئیں مشو	از حدودِ مصطفیٰ بیروں مرو
تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست؟	زیرِ گردوں سرِّ تمکینِ تو چیست؟
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم	حکمتِ او لایزال است و قدیم
حرفِ او را ریب نے تبدیل نے	آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

در شریعت معنیِ دیگر مجو	غیرِ ضو در باطنِ گوہر مجو
ایں گہر را خود خدا گوہر گر است	ظاہرش گوہر بطونش گوہر است
علمِ حق غیر از شریعت ہیچ نیست	اصلِ سنت جز محبت ہیچ نیست

---

[1] حوالہ سابق (اردو ترجمہ)، ص ۲۵۹ - ۲۶۰۔

باتو گویم سرِ اسلام است شرع | شرع آغاز است و انجام شرع

اسی نظم میں علامہ اقبال بڑے فصیحانہ انداز کے ساتھ اپنی انگریزی کتابوں کی تحریروں کی تردید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ زوال و انحطاط کے زمانے میں ماضی کے ساتھ حتی و عن مطابقت آزادانہ قیاس آرائی اور اجتہاد سے کہیں بہتر ہے:

اے پریشاں محفلِ ویرینہ ات | مُرد شمعِ زندگی در سینہ ات
نقش بر دل معنیٔ توحید کن | چارۂ کارِ خود از تقلید کن
اجتہاد اندر زمانِ انحطاط | قوم را برہم ہمی پیچد بساط
ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر | اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر
عقلِ آبایت ہوس فرسودہ نیست | کارِ پاکاں از غرض آلودہ نیست
فکرِ شاں ریسد ہمے باریک تر | ورعِ شاں با مصطفےٰ نزدیک تر

از یک آئینی مسلماں زندہ است | پیکرِ ملت ز قرآں زندہ است
ما ہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست | اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست
چوں گہر در رشتۂ او سفتہ شو | ورنہ مانندِ غبار آشفتہ شو

راہِ آبا رو کہ ایں جمعیت است | معنیٔ تقلید ضبطِ ملت است

با مریدے گفت اے جانِ پدر | از خیالاتِ عجم باید حذر
قلب را زیں حرفِ حق گرداں قوی | با عرب در ساز تا مسلم شوی

اسلامی اقدار کی قدر و قیمت سے بے خبر لوگ جب "اجتہاد" کا دروازہ کھولنے کی کوشش کرتے ہیں تو کیا نتائج رونما ہوتے ہیں، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل تحریر سے کیا جاسکتا ہے:

"اگر مذہب کا مقصد فی الواقع یہ ہے کہ انسان کا دل روحانیت سے معمور ہو تو ضروری ہے کہ وہ اس کے رگ و پے میں سرایت کر جائے، لیکن ترکی شاعر ضیا گوک الپ کہتا ہے جب تک مذہب کے روحانیت خیز افکار مادری زبان میں ادا نہیں کیے جاتے ایسا ہونا ناممکن ہے۔ بایں ہمہ عربی کو ترکی سے بدلنے کا یہ خیال مسلمانانِ ہند کی غالب اکثریت کو ناگوار گزرے گا اور وہ اس کی مذمت کریں گے۔ یوں بھی اعتبار ان وجوہ کے جن کا ذکر آگے آئے گا، شاعر کا یہ اجتہاد بڑا قابلِ اعتراض ہے، تاہم اسلامی تاریخ میں اس قسم کی اصلاح کی ایک مثال بھی موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسلامی اندلس کے مہدی محمد ابن تومرت نے جس کی قومیت بربری تھی، جب اقتدار حاصل کیا اور موحدین کی زبردست حکومت قائم کی تو حکم دیا کہ بربر چونکہ ایک ناخواندہ قوم ہیں، لہٰذا ان کی خاطر سے قرآن مجید کا ترجمہ اور تلاوت بھی بربری زبان ہی میں کی جائے۔ اذان بھی بربری ہی میں ہو حتیٰ کہ علماء و فقہاء بھی اس کی تحصیل کریں ....

دراصل مسلمان قوموں میں صرف ترک ایک ایسی قوم ہیں جو قدامت پرستی کے خواب سے بیدار ہو کر شعورِ ذات کی نعمت حاصل کر چکے ہیں۔ صرف ترکوں ہی نے ذہنی آزادی کا حق طلب کیا ہے اور وہ ایک خیالی دنیا سے نکل کر عالمِ حقیقت میں آچکے ہیں، لیکن یہ وہ تغیر ہے جس کے لیے انسان کو ایک زبردست دماغی اور اخلاقی کشاکش سے گزرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا یہ ایک طبعی امر تھا کہ ایک ہر لحظہ حرکت اور وسعت پذیر زندگی کی روز افزوں پیچیدگیوں کی بدولت انہیں نئے نئے حالات اور نئے نئے نقطہ ہائے نظر سے سابقہ پڑتا اور وہ ان اصولوں کی از سرِ نو تعبیر پر مجبور ہو جاتے جو روحانی وسعتوں کی مسرت سے محروم قوم کے لیے خشک بحثوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے...... اکثر مسلمان

ممالک میں پرانی قدروں ہی کا تکرار بالکل مشینی انداز میں جاری ہے، البتہ ترک نئی قدریں وجود میں لانے کی راہ پر گامزن ہیں۔ وہ بڑے بڑے اہم تجربات سے دوچار ہو چکے ہیں اور ان تجربات نے اُن پر اُن کے اندرونِ ذات کو منکشف کیا ہے۔ ان کی زندگی میں حرکت، تغیر اور وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے نتیجے میں نئی نئی آرزوئیں، نئی نئی مشکلات رونما ہو رہی ہیں اور ذہنوں کو نئی نئی تعبیریں سجھا رہی ہیں۱۔۔۔۔۔۔"

تاہم اپنی زندگی کے آخری زمانے میں علامہ اقبالؔ کے نظریات اس باب میں بالکل بدل گئے۔ ترکی میں کمال اتاترک نے جو تجربہ کیا اُسے انہوں نے مغربی مادہ پرستی کی انتہائی مشینی اور غیر تخلیقی نوعیت کی اندھی نقالی قرار دیا؛ چنانچہ ضربِ کلیم میں کہتے ہیں:

ترا وجود سراپا تجلّیِ افرنگ	کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر
مگر یہ پیکرِ خاکی خودی سے ہے خالی	فقط نیام ہے تو، زرنگار و بے شمشیر

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود	مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا
وجود کیا ہے؟ فقط جوہرِ خودی کی نمود	کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا

اسی طرح ایک اور بیان ہے جس کے متعلق علامہ اقبالؔ نے اپنی زندگی کے آخری زمانے میں خود تسلیم کیا کہ ان سے زبردست غلطی ہوئی تھی، لیکن جسے ہمارے متجددین جو عالمِ اسلام کو مغرب کے رنگ میں رنگنا اور جدید بنیادوں پر استوار کرنا چاہتے ہیں، پوری بے باکی کے ساتھ اپنے موقف کی تائید میں پیش کرتے ہیں:

"علماء ہمیشہ اسلام کی زبردست طاقت کا سرچشمہ رہے ہیں، لیکن گزشتہ

۱۔ حوالہ سابق ص ۱۶۲-۱۶۱

کئی صدیوں کے دوران میں، خصوصاً بغداد کی تباہی کے بعد سے وہ ازحد رجعت پسند بن چکے ہیں اور اجتہاد کا حق دینے پر راضی نہیں ہوتے؛ چنانچہ انیسویں صدی کے مصلحین کا مقصدِ اوّلیں یہ تھا کہ مذہب کو پھر سے نیا رنگ دیا جائے اور بڑھتے ہوئے تجربے کی روشنی میں شریعت کی نئی تعبیر کرنے کی آزادی دی جائے۔۔۔۔۔۔ ان مصلحین نے عالمِ اسلام کے افکار و خیالات میں جو تغیر برپا کیا، یہاں اُس کی تفصیل بیان کرنا ممکن نہیں؛ تاہم ایک بات واضح ہے۔ انہوں نے مصر کے زغلول پاشا، ترکی کے کمال اتاترک اور ایران کے رضا شاہ پہلوی ایسے لوگوں کی جماعت کے لیے زمین بڑی حد تک تیار کر دی۔ سید احمد خاں اور شیخ محمد عبدہ نے ترجمانی کا کام کیا، دلائل فراہم کیے اور مسائل کی توضیح و تشریح کی، لیکن ان کے بعد آنے والے لوگوں نے، جو اگر علمی پایہ میں ان حضرات سے کمتر ہیں، لیکن اپنے صحت مند وجدان پر اعتماد کرتے ہوئے سورج کی روشنی سے منور خلاء میں آگے بڑھنے اور ہر وہ کام کر گزرنے کی جرأت رکھتے ہیں، زندگی کے نئے احوال و ظروف جس کا تقاضا کرتے ہیں اور اس سلسلے میں طاقت استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ۔۔۔۔۔۔ترکی میں یہ جو کچھ ہو رہا ہے اور جو بظاہر اسلام کی ضد نظر آتا ہے کیا یہ عام مادّی نظریہ کی ارتقائی صورت ہے؟ اسلام نے ترکِ دنیا سے بہت زیادہ بھر پایا ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ مسلمان حقائق پر غور کریں۔ مادّہ پرستی بلاشبہ مذہب کے خلاف ایک گھٹیا ہتھیار ہے، لیکن مُلّائیت اور صوفیت جو لوگوں کی جہالت اور خوش اعتقادی کو کام میں لانے کے لیے انہیں بیوقوف بناتی ہیں، اُن کے خلاف اس ہتھیار کے مؤثر ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ اسلام کی رُوح مادہ کے ساتھ ربط و تعلق قائم کرنے سے ذرا بھی خائف نہیں۔ ایک غیر مسلم جب عالمِ اسلام کی گزشتہ چند صدیوں کی تاریخ پر غور کرتا ہے تو یہ

بات اُس کی سمجھ میں نہیں آتی کہ مادّی نظریہ کا ارتقاء خود یافتگی (self— realization) کی محض ایک شکل ہے۔ پھر کیا یہ پرانے لباس کی موقوفی یا لاطینی رسم الخط کے اجراء ہی کا معاملہ ہے؟ اسلام کا بحیثیت ایک مذہب کے کوئی ملک نہیں بحیثیت ایک معاشرہ کے اُس کی کوئی خاص زبان اور خاص لباس نہیں، حتیٰ کہ ترکی زبان میں قرآن پڑھنے کی نظیر بھی مسلمانوں کی تاریخ میں ملتی ہے۔۔۔۔۔۔ پھر تعددِ ازدواج کی موقوفی یا علماء کے لیے سند یافتہ ہونے کا معاملہ کیوں کر قابلِ اعتراض ہو سکتا ہے؟ اسلامی قانون کی رُو سے امیرِ شریعت کی دی ہوئی اجازتوں کو منسوخ کر سکتا ہے بشرطیکہ اُسے یقین ہو جائے کہ ان اجازتوں سے معاشرتی مفاسد پیدا ہو رہے ہیں۔ جہاں تک علماء کے لیے سند یافتہ ہونے کو لازمی قرار دینے کا تعلق ہے تو اگر میرے ہاتھ میں اختیار ہو تو میں اس کو مسلم ہندوستان میں ضرور رائج کروں۔ افسانہ طراز ملّا محض عام مسلمانوں کی بے وقوفی کی بنا پر بے سروپا باتیں گھڑتے رہتے ہیں۔ اُس کو عوام کی مذہبی زندگی سے بے دخل کر کے اتاترک نے وہ کام کیا ہے کہ اگر امام ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہؒ زندہ ہوتے تو اُن کا دل باغ باغ ہو جاتا۔ مشکوٰۃ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان مملکت کا امیر یا اُس کا نامزد کردہ کوئی شخص یا اشخاص ہی عوام میں وعظ و تبلیغ کرنے کا استحقاق رکھتے ہیں۔ مَیں نہیں جانتا کہ اتاترک کو اس حدیثِ رسولؐ کی خبر تھی یا نہیں۔ البتہ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس اہم معاملے میں اُس کے اسلامی ضمیر کے نُور سے اُس کے دائرۂ عمل کو منور کر دیا ہے۔[1]

---

[1] اسلام اور احمدیت (انگریزی)، ص ۳۱-۳۲

مولانا مودودی کا شمار ان حضرات میں ہوتا ہے جنہوں نے علامہ اقبال کو ان کی زندگی کے آخری سالوں میں دیکھا۔ علامہ اقبال نے مندرجہ بالا نظریات کی وکالت و حمایت کس لیے کی؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے مولانا میرے نام ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

"اقبال کے نظریات ایک زمانے تک خالصۃً اسلامی نہ تھے بلکہ ان میں مسلم قوم پرستی کی آمیزش تھی۔ اس آمیزش کو غالباً وہ زندگی بھر اپنے نظریات کے دامن سے نہیں جھاڑ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مسلمان رہنماؤں اور حکمرانوں کی مذمت سے بالعموم احتراز کرتے تھے اور بعض اوقات شاعرانہ ترنگ میں ان کی غیر اسلامی سرگرمیوں کی تائید تک کر گزرتے تھے۔ پھر یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ ہندوپاکستان کے مسلمانوں میں ترکی کے ساتھ جو گہری ہمدردی پائی جاتی تھی اس کے بہت سے تاریخی اور سیاسی عوامل تھے۔ مسلمان برطانوی قوم کے غلام ہونے کے بعد اپنی عظمتِ رفتہ کی اس نشانی سے ایک جذباتی لگاؤ رکھتے اور ہر ممکن طریقے سے اس کی مدافعت کرتے تھے۔ مصطفیٰ کمال نے اپنی گرتی ہوئی مسلمان ریاست کو بچانے کے لیے جو کچھ کیا تھا اس کے صلے میں یہاں کے مسلمان اصحابِ علم اور مفکرین کمال اتاترک کے غیر اسلامی اور صریحاً کافرانہ اعمال سے اغماض کرنے پر تیار رہتے تھے۔ اس ذہنی اور جذباتی پس منظر میں اقبال بھی ۱۹۳۰ء تک کمال اتاترک کی اصلاحات کی صفائی اور ان کی تاویلات پیش کرتے اور ان کے لیے اسلام میں جگہ ڈھونڈنے کی کوشش کرتے۔ لیکن آخرکار ہمارے شاعر کا پیمانۂ صبر بھی لبریز ہو گیا اور وہ کمال کی بدعات کی علانیہ مذمت کرنے لگے۔۔۔۔۔۔"

چنانچہ بالِ جبریل میں کہتے ہیں:

شعورِ و ہوش و خرد کا معاملہ ہے عجیب
مقامِ شوق میں ہیں سب دل و نظر کے رقیب
میں جانتا ہوں جماعت کا حشر کیا ہو گا
مسائلِ نظری میں الجھ گیا ہے خطیب
اگرچہ میرے نشیمن کا کر رہا ہے طواف
مری نوا میں نہیں طائرِ چمن کا نصیب
سنا ہے میں نے سخن رس ہے ترکِ عثمانی
سنائے کون اسے اقبال کا یہ شعرِ غریب
سمجھ رہے ہیں وہ یورپ کو ہم جوار اپنا
ستارے جن کے نشیمن سے ہیں زیادہ قریب

نیز ضربِ کلیم میں کہتے ہیں:

مری نوا سے گریبانِ لالہ چاک ہوا
نسیمِ صبح چمن کی تلاش میں ہے ابھی
نہ مصطفےٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی
مری خودی بھی سزا کی ہے مستحق لیکن
زمانہ دار و رسن کی تلاش میں ہے ابھی

ان فکری لغزشوں سے قطعِ نظر، جو ان کی انگریزی تالیفات میں راہ پاگئی ہیں، اقبال اسلام کے نصب العین پر پختہ یقین رکھتے تھے اور اس راہ میں ان کے قدم کبھی ڈگمگانے نہیں پائے۔ ان کی پختہ یقینی اور پُرخلوص مقاصد کا اندازہ ان اشعار سے کیا جاسکتا ہے جن میں انہوں نے صنفِ نسواں کے اسلامی تصور کی عکاسی کی ہے۔

نیک اگر بینی امومت رحمت است زانکه او را با نبوت نسبت است
گفت آں مقصودِ حرفِ کن فکاں زیرِ پائے امہات آمد جناں
ملت از تکریمِ ارحام است و بس ورنہ کارِ زندگی خام است و بس

آں دو رنگ رستاق زادے جاہلے پست بالائے سطبرے بدگلے
ناتراشے پرورشی نادادۂ کم نگاہے کم زبانے سادۂ
دل ز آلامِ امومت کردہ خوں گردِ چشمش حلقہ ہائے نیلگوں
ملت ار گیرد ز آغوشش بدست یک مسلمانِ غیورِ حق پرست
ہستیِ ما محکم از آلامِ اوست صبحِ ما عالم فروز از شامِ اوست
واں تہی آغوش نازک پیکرے خانہ پرورد نگاہش محشرے
فکرِ او از تابِ مغرب روشن است ظاہرش زن باطنِ او نازن است
بندہائے ملتِ بیضا گسیخت تا ز چشمش عشوہ با حل کردہ ریخت
شوخ چشم و فتنہ زا آزادیش از حیا نا آشنا آزادیش
علمِ او بارِ امومت بر نتافت بر سرِ شامش یکے اختر نتافت

ایں گل از بستانِ ما نارستہ بہ
داغش از دامانِ ملت شستہ بہ

مزرعِ تسلیم را حاصل بتولؓ مادراں را اسوۂ کامل بتولؓ
نوری و ہم آتشی فرمانبرش گم رضایش در رضائے شوہرش
آں ادب پروردۂ صبر و رضا آسیا گردان و لب قرآں سرا

اے امینِ نعمتِ آئینِ حق در نفسہائے تو سوزِ دینِ حق

دورِ حاضر تر فروش و پرفن است | کاروانش نقدِ دیں را رہزن است
کور و یزداں ناشناس ادراکِ او | ناکساں زنجیریِ پیچاکِ او
چشمِ او بے باک و ناپرواستے | پنجۂ مژگانِ او گیراستے
صیدِ او آزاد خواند خویش را | کشتۂ او زندہ داند خویش را
آبِ بندِ نخلِ جمعیتِ توئی | حافظِ سرمایۂ ملت توئی
کودکِ ما چوں لب از شیر تو شست | لاالٰہ آموختی او را نخست
از سرِ سود و زیاں سودا مزن | گام جز بر جادۂ آبا مزن
ہوشیار از دستبردِ روزگار | گیر فرزندانِ خود را در کنار
ایں چمن زاداں کہ پر نگشادہ اند | ز آشیانِ خویش دور افتادہ اند
فطرتِ تو جذبہ ہا دارد بلند | چشمِ ہوش از اسوۂ زہرا مبند

تا حسینے شاخِ تو بار آورد
موسمِ پیشیں بگلزار آورد

عالمِ اسلام میں ایسے ممتاز لوگ چند ایک ہی ملتے ہیں جنہیں اقبال کی طرح یورپ کے علوم اور فلسفے میں گہرا درک حاصل ہے۔ اگرچہ اسلام پر ان کا یقین و اعتقاد کبھی ڈانواں ڈول نہیں ہوا، لیکن وہ اپنے عوام کی ذلت و پستی کا مقابلہ انگلستان اور جرمنی ایسے ممالک کی طاقت، خوش حالی اور اثر آفرینی سے کرنے کے سوا اور کچھ نہ کر سکے۔ اس کا سبب وہ تناقض ہے جو ان کی تحریروں میں پایا جاتا ہے اور جن کا ذکر ہم قبل ازیں کر چکے ہیں، تاہم اپنی زندگی کے آخری دنوں میں جب ان کی خوش خیالیاں بیکار ثابت ہوئیں اور بصیرت بھی اور گہری ہو گئی انہوں نے مندرجہ ذیل اشعار کہے:

عرب کے سوز میں سازِ عجم ہے | حرم کا رازِ توحیدِ امم ہے
تہی وحدت سے ہے اندیشۂ غرب | کہ تہذیبِ فرنگی بے حرم ہے

نظر آتے نہیں بے پردہ حقائق ان کو
آنکھ جن کی ہوئی محکومی و تقلید سے کور
زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر
یہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لبِ گور
(ضربِ کلیم)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی جو دورِ جدید میں عالمِ اسلام کے سب سے بڑے اور با اثر رہنما ہیں، ۲۵ ستمبر ۱۹۰۵ء میں حیدرآباد دکن کے شہر اورنگ آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے جدِ اعلیٰ سلسلۂ چشتیہ کے بانی خواجہ قطب الدین مودود چشتیؒ تھے جن کی تعلیمات ان کے خلیفہ خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے ذریعے برصغیر ہند و پاک میں پہنچیں۔ ولادت سے تین سال پہلے ایک خدا رسیدہ بزرگ مولانا مودودی کے والدِ گرامی کے پاس آئے اور انہیں بشارت دی کہ اللہ تعالیٰ بہت جلد انہیں ایک بیٹا عطا کرے گا۔ اس کا نام وہ ابوالاعلیٰ رکھیں۔ یہ بچہ بڑا ہو کر دینِ اسلام کا نامور خادم بنے گا۔ مولانا مودودی کے والد وکیل تھے۔ وہ اگرچہ اسی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے جو سر سید احمد خاں کا تھا اور انہوں نے علی گڑھ میں تعلیم پائی تھی، تاہم آگے چل کر وہ مغربی تہذیب، برطانوی حکومت اور اس کے حامیوں سے بیزار ہو گئے۔ مغربی تہذیب سے اس کراہت کی بنا پر وہ اپنے صاحبزادوں کو انگریزی سکولوں میں بھیجنا نہیں چاہتے تھے؛ چنانچہ ان کی عربی، فارسی، اردو اور انگریزی تعلیم کا گھر ہی انتظام کیا۔ مولانا مودودی سولہ برس کے تھے کہ ان کے والد انتقال کر گئے۔ اس طرح انہیں حصولِ معاش کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ ۱۹۲۰ء میں انہوں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا اور متعدد اخبارات میں کام کرتے رہے۔ ابتدائی زندگی کے اس دور میں مودودی صاحب

مولانا محمد علی جوہر کی تحریکِ خلافت کے سرگرم حامی تھے، جو انہوں نے حکومتِ ترکی کی تائید و حمایت اور اس آخری اہم اسلامی مملکت کو مغربی استعمار کے تباہ کن عزائم سے بچانے کے لیے جاری کی۔

۱۹۲۶ء میں مولانا مودودی کی کتاب "الجہاد فی الاسلام" شائع ہوئی اور عام پڑھے لکھے لوگوں کی توجہ ان کی جانب مرکوز ہو گئی۔ اس کتاب میں مولانا نے اسلام کے تصورِ جہاد کا موازنہ جنگ کے جدید بین الاقوامی قانون سے کیا اور قدیم و جدید طریق کے درمیان جو فرق ہے اس کی وضاحت کی۔ مولانا نے اسی موضوع پر ایک پمفلٹ "جہاد فی سبیل اللہ" بھی لکھا۔ اس پمفلٹ کا جب عربی ترجمہ شائع ہوا تو شیخ حسن البناء اس کے فکر سے بے حد متاثر ہوئے اور اخوان نے اسے اور مولانا کی دوسری تصانیف کو اپنے جماعتی لٹریچر میں شامل کر لیا۔ ۱۹۳۲ء میں مولانا مودودی نے اپنی مشہور اور مقبولِ عام کتاب "رسالۂ دینیات" شائع کی، جس کا مقصد جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کو خالص اسلام کا تصور دینا اور اُس کے حق میں ذہنوں کو مسخر کرنا تھا۔ رسالۂ دینیات کا ترجمہ ایک درجن سے زائد زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اس کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں اور دنیا بھر میں ایک لاکھ سے زیادہ نسخے نکل چکے ہیں۔ یہ کتاب بعض مسلمان ممالک کے سرکاری سکولوں کے نصاب میں بھی شامل ہے اور اس سلسلے میں معیاری کتاب شمار کی جاتی ہے۔ ۱۹۳۳ء میں مولانا مودودی نے ماہنامہ "ترجمان القرآن" نکالنا شروع کیا۔ اس مجلہ میں مولانا اور اُن کے ہم خیال ساتھیوں کے بلند پایہ مضامین شائع ہوتے ہیں۔ تین عشروں سے زاید عرصہ گزر چکا ہے۔ ترجمان القرآن اُردو بولنے والے خواندہ عوام کو خالص اسلام کی دعوت کا سب سے بڑا علمبردار مجلہ ہے۔

۱۹۳۷ء میں فلسفی شاعر علامہ محمد اقبال نے مودودی صاحب کو لاہور آنے اور احیائے اسلامی قانون کے لیے اُن کے ساتھ مل کر کام کرنے کی دعوت دی، لیکن قبل اس کے کہ یہ کام عملی صورت اختیار کرتا، بدقسمتی سے اقبال انتقال کر گئے۔ ۱۹۳۹ء میں مولانا مودودی نے اسلامیہ کالج لاہور کے

شعبۂ اسلامیات کے صدر کی اعزازی خدمت انجام دی۔

مغربِ زدگی، مادیت پرستی، قوم پرستی اور لادینیت کا مقابلہ کرنے کے لیے مولانا مودودی نے ۱۹۴۱ء میں جماعتِ اسلامی کی تاسیس کی۔ اس جماعت کا مقصد خالص اسلام کی بنیادوں پر عصرِ حاضر کے مسلمانوں کی زندگی کی مکمل اصلاح اور ملک میں شریعتِ اسلامی کا نفاذ تھا۔

مسلم ہندوستان میں مولانا مودودی سے بڑھ کر تحریکِ پاکستان کی پُرجوش حمایت کسی اور نے نہیں کی۔ انہوں نے اس سلسلے میں کتابیں لکھیں، پمفلٹ شائع کیے اور تقریریں کیں اور ہندوستان کے مسلمانوں کو بدلائل بتایا کہ وہ ایک جداگانہ ملت ہیں اور اگر ہندوؤں کے استیلا اور جور و جبر کے خطرے سے بچنا چاہتے ہیں تو ان کی اپنی مملکت کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ جنگِ آزادی کے بڑے بڑے رہنما مثلاً مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی حتیٰ کہ قائد اعظم بھی ایک زمانے میں انڈین نیشنل کانگرس کے رکن ہوا کرتے تھے، لیکن مولانا مودودی ایک دن کے لیے بھی کانگرس میں شریک نہیں ہوئے۔ جب قائد اعظم کو جماعتِ اسلامی میں شریک ہونے کی دعوت دی گئی تو انہوں نے فرمایا کہ جماعت اور مسلم لیگ کے درمیان ذرا بھی آویزش نہیں ہے۔ ایک جماعت بلند تر نصب العین کے لیے کام کر رہی ہے اور دوسری ایک علیحدہ مملکت کے حصول کی جدوجہد کر رہی ہے جو مسلمانانِ ہند کی فوری ضرورت ہے اور اگر یہ مملکت حاصل نہ ہو سکی تو جماعتِ اسلامی کی دعوت کو عملی جامہ پہنانا ناممکن ہو جائے گا[1]

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہو گیا۔ مولانا مودودی نے اپنی ساری جدوجہد پاکستان کو ایک خالص اسلامی مملکت بنانے پر مرکوز کر دی۔ ۱۹۴۸ء میں جنوری اور مارچ کے درمیانی عرصے میں مولانا مودودی نے ریڈیو پر پانچ تقریریں نشر کیں جن میں اسلام کی روحانی، اخلاقی، معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی تعلیمات کی نمایاں ترین خصوصیات بیان کیں۔ اُن کے

---

[1] قمر الدین خان کے بیان کا ایک اقتباس، "دی تھنکر"، دہلی، ۲ دسمبر ۱۹۶۳ء۔

نزدیک اسلام محض ایک نعرہ نہ تھا۔ اُن کا شمار ملک کے اُن چند رہنماؤں میں ہوتا ہے جن کا عمل
اُن کے قول کی صداقت کی گواہی دیتا ہے۔ انہوں نے اپنی لازوال قوت و توانائی اس مقصد
کی راہ میں لگا دی۔ ملک بھر کا دورہ کیا، جگہ جگہ تقریریں کیں اور پاکستان کو ایک مکمل ریاست
بنانے کے حق میں مسلمان عوام کی تائید و حمایت کو منظم کیا۔ بعض مفاد پرستوں کے لیے مقصد سے
یہ خلوص اور راست بازی ناقابلِ برداشت تھی۔ جب انہوں نے ملک کے لیے خالص اسلامی
دستور بنانے کا مطالبہ کیا تو ان پر ریاست کے دشمن ہونے کا الزام عائد کر کے انہیں ۴ اکتوبر ۱۹۴۸ء
کو گرفتار کر لیا گیا؛ چنانچہ ۲۰ مئی ۱۹۵۰ء تک محبوس رہے۔ تاہم ان کی جدّوجہد کامیاب رہی۔
۷ مارچ ۱۹۴۹ء کو قومی دستور ساز اسمبلی نے قراردادِ مقاصد منظور کی، جس میں وہ تمام مطالبات شامل
تھے جو مولانا نے ملک کو اسلامی دستور کی بنیادیں فراہم کرنے کے لیے کیے تھے۔

قراردادِ مقاصد کا مکمل متن حسبِ ذیل ہے:

ساری کائنات پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت ہے اور پاکستان کے عوام حدودِ الٰہی میں رہتے
ہوئے جو اختیارِ حکمرانی استعمال کریں گے، وہ ایک مقدس امانت ہے۔

پاکستان کے عوام کی یہ نمائندہ مجلس دستور ساز فیصلہ کرتی ہے کہ آزاد و خود مختار مملکتِ
پاکستان کے لیے ایک دستور مرتب کیا جائے۔

جس کی رُو سے مملکتِ حکمرانی کے تمام حقوق و اختیارات عوام کے منتخب کردہ نمائندوں کے
ذریعے سے استعمال کرے۔

جس میں جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور معاشرتی انصاف کے اصولوں،
جس طرح اسلام نے ان کی تشریح کی ہے، پُورے طور پر ملحوظ رکھا جائے۔

جس کی رُو سے مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی
کو قرآن و سنّت کی تعلیمات اور اُس کے تقاضوں کے مطابق تشکیل دے سکیں۔

جس کی رُو سے اس امر کا پُورا پُورا اہتمام کیا جائے کہ اقلیتیں آزادی کے ساتھ اپنے

مذہبی معتقدات کے مطابق عمل کر سکیں اور اپنی تہذیب و ثقافت کو ترقی دے سکیں۔

جس کی رُو سے وہ علاقے جو اب پاکستان میں شامل ہیں یا ہو گئے ہیں اور ایسے
دوسرے علاقے جو آئندہ پاکستان میں شامل یا اُس کے ساتھ ملحق ہوں گے، ایک وفاق قائم
کریں گے جس کے اجزائے ترکیبی مقرر کردہ حدود اربعہ اور متعینہ اختیارات کے اندر خود مختار
ہوں۔

جس کی رُو سے بنیادی حقوق کی ضمانت دی جائے اور ان حقوق میں قانون اور اخلاقِ
عامہ کے مطابق حیثیت اور مواقع میں مساوات، قانون کی نظر میں برابری، معاشرتی، معاشی
اور سیاسی انصاف، رائے اور اظہار کی آزادی، ایمان اور عقیدے کی آزادی، مذہبی رسوم
کی آزادی اور اجتماع کی آزادی شامل ہوں۔

جس کی رُو سے اقلیتوں اور پس ماندہ اور پست طبقوں کے جائز حقوق کے تحفظ کا
مناسب انتظام کیا جائے۔

جس کی رُو سے عدلیہ کی آزادی کامل طور پر محفوظ ہو۔

جس کی رُو سے وفاقیہ کے علاقوں کی سالمیت اور اُس کی آزادی اور اُس کے جملہ
حقوق کا، جن میں اُس کے بر و بحر اور فضا پر سیادت کے حقوق شامل ہیں، تحفظ کیا
جائے۔

تاکہ اہلِ پاکستان فلاح اور خوش حالی کی زندگی بسر کر سکیں، اقوامِ عالم کی صف میں
اپنا جائز اور ممتاز مقام حاصل کر سکیں اور امنِ عالم کے قیام اور بنی نوعِ انسان کی ترقی و بہبود
میں قابلِ قدر اضافہ کر سکیں۔

۱۹۵۱ء میں ایک اہم سنگِ میل نصب کیا گیا۔ تقریباً چودہ صدیوں کے بعد پاکستان
کے تمام بڑے ——— دیوبندی، بریلوی، اہلِ حدیث اور شیعہ ——— مکاتبِ فکر کے
۳۱ نمائندہ علماء کراچی میں ۲۱-۲۲-۲۳ اور ۲۴ جنوری کو جمع ہوئے اور مکمل اتفاق رائے

سے اسلامی مملکت کے ۲۲ بنیادی اصول مرتب کرکے مطالبہ کیا کہ انہیں پاکستان کے دستور میں وزنًا شامل کیا جائے۔ اس متفقہ فیصلے میں حسب ذیل امور کی صراحت کی گئی تھی۔

۱۔ اصل حاکم تشریعی و تکوینی حیثیت سے اللہ رب العالمین ہے۔

۲۔ ملک کا قانون کتاب و سنت پر مبنی ہوگا، اور کوئی ایسا قانون نہ بنایا جائے گا، نہ کوئی ایسا انتظامی حکم دیا جاسکے گا جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔
تشریحی نوٹ: اگر ملک میں پہلے سے کچھ ایسے قوانین جاری ہوں جو کتاب و سنت کے خلاف ہوں تو اس کی تشریح ضروری ہے کہ وہ بتدریج ایک معینہ مدت کے اندر منسوخ یا شریعت کے مطابق تبدیل کر دیئے جائیں گے۔

۳۔ مملکت کسی جغرافیائی، نسلی، لسانی یا کسی اور تصور پر نہیں بلکہ ان اصول و مقاصد پر مبنی ہوگی جن کی اساس اسلام کا پیش کیا ہوا ضابطہ حیات ہے۔

۴۔ اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ قرآن و سنت کے بتائے ہوئے معروفات کو قائم کرے، منکرات کو مٹائے اور شعائر اسلامی کے احیاء و اعلا اور مسلمہ اسلامی فرقوں کے لیے ان کے اپنے مذہب کے مطابق ضروری اسلامی تعلیم کا انتظام کرے۔

۵۔ اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ وہ مسلمانانِ عالم کے رشتۂ اتحاد و اخوت کو قوی سے قوی تر کرنے اور ریاست کے مسلم باشندوں کے درمیان عصبیتِ جاہلیہ کی بنیاد وں پر نسلی و لسانی، علاقائی یا دیگر مادی امتیازات کے اُبھرنے کی راہیں مسدود کرکے ملتِ اسلامیہ کی وحدت کے تحفظ و استحکام کا انتظام کرے۔

۶۔ مملکت بلا امتیاز مذہب و نسل وغیرہ تمام ایسے لوگوں کی لابدی انسانی ضروریات یعنی غذا، لباس، مسکن، معالجہ اور تعلیم کی کفیل ہوگی جو اکتساب رزق کے قابل نہ ہوں، یا نہ رہے ہوں، یا عارضی طور پر بے روزگاری، بیماری یا دوسرے وجوہ سے فی الحال

سعیِ اکتساب پر قادر نہ ہوں۔

۷۔ باشندگانِ ملک کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو شریعتِ اسلامیہ نے اُن کو عطا کیے ہیں یعنی حدود قانون کے اندر تحفظِ جان و مال و آبرو، آزادیِ مذہب و مسلک، آزادیِ عبادت، آزادیِ ذات، آزادیِ اظہار رائے، آزادیِ نقل و حرکت، آزادیِ اجتماع، آزادیِ اکتسابِ رزق، ترقی کے مواقع میں یکسانی اور رفاہی ادارات سے استفادہ کا حق۔

۸۔ مذکورہ بالا حقوق میں سے کسی شہری کا کوئی حق اسلامی قانون کی سندِ جواز کے بغیر کسی وقت سلب نہ کیا جائے گا اور نہ کسی جرم کے الزام میں کسی کو بغیر فراہمی موقعہ صفائی و فیصلۂ عدالت کوئی سزا نہ دی جائے گی۔

۹۔ مسلّمہ اسلامی فرقوں کو حدودِ قانون کے اندر پوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی، انہیں اپنے پیروؤں کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے کا حق حاصل ہوگا۔ وہ اپنے خیالات کی آزادی کے ساتھ اشاعت کرسکیں گے۔ ان کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے فقہی مذاہب کے مطابق ہوں گے اور ایسا انتظام کرنا مناسب ہوگا کہ انہی کے قاضی یہ فیصلہ کریں۔

۱۰۔ غیر مسلم باشندگانِ مملکت کو حدودِ قانون کے اندر مذہب و عبادت، تہذیب و ثقافت اور مذہبی تعلیم کی پوری آزادی ہوگی اور انہیں اپنے شخصی معاملات کا انتظام اپنے مذہبی قانون یا رسم و رواج کے مطابق چلانے کا حق حاصل ہوگا۔

۱۱۔ غیر مسلم باشندگانِ مملکت سے حدودِ شرعیہ کے اندر جو معاہدات کیے گئے ہوں ان کی پابندی لازمی ہوگی اور جن حقوقِ شہری کا ذکر دفعہ نمبر ۷ میں کیا گیا ہے ان میں غیر مسلم باشندگانِ ملک سب برابر کے شریک ہوں گے۔

۱۲۔ رئیسِ مملکت کا مسلمان مرد ہونا ضروری ہے جس کے تدین، صلاحیت اور اصابت رائے پر جمہور یا ان کے منتخب نمائندوں کو اعتماد ہو۔

۱۳۔ رئیسِ مملکت ہی نظمِ مملکت کا اصل ذمہ دار ہوگا البتہ وہ اپنے اختیارات کا کوئی جزو کسی فرد یا جماعت کو تفویض کر سکتا ہے۔

۱۴۔ رئیسِ مملکت کی حکومت مستبدانہ نہیں بلکہ شورائی ہوگی۔ یعنی وہ ارکانِ حکومت اور منتخب نمائندگانِ جمہور سے مشورہ لے کر اپنے فرائض انجام دے گا۔

۱۵۔ رئیسِ مملکت کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ دستور کو کلاً یا جزءً معطل کر کے شوریٰ کے بغیر حکومت کرنے لگے۔

۱۶۔ جو جماعت رئیسِ مملکت کے انتخاب کی مجاز ہوگی وہی کثرت آراء سے اُسے معزول کرنے کی بھی مجاز ہوگی۔

۱۷۔ رئیسِ مملکت شہری حقوق میں عامۃ المسلمین کے برابر ہوگا اور قانونی مواخذہ سے بالاتر نہ ہوگا۔

۱۸۔ ارکان و عمالِ حکومت اور عام شہریوں کے لیے ایک ہی قانون و ضابطہ ہوگا اور دونوں پر عام عدالتیں ہی اس کو نافذ کریں گی۔

۱۹۔ محکمہ عدلیہ محکمہ انتظامیہ سے علیحدہ و آزاد ہوگا تاکہ عدلیہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں ہیئتِ انتظامیہ سے اثر انداز نہ ہو۔

۲۰۔ ایسے افکار و نظریات کی تبلیغ و اشاعت ممنوع ہوگی جو مملکتِ اسلامی کے اساسی اصول و مبادی کے انہدام کا باعث ہوں۔

۲۱۔ ملک کے مختلف ولایات و اقطاع مملکتِ واحدہ کے اجزاء انتظامی متصور ہوں گے۔ ان کی حیثیت نسلی، لسانی یا قبائلی واحدہ جات کی نہیں بلکہ محض انتظامی علاقوں کی ہوگی جنہیں انتظامی سہولتوں کے پیشِ نظر مرکز کی سیادت کے تابع انتظامی اختیارات سپرد کرنا جائز ہوگا، مگر انہیں مرکز سے علیحدگی کا حق حاصل نہ ہوگا۔

۲۱۔ دستور کی کوئی ایسی تعبیر معتبر نہ ہوگی جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔

۱۹۵۲ء - ۵۳ ۱۹ء کے دوران میں پنجاب کے مسلمانوں کی بھاری اکثریت نے مطالبہ کیا کہ قادیانیوں کو جداگانہ اقلیت قرار دیا جائے۔ اس مطالبے کو ناکام کرنے کے لیے مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ اُس زمانے میں مولانا مودودی نے ایک پمفلٹ "قادیانی مسئلہ" لکھا۔ اس پمفلٹ میں مولانا نے مسلمانوں کے اس مطالبے کی حمایت اور حکومت کی پالیسی کی مذمت کی۔ انہوں نے لکھا:

"قادیانیوں کی تکفیر کا معاملہ دوسرے گروہوں کی باہمی تکفیر بازی سے بالکل مختلف نوعیت رکھتا ہے۔ قادیانی ایک نئی نبوت لے کر اٹھے ہیں اور ان تمام لوگوں کو کافر قرار دیتے ہیں جو مرزا غلام احمد پر ایمان نہ لائیں۔ قادیانی مسلمانوں کے اندر مسلمان بن کر گھستے ہیں، اسلام کے نام سے اپنے مسلک کی اشاعت کرتے ہیں، مناظرہ بازی اور جارحانہ تبلیغ کرتے ہیں اور مسلم معاشرے کے اجزاء کو توڑ توڑ کر اپنے جداگانہ معاشرے میں شامل کرنے کی مسلسل کوشش کر رہے ہیں ..... دیکھنا یہ چاہیئے کہ ایک مطالبہ جس ضرورت کی بنا پر کیا جا رہا ہے وہ بجائے خود معقول ہے یا نہیں۔ یہاں اختلاط کا نقصان اکثریت کو پہنچ رہا ہے نہ کہ اقلیت کو۔ اس لیے اکثریت یہ مطالبہ کرنے پر مجبور ہوتی ہے کہ اُس اقلیت کو آئینی طور پر الگ کر دیا جائے۔ جو ایک طرف عملاً الگ ہو کر علیحدگی کا پورا فائدہ اٹھا رہی ہے اور دوسری طرف اکثریت کا جزو بن کر اختلاط کے فوائد بھی سمیٹتی چلی جاتی ہے۔ ایک طرف وہ مسلمانوں سے مذہبی و معاشرتی تعلقات منقطع کر کے اپنی الگ جتھہ بندی کرتی ہے اور منظم طریقے سے اُن کے خلاف ہر میدان میں کشمکش کرتی ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں میں مسلمان بن کر گھستی ہے، اپنی تبلیغ سے اپنی تعداد بڑھاتی ہے، مسلم معاشرے میں تفرقہ کا فتنہ برپا کرتی ہے اور زندگی کے ہر میدان میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنے متناسب حصے کی بہ نسبت بدرجہا

زیادہ حصّہ حاصل کر لیتی ہے۔ اس صورتِ حال کا سراسر نقصان اکثریت کو پہنچ
رہا ہے، چنانچہ اقلیت نہیں بلکہ اکثریت اسے جداگانہ اقلیت قرار دینے کا مطالبہ
کر رہی ہے۔"[1]

"قادیانی مسئلہ" لکھنے کے جرم میں ۲۸ مارچ ۱۹۵۳ء کو مولانا مودودی گرفتار کر لیے گئے اور
فوجی عدالت نے انہیں سزائے موت سنا دی۔ اس موقع پر مولانا مودودی نے کہا:

"اگر میرے خدا کی یہی مرضی ہے تو میں راضی خوشی اُس سے جا ملوں گا، لیکن اگر
اُس کی مرضی نہیں ہے اور میری موت کا وقت نہیں آیا تو یہ لوگ چاہے خود اُلٹے
لٹک جائیں، میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔"

مولانا کو سزائے موت سنانے کے فیصلے کے خلاف پورے عالمِ اسلام میں زبردست احتجاج
ہوا۔ اتنا زبردست احتجاج کہ اربابِ اقتدار اس فیصلے کو چودہ سال قیدِ بامشقت میں بدلنے پر مجبور
ہو گئے۔

مولانا مودودی ابھی جیل میں اپنی سزا پوری کر رہے تھے کہ چیف جسٹس محمد منیر نے جسٹس
ایم آر کیانی کے تعاون سے اپنی مشہور منیر رپورٹ تیار کی۔ رپورٹ نے قادیانیوں کے خلاف عوامی
تحریک کے اسباب اور سر ظفر اللہ خاں اور دوسرے قادیانیوں کو پاکستان کے کلیدی مناصب سے
الگ کرنے کے مطالبے کی چھان بین کرتے ہوئے اس اضطراب کی ذمہ داری مسلمانوں کے تعصب
اور جنونی کٹر پن پر عاید کی۔ پھر اس منطق سے نتیجہ یہ نکالا کہ اگر پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کی
اجازت دے دی گئی، تو اس کا دوسرا مطلب یہ ہوگا کہ تمام غیر مسلم تعذیب و عقوبت کا نشانہ
بن جائیں گے، مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں سر پھٹول اور برادر کشانہ جدال کا لامتناہی سلسلہ
چھڑ جائے گا، مہذب دنیا سے متصادم دقیانوسی قوانین نافذ کر دیے جائیں گے اور پاکستان

---

[1] قادیانی مسئلہ اور اُس کے مذہبی سیاسی اور معاشرتی پہلو ص ۴۰-۴۱

اپنی پس ماندہ تہذیب اور رجعت پسند نظامِ حکومت کی بنا پر ایک اچھوت کی طرح بین الاقوامی
برادری سے خارج کر دیا جائے گا۔ اسلام پر مغربی مستشرقین اور عیسائی مشنریوں نے بھی کبھی اتنا
سخت حملہ نہیں کیا تھا، منیر رپورٹ نے اس باب میں انہیں بھی مات کر دیا۔ یہ ایک المیہ
تھا کہ اس رپورٹ کا مصنف ایک مسلمان تھا۔ اس سے اس کے مضر اثرات میں کئی گنا اضافہ ہو
گیا۔ انہی مضر اثرات کو محسوس کرتے ہوئے مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی نے اس رپورٹ
پر کڑی تنقید کی۔ اس طرح پاکستان میں اسلامی ریاست کے تصور اور خود مولانا کی اپنی ذات
کے بارے میں پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں اور زہر افشانیوں کا موثر تجزیہ کیا تا کہ دنیا کو معلوم ہو جائے
کہ ان باتوں میں مطلقاً کوئی صداقت نہیں ہے۔ رپورٹ کے آخر میں چیف جسٹس محمد منیر نے
لکھا کہ اسلام کو افکارِ عصرِ جدید کا ہم آہنگ بنانے کے لیے اس کی نئی اساسی تعبیر پیش کرنے کی
ضرورت ہے تا کہ پاکستان کو دنیا میں عزت و وقار کا مقام بلند حاصل ہو۔ مولانا مودودی نے
جواب میں کہا:

"اسلام کی تجدید یا "مرمت" جیسی کچھ بھی کوئی کرنا چاہے، بڑی خوشی کے ساتھ
کرے۔ وہ اگر معقول دلائل کے ساتھ بتائے گا کہ اسلام کے بے جان اجزاء کون کون
سے ہیں، کیوں بے جان ہیں اور کیسے وہ الگ کیے جا سکتے ہیں، نیز اس کے جاندار
اجزاء اس کی رائے میں کون سے ہیں اور کس شکل میں وہ ان کو باقی رکھنا چاہتا
ہے، تو خواہ کتنی ہی جرأت و بے باکی کے ساتھ وہ اس خدمت کو انجام دے،
اس کا خیر مقدم کیا جائے گا، لیکن دو باتیں اس کو اچھی طرح سمجھ لینی چاہئیں۔ ایک
یہ کہ ہم مقدمات کے فیصلے تو عدالتوں سے لے سکتے ہیں، مگر نظریات اور فلسفے عدالتی
زور کے بل پر قبول نہیں کر سکتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مسلمانوں کا ذہن یا تو قرآن
اور حدیث کی دلیل سے مان سکتا ہے، یا پھر مستقل عقلی دلائل سے۔ مگر جو اسلام
امریکہ اور انگلستان اور ہندوستان اور بین الاقوامی برادری کے دوسرے پیشواؤں

کے سامنے یہ کہہ کر رکھ دیا جائے کہ حضرات اس میں سے جو کچھ آپ کو پسند نہ آئے کاٹ دیجیے، جو کچھ پسند آئے باقی رکھیے اور جو کچھ آپ ضروری سمجھیں اضافہ کر دیجیے، اور پھر اس اصلاح و ترمیم اور حذف و اضافے سے جو چیز تیار ہو اُسے لاکر اسلام کے نام پیش کر دیا جائے، وہ خواہ ہمارے اعلیٰ افسروں اور اُونچے دولت مند طبقے کو کتنا ہی اپیل کرے، عام مسلمان کے پاس اس کے لیے ایک حقارت آمیز ٹھوکر کے سوا کوئی دوسری صورتِ استقبال نہیں ہے۔"[1]

بالآخر مارچ ۱۹۵۶ء میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کے پہلے دستور کا اعلان کر دیا گیا۔ اس دستور میں جماعت اسلامی کے دستور کے زیادہ تر مطالبات شامل کر لیے گئے تھے تاہم یہ المناک واقعہ ہے کہ عین اس وقت جب اس دستور کو عملی جامہ پہنانے اور اسلامی ریاست کی بنیاد بنانے کے اقدامات کیے جا رہے تھے۔ صدر سکندر مرزا اور جنرل محمد ایوب خان نے ملی بھگت کر کے، ۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو مارشل لا نافذ کر دیا، دستور منسوخ کر دیا اور جماعتِ اسلامی سمیت تمام سیاسی جماعتوں کو توڑ دیا۔ اسی مہینے ایوب خان نے سکندر مرزا سے اختیارات چھین کر زمامِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لی۔

مولانا مودودی حالات سے ذرا بھی شکستہ دل نہ ہوئے اور پوری جرأت کے ساتھ ہر طرح کے خطرات مول لے کر اسلام کی راہ میں جدوجہد کرتے رہے۔ مارشل لا کے باوجود انہوں نے اپنی ان تمام تقریروں اور تحریروں پر نظر ثانی کی جو ۱۹۳۹ء اور ۱۹۵۸ء کے درمیانی عرصے میں کی یا لکھی تھیں اور انہیں اسلامی ریاست (اور انگریزی میں (Islamic Law and Constitution) کے نام سے شائع کیا۔ اس کتاب میں بڑے مؤثر انداز میں یہ ذہن نشین کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ شرعی قوانین نہ صرف آج کے دَور کی ناگزیر ضرورت ہیں بلکہ وہ ایک جدید حکومت کے لیے موزوں بھی ہیں اور اُس کے تقاضوں کو پورا بھی کرتے ہیں۔ مولانا مودودی کے دلائل اس قدر قوی

---

[1] تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ پر تبصرہ (اردو) ص ۱۸۱-۱۸۲

اور مؤثر تھے کہ بعض بلند مرتبت مسیحی بھی ان سے متاثر ہوئے؛ چنانچہ پاکستان کے (سابق) چیف جسٹس اے۔ آر۔ کارنیلیس نے اسلامی قوانین کو اپنانے کی کھلے عام تائید کی اور انہیں ملک کے لیے واحد موزوں نظام قرار دیا۔

۵ اور ۶ مئی ۱۹۶۰ء کو مولانا مودودی اور تمام مکاتبِ فکر کے ۱۹ نمائندہ علماء لاہور میں جمع ہوئے اور پاکستان میں پارلیمانی نظام کی ناکامی کے اسباب کا کھوج لگانے کے لیے حکومت نے جو دستوری کمیشن مقرر کیا تھا اس کے سوالنامے کا متفقہ جواب دیا اور جمہوریت اور انسانی حقوق کی بحالی کے سلسلے میں ضروری اصلاحی اقدامات تجویز کیے۔

"پاکستان مسلمان عوام کی جدوجہد کے نتیجے میں بنا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے بعد مسلمان عوام کا عزمِ صمیم ہی اس کے وجود کی سلامتی اور قوت کا ضامن ہو سکتا ہے۔ اس ملک کے قیام میں کسی غیر مسلم نے کوئی حصّہ نہیں لیا۔ مسلمانوں کی قربانیوں کے بغیر یہ نہ تو وجود میں آ سکتا تھا اور نہ قائم ہی رہ سکتا ہے۔ اگر خدانخواستہ یہ ملک مسلمانوں کی امیدوں کا مرکز نہیں رہتا اور وہ اس کی خاطر زندہ رہنے اور مرنے کے عزم سے دستبردار ہو جاتے ہیں تو اس کے وجود کی بقا ممکن ہی نہیں ہے۔ چند اعلیٰ سرکاری ملازموں اور خوش حال گھرانوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی حقیر سی تعداد کو چھوڑ کر عام مسلمان آبادی اس ملک کو ایک ایسی اسلامی ریاست بنانا اور اسی صورت میں زندہ و پائندہ دیکھنا چاہتی ہے جس کے قوانین اسلامی ہوں، جس کا تعلیمی نظام اسلامی ہو اور جس کی تہذیب و ثقافت اسلامی ہو۔ اسی مقصد کے لیے مسلمانوں نے پاکستان بنایا اور اپنے مال و جان اور عزت و آبرو کی قربانی دی۔ اس ملک کے ساتھ اس سے بڑی دشمنی اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ عوام کے اس تعلق کو تباہ و برباد کر دیا جائے۔ عام مسلمانوں میں مایوسی پیدا کرنے کے بعد یہ مٹھی بھر لوگ جو اپنے مذہب ------ اسلام کے نام ہی سے بیزار ہیں اس مملکت

میں کہاں کہاں تحریف کی ہے۔ "سورۂ نور" اور "سورۂ احزاب" کی تفسیر الگ بھی شائع ہوئی ہے۔ ان میں بڑے دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ مختلف جرائم پر اسلام جو سزائیں دیتا ہے وہ نہ صرف انسانی ہیں بلکہ انسان کی خود ساختہ لادینی تعزیرات کے مقابلے میں کہیں زیادہ مؤثر ہیں۔ یہ دونوں تفسیریں پاکستان کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں رائج ہیں اور اسلامیات اور قانون کے طلباء ان سے استفادہ کرتے ہیں۔ مولانا مودودی نے حدیث پر بھی تحقیقی کام کیا ہے۔ اپنی کتاب "سنت کی آئینی حیثیت" میں انہوں نے منکرینِ حدیث خصوصاً غلام احمد پرویز کے افکار کی زبردست تردید کی ہے۔

۱۹۶۱ء میں سعودی عرب کے شاہ سعود کی درخواست پر مولانا مودودی نے مدینہ منورہ میں قائم ہونے والی اسلامی یونیورسٹی کا مفصل خاکہ پیش کیا۔ مولانا کا خیال ہے کہ اس منصوبے سے وہ فکری و تعلیمی خلاء بھر جائے گا جو الازہر یونیورسٹی کے لادینیت اور قوم پرستی کا شکار ہو جانے سے پیدا ہوا ہے۔

"مدینہ کی اسلامی یونیورسٹی کے لیے جو خاکہ میں نے پیش کیا اور جسے شاہ کی مقرر کردہ کمیٹی نے منظور کر لیا، اس میں قرآن، حدیث، فقہ، اسلامی تاریخ اور علم کلام کیساتھ ساتھ جدید فلسفہ، جدید قانون، سیاسیات، معاشیات، تاریخ اور متقابل مذاہب کی تعلیم کا اہتمام کیا گیا ہے۔ انگریزی، فرانسیسی یا جرمنی میں سے کسی ایک زبان کی تحصیل بھی لازمی ہوگی۔ اس خاکے میں تعلیم کا جو تصور پیش کیا گیا ہے وہ محدود اصطلاحی معنوں میں نہ تو "لادینی" (سیکولر) ہے نہ "مذہبی"۔ یہ یونیورسٹی تمام قدیم اور جدید تعلیمی اداروں سے مختلف اور یکتا مقام کی حامل ہوگی۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس یونیورسٹی سے ایسے مسلمان علماء نیار ہو کر نکلیں جو اسلامی علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم کے بھی پوری طرح ماہر ہوں اور اسلامی اصولوں کو آج کی زندگی کے مسائل پر منطبق کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں[1]۔"

---

[1] مصنف کے نام مولانا مودودی کے مکتوب مورخہ یکم اپریل ۱۹۶۱ء سے ایک اقتباس۔

کو کس طرح مسخ کر سکتے ہیں؟[1]"

۲ مارچ ۱۹۶۱ء کو کل پاکستان انجمنِ خواتین (اپوا) کی ترغیب پر حکومت نے مسلم عائلی قوانین کا آرڈیننس نافذ کر دیا جو شریعتِ مطہرہ کے صریح متناقض تھا، جس کے تحت تعددِ ازدواج پر کڑی پابندی عاید کر دی گئی، شادی بیاہ کی رجسٹریشن ضروری قرار دے دی گئی، شادی کی کم سے کم قانونی عمر مقرر کر دی گئی اور نجی طور پر خاوند کا بیوی کو طلاق دینا ممنوع قرار پایا۔ مولانا مودودی نے ملک بھر کے ۲۰۹ علماء کے ساتھ مل کر اس قانون کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور اس کو منسوخ کرنے یا کم از کم اس کی قابلِ اعتراض دفعات میں ترمیم کرنے کا مطالبہ کیا۔ علماء کے اس بیان پر حکومت نے سخت اور متشددانہ اقدامات کیے۔ جن لوگوں نے اس بیان کو چھاپا اور عوام میں پھیلایا انہیں گرفتار کر کے جیلوں میں بند کر دیا۔

اس زمانے میں مولانا مودودی انفرادی طور پر تصنیف و تحریر اور دعوت و تبلیغ میں ہمہ تن مصروف رہے۔ ۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۲ء کے درمیانی عرصے میں انہوں نے اپنی تفسیر تفہیم القرآن کے سلسلے میں عرب مشرقِ وسطیٰ کا وسیع دورہ کیا اور عرب، فلسطین اور مصر میں ان تمام تاریخی مقامات کو دیکھا جن کا ذکر قرآنِ کریم میں آیا ہے۔ تفہیم القرآن کا آغاز ۱۹۴۳ء میں ہوا تھا۔ اب تک اس کی چار جلدیں مکمل ہو چکی ہیں اور پورے عالمِ اسلام میں ان کی زبردست مانگ ہے۔ اس مانگ کو پورا کرنے کے لیے تفہیم القرآن کا ترجمہ انگریزی، عربی، بنگالی اور پشتو میں کیا جا رہا ہے۔ "تفہیم القرآن" مولانا مودودی کے علمی کمال کا ایک شاہکار ہے۔ اس میں وہ بڑے عالمانہ انداز میں اسلامی نظامِ حیات کی صداقت اور دوسرے تمام نظام ہائے زندگی پر اس کا تفوق ثابت کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی بتاتے جاتے ہیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنی مقدس کتابوں

---

[1] دستوری کمیشن کے سوالنامے کا جواب اور ایک اسلامی مملکت کے اساسی اصول (انگریزی) شائع کردہ مولانا محمد داؤد غزنوی لاہور ۱۹۶۶ - ص ۲۶ - ۲۷

۱۹۶۳ء میں جب مصر اور سعودی عرب میں سیاسی نزاع پیدا ہوا تو شاہ سعود نے مصر کا بنایا ہوا غلافِ کعبہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مولانا مودودی نے غلافِ کعبہ پاکستان میں تیار کرنے کی پیش کش کی۔ شاہ نے ان کی یہ پیش کش قبول کر لی، چنانچہ مولانا مودودی کی نگرانی میں لاہور کے بہترین باکمال کاری گروں نے غلافِ کعبہ تیار کیا، جس پر زر دوزی کی گئی تھی۔ غلافِ کعبہ تیار ہو گیا تو اس کے دو بڑے ٹکڑوں کی نمائش کی گئی۔ دو ریل گاڑیاں ان ٹکڑوں کو جماعتِ اسلامی کے کارکنوں کی نگرانی میں لے کر لاہور سے کوئٹہ، کوئٹہ سے کراچی، لاہور سے پشاور اور پشاور سے کراچی گئیں۔ اس طرح پورے مغربی پاکستان میں لوگوں نے غلافِ کعبہ کی زیارت کی۔ قبل ازیں ایسا دینی جوش و خروش کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ مرد و زن، بوڑھے اور بچے ریلوے اسٹیشنوں کی طرف جوق در جوق امڈ پڑے۔ دیہات اور قصبے خالی ہو گئے۔ بعض مقامات پر تو ہزاروں اور لاکھوں کا مجمع مسلسل کئی دن تک ریل گاڑی کی آمد کا منتظر بیٹھا رہا۔ گاڑی پہنچتی تو جماعتِ اسلامی کے کارکن غلافِ کعبہ ہاتھوں میں بلند کر کے لوگوں کو دکھاتے۔ جذبات کا یہ عالم ہوتا کہ لوگ فرطِ مسرت سے رونے لگتے۔ قرآن کی تلاوت، دعاؤں اور تکبیر و تہلیل سے فضا گونج اٹھتی، قریب کے لوگ غلاف کو چومتے اور خوشبو میں بسا دیتے۔ لاہور میں غلافِ کعبہ کا جلوس پاکستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ دس لاکھ سے زائد لوگ غلافِ کعبہ کے جلو میں ہوائی اڈے پر پہنچے۔ جلوس کے سارے راستے میں تلاوتِ قرآن ہوتی رہی۔ ہوائی اڈے پر مولانا مودودی نے غلافِ کعبہ سعودی عرب کے سفیر کو پیش کر دیا۔ سفیر نے مولانا کا شکریہ ادا کیا۔ جن لوگوں نے ان مناظر کو دیکھا، انہیں حتیٰ کہ کئی منکر غیر ملکی صحافیوں، نامہ نگاروں اور کیمرہ مینوں کو بھی اس بات میں ذرا شک و شبہ نہ رہا کہ پاکستان کے لوگ اسلام سے محبت کرتے ہیں اور اسے قومی اور بین الاقوامی زندگی کے ہر میدان میں نافذ و رائج کرنے کے آرزو مند ہیں۔

مولانا مودودی کی روز افزوں مقبولیت اور اثر سے خار کھا کر ان کے دشمنوں نے جماعتِ اسلامی کے سالانہ اجتماع، منعقدہ ۲۵ تا ۲۸ اکتوبر ۱۹۶۳ء کو ناکام کرنے کی ہر طرح کوشش کی۔ طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالیں۔ سفر کے لیے ریزرو کروائی ہوئی نشستیں منسوخ کر دیں، لاؤڈ اسپیکر استعمال کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ اس کے باوجود اجتماع منعقد ہوا اور دس ہزار سے زائد افراد شریک ہوئے۔ پولیس کی موجودگی میں غنڈوں نے پنڈال کو آگ لگانے اور مولانا مودودی کو قتل کرنے کی کوشش کی، لیکن مولانا کی جرأت اور کارکنانِ جماعت کے ضبط و تحمل کی بدولت دشمن اپنے ناپاک عزائم میں ناکام و خاسر رہے۔ اجتماع نہایت کامیابی کے ساتھ ختم ہوا اور دور رس نتائج چھوڑ گیا۔

اس عظیم کامیابی پر مولانا کے مخالفین انگاروں پر لوٹ گئے۔ انہوں نے مولانا اور جماعتِ اسلامی کے خلاف سرکاری پریس میں پروپیگنڈے کی مہم زور شور سے جاری رکھی۔ یہ مہم ۶ جنوری ۱۹۶۴ء کو پورے عروج پر پہنچ گئی، جب کہ جماعتِ اسلامی کو خلافِ قانون قرار دے دیا گیا، اس کے تمام ممتاز رہنما گرفتار کر کے مقدمہ چلائے بغیر قید کر دیئے گئے۔ پولیس نے جماعت کے تمام دفاتر، دارالمطالعے اور مقاماتِ اجتماع سر بمہر کر دیئے۔ تاہم جب یہ مقدمہ سپریم کورٹ میں سماعت کے لیے پیش ہوا، عدالت نے جماعت کو خلافِ قانون قرار دینے اور اس کے رہنماؤں کو گرفتار کرنے کے اقدامات کو باطل قرار دے دیا۔ رہائی کے پندرہ دن بعد ۲۵ اکتوبر ۱۹۶۴ء کو، جب کہ صدارتی انتخاب کی مہم پورے جوش و خروش سے جاری تھی، مولانا مودودی نے لاہور میں ایک عظیم الشان اجتماع میں دو گھنٹے تقریر کی۔ اس تقریر میں مولانا نے پُر جوش الفاظ اور مؤثر دلائل کے ساتھ برسرِ اقتدار حکومت کی تمام پالیسیوں پر تنقید کی اور کہا کہ موجودہ حکومت غیر قانونی طریقے سے وجود میں آئی ہے اور برسرِ اقتدار رہنے کا کوئی حق نہیں رکھتی۔

"ہمارا سب سے بڑا "جرم" یہ ہے کہ ہم اسلام پر یقین و ایمان رکھنے کے معاملے میں ریاکار اور منافق نہیں ہیں۔ ہم اپنے معاشرے کے معاملات کو

ایک خاص نمونے پر ڈھالنے اور اسلامی اصولوں سے ہم آہنگ کرنے کی سرتوڑ جدوجہد کر رہے ہیں ۔ جب ہم اقرار کرتے ہیں کہ اسلام ہمارا دین ہے تو اس کا فطری تقاضا یہ ہے کہ اسلام اور صرف اسلام ہی ہماری زندگی کے تمام شعبوں میں نورِ ہدایت کا کام دے ۔ خواہ ان کا تعلق اخلاق و کردار سے ہو یا اعتقاد اور نظریے سے ، اخلاقیات سے ہو یا تعلیم سے ، معاشرت سے ہو یا ثقافت سے ، اقتصادی نظام سے ہو یا سیاسی ڈھانچے سے ، قانون سے ہو یا عدالت سے ، داخلی امور سے ہو یا بین الاقوامی روابط سے اپنی انفرادی اور قومی زندگی میں فساد انگیز اجنبی اثرات کا شائبہ تک باقی نہ رہنے دیا جائے ۔ ہم اس مسئلے پر کسی قسم کی مصالحت برداشت نہیں کرتے ، ہمارا جس بات پر اعتقاد ہے ہم اُس کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ رکھتے ہیں ۔ یہ بات ان لوگوں کو سخت ناگوار گزرتی ہے جو اسلام کے نام پر لوگوں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں ۔ ان کی سوچی سمجھی پالیسی یہ ہے کہ عملاً تو زندگی کے ہر شعبے میں اسلام کے خلاف چلیں لیکن زبان سے اُس کی شان میں قصیدہ سرائی کرتے رہیں تاکہ قوم دھوکا کھا کر ان کے ساتھ وابستہ رہے ۔ ہمارا دوسرا "جرم" یہ ہے کہ ہم مضبوط اور قابلِ اعتماد کردار کے لوگ آگے لانے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ ہم اپنے حلقے میں لوگوں کو مناسب چھان بین کے بعد شامل کرتے ہیں ۔ اسی طرح جو شخص جماعت اسلامی میں شامل ہوتا ہے خوب سوچ بچار کر کے شامل ہوتا ہے اور جب وہ ایک مرتبہ اپنی راہِ عمل منتخب کر لیتا ہے تو اس کی پوری زندگی اس کے تقاضوں کے مطابق ڈھل جاتی ہے ۔ وہ اپنے عقیدے کے محض زبانی اظہار پر مطمئن نہیں ہو جاتا بلکہ اس عقیدے کے مطابق زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔ اپنے کردار و عمل میں ضروری تبدیلیاں لاتا ہے ۔ جبر و تشدد اور دباؤ

سے ان کے اندر کوئی تبدیلی نہیں آ سکتی ۔ وہ معروف کے معروف اور منکر کے منکر ہونے کا اعلان کھلے عام پیش کرتے ہیں ۔ وہ قید و بند سے نہیں ڈرتے بلکہ جیل خانوں کو اپنی اخلاقی و روحانی تربیت گاہ سمجھتے ہیں[1] ......

جب مولانا مودودی نے صدارتی انتخاب میں محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت کی تو انتہائی تجدد پسند حضرات نے بھی ان پر اسلامی تعلیمات کو مسخ کرنے کا الزام عائد کیا ، حالانکہ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے مارشل لا کے دوران میں مسلمانوں پر عائلی قوانین کا آرڈی نَنس مسلط کیا تھا جو صریحاً خلافِ اسلام تھا ۔ مولانا مودودی نے اُن کے جواب میں فرمایا

"اب میں مختصراً اس مسئلے پر بحث کروں گا کہ کیا اسلام میں کوئی عورت ملک کی سربراہ بن سکتی ہے ۔ اس ضمن میں ان اربابِ غرض سے چند سوالات کرنا بے محل نہ ہوگا ۔ کیا اسلام عورتوں کو وزیر یا سفیر بنانے کی اجازت دیتا ہے ؟ کیا مخلوط تعلیم ، معاشرے میں مرد و زن کا اختلاط اور دفاتر میں مردوں کے ساتھ عورتوں کی ملازمت ، اسلام کی نگاہ میں پسندیدہ ہے ؟ کیا اسلام مسلمان عورتوں کو کھلے عام اور حکومت کی سرپرستی میں منعقد ہونے والی ثقافتی تقریبات میں گانے اور ناچنے کی اجازت دیتا ہے ؟ کیا اسلام فی الواقع مسلمان لڑکیوں کو فضائی میزبان بننے اور مسافروں کو شراب پیش کرنے کی اجازت دیتا ہے ؟ اگر پاکستان میں ان سب باتوں کی اجازت ہے تو پھر صدارتی انتخاب کا مسئلہ سامنے آتے ہی ان حضرات کی اسلامی حس کیوں جاگ اُٹھی ہے ؟ پھر ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا اسلام میں مملکت کے سربراہ کے لیے صرف یہی کافی ہے کہ وہ مرد ہو اور یہ دیکھنا

---

[1] پاکستان کی سیاسی صورتِ حال کا جائزہ (انگریزی) از ابوالاعلیٰ مودودی شائع کردہ جماعت اسلامی کراچی ص ۱۴۳-۱۴۷ ۔

ضروری نہیں ہے کہ اس میں اوصاف بھی پائے جاتے ہیں یا نہیں ؟ اگر کبھی قوم کو ایسی صورتِ حال درپیش ہو کہ اُسے دو شخصیتوں میں سے ایک کو منتخب کرنا پڑے، جن میں سے ایک کے خلاف سوائے اس کے اور کچھ کہا نہ جا سکتا ہو کہ وہ عورت ہے اور دُوسرا ہے تو مرد لیکن اُس میں ان اوصاف میں سے ایک وصف بھی نہ پایا جاتا ہو جو ایک عادل اور صالح قیادت کے لیے ضروری ہیں، تو ایسی صورت میں کیا اسلام کی شدُبُد رکھنے والا کوئی شخص بھی اوّل الذکر کو چھوڑ کر مؤخر الذکر کے حق میں رائے دے سکتا ہے؟ ؎۱"

ستمبر ۶۵ء میں بھارت نے پاکستان کو ختم کرنے کے لیے نہایت مکاری سے اچانک حملہ کر دیا۔ یہ جنگ ۶ ستمبر سے ۲۲ ستمبر تک جاری رہی اس دوران میں مولانا مودودی نے ریڈیو پاکستان لاہور سے تین تقریریں نشر کیں اور اعلان کیا کہ پاکستان کے دفاع کی یہ جدوجہد جہاد فی سبیل اللہ کا حکم رکھتی ہے۔ محاذِ جنگ پر لڑنے والے سپاہی ہی نہیں ملک کا ہر شہری اور صنعت و حرفت، زراعت اور تجارت وغیرہ تمام پیشوں سے تعلق رکھنے والے عوام بھی جہاد کر رہے ہیں۔ ان جوش انگیز تقریروں نے عوام اور فوجوں کے دل گرمانے میں زبردست حصہ لیا۔ پاکستانی عوام کا مورال بلند ہو گیا۔ انہوں نے بڑھ چڑھ کر قربانیاں دیں اور ملک کی مدافعت کے لیے اپنی سی ہر کوشش کر گزرے۔ ہزاروں مرد، عورتیں حتیٰ کہ بچے تک قومی دفاعی فنڈ میں روپیہ، زیور، خوراک، کپڑے اور خون دینے کے لیے اُمڈ پڑے۔ مولانا مودودی نے کشمیر میں حصولِ انصاف کی خاطر ہر ممکن کوشش کی۔ مظفر آباد ریڈیو سے آپ نے جو تقریر کی اس میں کشمیری مسلمانوں پر بھارت کے مظالم کی پُرزور الفاظ میں مذمت کی۔ مولانا مودودی نے اقوامِ متحدہ کے حکم جنگ بندی اور اعلانِ تاشقند (۱۰ جنوری ۱۹۶۶ء)

؎۱ حوالہ سابق ص ۶۰، ۶۳، ۶۴۔

دونوں کی مخالفت کی اس لیے کہ ان سے بھارت کی سیاسی حکمتِ عملی فتح مند رہی تھی اور مسئلہ کشمیر کا حل ناممکن ہو گیا تھا۔

اسرائیل نے ۵، ۹ جون ۱۹۶۷ء کو مصر، شام اور اُردن پر ظالمانہ جارحیت کا ارتکاب کیا۔ مولانا مودودی نے فلسطین خصوصاً بیت المقدس کو صہیونی تسلط سے نجات دلانے میں اپنی ساری عملی قوتیں اپنے عرب بھائیوں کی تائید و حمایت میں لگا دیں۔

مارچ ۱۹۷۲ء میں رابطہ عالمِ اسلامی کا سالانہ اجلاس مکہ معظمہ میں منعقد ہوا۔ مولانا مودودی نے تنظیم کے ایک بانی رکن ہونے کی حیثیت سے مسلمان ملکوں پر زور دیا کہ وہ فوجی اعتبار سے خود مکتفی ہوں اور امریکہ، سوویٹ یونین یا کسی اور اجنبی طاقت پر انحصار نہ کریں۔ مزید برآں آپ نے عالمِ اسلام کو قوم پرستی کو ترک کرنے اور متحد ہو کر ایک بلاک بنانے کی دعوت دی تاکہ وہ ہر جگہ اپنا اور اسلام کا دفاع کر سکے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ صرف اسلام ہی ایک ایسا نظریہ ہے جو مختلف نسلوں اور قوموں کو متحد کر کے ایک گھرانے میں تبدیل کر سکتا ہے، ایک عالمی ریاست کی بنیاد کا کام دے سکتا ہے اور دنیا بھر کو عدل و انصاف اور امن و امان سے ہمکنار کر سکتا ہے۔

> اسلام اس بات کو محض ایک نظریے اور فلسفے کے طور پر پیش کر کے نہیں رہ گیا بلکہ عملاً اس نے ایک معاشرہ انہی بنیادوں پر وجود میں لا کر دکھایا۔ اس معاشرے میں اس نے مختلف نسلوں اور قوموں کو بالکل مساوی حیثیت سے جمع کر دیا۔ نسل، رنگ، زبان اور قومیت کے سارے امتیازات مٹا دیئے.... پھر اسی نظریے کی بنیاد پر اسلام نے عملاً ایک عالمی ریاست بھی قائم کر کے دکھا دی...... تمام بلادِ اسلام میں ایک ہی قانون رائج تھا۔ تمام مسلمان بالکل ایک برادری تھے۔ مشرق سے مغرب تک دنیا کے کسی ملک میں جو شخص بھی اسلام قبول کرتا تھا۔ وہ ٹھیک انہی حقوق کے ساتھ اسلامی معاشرے میں شامل

ہو جاتا تھا جو عربوں کے حقوق تھے .... ایک حبشی، ایک رومی، ایک ایرانی، ایک قبطی، ایک بربری کلمۂ اسلام کا قائل ہونے کے بعد ٹھیک اسی صف میں آ کھڑا ہوتا تھا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے خاندان اور آپ کی اپنی قوم کے لوگ کھڑے تھے۔ اس کی حیثیت اور اُس کا مرتبہ وہی تھا جو ان کا تھا اور اپنے اوصاف کے لحاظ سے وہ اسلامی معاشرے اور ریاست میں بڑی سے بڑی فضیلت حاصل کر سکتا تھا....... کلمۂ اسلام کا ماننے والا خواہ کسی وطن اور کسی نسل سے تعلق رکھتا ہو، خواہ کوئی زبان بولتا ہو، خواہ اس کی جلد کا رنگ کچھ ہی ہو بہرحال وہ ہے مسلمانوں کا بھائی اور مسلم معاشرے میں ... جہاں بھی چلا جائے اس کے حقوق وہی ہیں جو دوسرے سب مسلمانوں کے ہیں۔ مشرق سے مغرب تک مسلمان جس ملک میں بھی چاہتا بے روک ٹوک جا سکتا تھا، جہاں چاہتا پھر سکتا تھا۔ جتنے دن چاہتا ٹھیر سکتا تھا، جو کاروبار چاہتا کر سکتا تھا، بڑے سے بڑے سرکاری عہدوں پر فائز ہو سکتا تھا اور شادی بیاہ میں بھی اس کے لیے کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ اسلامی تاریخ ایسی ہزاروں مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ ایک مسلمان اپنے ملک سے نکل کر دنیا بھر کے مسلمان ممالک میں سالہا سال تک پھرتا رہا ہے، کہیں اُس نے علم حاصل کیا، کہیں اُس نے تجارت کی، کہیں اُس کو وزارت یا فوج کی سپہ سالاری مل گئی، کہیں وہ رہ پڑا اور اُس نے شادی کر لی۔ اس کی ایک نمایاں مثال ابن بطوطہ ہے جس نے ۲۷ سال مختلف مسلمان ملکوں میں پھر کر گزار دیئے اور کہیں اُس کو پاسپورٹ یا ویزا کی ضرورت پیش نہ آئی۔ کہیں اُس سے نہ پوچھا گیا کہ تیری قومیت کیا ہے۔ کہیں اُسے اپنی معاش کے لیے وسائل فراہم کرنے میں کوئی زحمت پیش نہ آئی۔ کہیں اُسے اقامت کے لیے پرمٹ نہ لینا پڑا۔ کہیں اُس کے قیام کے لیے کوئی مدت مقرر نہ کی گئی، بلکہ کسی جگہ اگر اُس نے سرکاری ملازمت کرنی چاہی تو وہ بھی

بلا تکلف مل گئی۔ سلطان محمد تغلق کے زمانے میں وہ ہندوستان پہنچا ہے اور یہاں مراکش کے انتہائی سرے سے آیا ہوا وہ شخص مجسٹریٹ بنا دیا جاتا ہے۔ پھر سلطان اُس کو اپنا سفیر بنا کر چین بھیج دیتا ہے، یعنی ڈپلومیٹک سروس تک میں اُس کو داخل ہونے سے کوئی چیز نہیں روک سکتی۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اُس وقت دنیا بھر کی مسلمان ریاستوں کے درمیان محض دولت مشترکہ (Commonwealth) ہی کا نہیں بلکہ شہریتِ مشترکہ (common citizenship) کا تصور بھی پوری طرح کار فرما تھا۔ ہر مسلمان حکومت کے لیے پوری دنیائے اسلام کی افرادی قوت (man power) قابلِ حصول تھی۔ عالم اسلام کی حفاظت و مدافعت تمام مسلمانوں کی مشترک ذمہ داری تھی۔ انیسویں صدی عیسوی کے آغاز تک دنیائے اسلام میں ہم یہی کیفیت جاری و ساری پاتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر اس بات کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ دنیا کے اہل فکر آج جس عالمی ریاست کی تمنا ظاہر کر رہے ہیں، اسلام نے صرف یہی نہیں کہ اس کے لیے تمام فکری و نظری بنیادیں فراہم کر دی ہیں بلکہ صدیوں تک وہ عملاً اس کا مظاہرہ کرتا رہا ہے....

(صفحہ ۱۹-۲۴)

انڈونیشیا سے مراکش تک چلے جائیے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے تمام ماننے والوں کی ایک مشترک تہذیب ہے۔ اس تہذیب کے بنیادی اصول تمام مسلمان ملکوں میں یکساں جاری و ساری ہیں۔ ایک مسلمان خواہ کسی ملک میں جائے اذان کی آواز اس کے کان میں آتے ہی فوراً اُسے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں اس کے اپنے بھائی موجود ہیں۔ ایک مسجد بھی یہاں ضرور پائی جاتی ہے جس کی جماعت کا وہ بھی ویسا ہی ایک ممبر ہے جیسا اس ملک کے باشندوں میں سے کوئی شخص ہو سکتا ہے۔ وہ جا کر اس میں شریک ہوتا

ہے تو وہاں کوئی اسے اجنبی نہیں سمجھتا، بلکہ یہ معلوم ہونے کے بعد کہ وہ ایک دوسرے
مسلمان ملک سے آیا ہے مسجد کے مقامی حاضرین دوڑ دوڑ کر آتے ہیں اور محبت سے
اُسے گلے لگاتے ہیں۔ وہ اُن کی زبان سے واقف نہیں ہے، مگر اسلام علیکم اس
کے اور ان کے درمیان مشترک ہے .... نماز کی شکل اور ہیئت انڈونیشیا
سے لے کر مراکش تک ایک ہی ہے۔ جماعت کے لوگ اُس اکیلے اجنبی کو امام
بھی بنا سکتے ہیں اور وہ اکیلا اجنبی ان کے امام کے پیچھے بھی نماز پڑھ سکتا ہے۔
مسجد سے نکل کر وہ اس ملک کی مسلم سوسائٹی میں جہاں بھی جاتا ہے محسوس کرتا ہے
کہ اُس کے اور اُن کے درمیان تہذیب و ثقافت کا بہت بڑا اتحاد موجود ہے۔
وہ ہر جگہ ان کے ساتھ بیٹھ کر اطمینان کے ساتھ کھانا کھا سکتا ہے کہ جن چیزوں کو
وہ حرام سمجھتا ہے یہ بھی انہیں حرام سمجھتے ہیں اور پاکی و طہارت کے جن قواعد کا
وہ قائل ہے یہ بھی اُن کے قائل ہیں۔ پھر جس ملک میں بھی وہ جاتا ہے اس کے
خواص ہی نہیں عوام تک بازاروں اور بسوں اور ہوٹلوں میں جب اُس سے
ملتے ہیں تو اُس کے ملک کے مسلمانوں کی خیریت اس طرح پوچھتے ہیں جیسے ایک
کنبے کے لوگ اپنے رشتہ داروں کی خیریت دریافت کرتے ہیں۔ اچھے حالات
سنتے ہیں تو الحمد للہ کہتے ہیں اور خوشی ان کے چہروں پر چمک رہی ہوتی ہے۔
بُرے حالات سنتے ہیں تو اس پر ویسے ہی غمگین ہوتے ہیں جیسے اس کے اپنے
ملک کے مسلمان ہو سکتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان تمام ملکوں کے درمیان نکاح و
طلاق و وراثت کے قوانین اس قدر ایک دوسرے سے قریب ہیں کہ ان کے
درمیان باہمی ازدواج تک میں کوئی دشواری نہیں ہے۔ یہ کیفیت مسلمان کے سوا
کسی دوسرے ملک میں کہیں محسوس نہیں ہوتی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تمام مسلمان
ملکوں کے درمیان جذبات کا، ہمدردی و خیر خواہی کا، تہذیب اور ثقافت کا

ایک گہرا اور مضبوط رشتہ موجود ہے، جسے آج قوم پرستی کے جنون کے دور میں بھی
کوئی چیز توڑ نہیں سکی ہے۔ اس کے ساتھ جغرافی حیثیت سے بھی تمام مسلمان ملک
ایک دوسرے سے از شرق تا غرب متصل ہیں، پھر آخر کیوں نہ وہ اپنے مشترک
مسائل کو حل کرنے اور ایک دوسرے کی ترقی میں مددگار بننے کے لیے باہم جمع ہوں؟
...... (ص ۳۴-۳۵) مجھے ان لوگوں کو دیکھ کر سخت حیرت ہوتی ہے کہ جو مسلمان
ممالک کے اتحاد کے لیے مخالفت کر رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ مذہب کے نام پر ریاستوں
کا جمع ہونا غلط ہے۔ کمیونزم کے نام پر جمع ہو جانا اور ایک دوسرے کے ساتھ
تعاون کرنا صحیح۔ رنگ کی بنیاد پر جمع ہو جانا بھی صحیح۔ لیکن صرف خدا کے نام پر
اور خدا کے دین کے نام پر جمع ہو جانا بہت بُری بات ہے۔ یہ منطق میری سمجھ
سے باہر ہے۔ (ص ۳۴)....... اب جب کہ مسلمانوں نے اپنی قسمت
آپ بنانے کا حق پھر حاصل کر لیا ہے، اُن کے دشمن ایک بار پھر قوم پرستی کی
تبلیغ و اشاعت میں زور شور سے مصروف ہو گئے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس
طرح وہ مسلمانوں کو اتحاد کے مضبوط روابط میں منسلک ہونے سے باز رکھ سکیں
گے۔ دنیا کی بڑی طاقتوں، صیہونیت اور توسیع پسند سامراج کے لیے احیائے
اسلام اور اتحادِ اسلامی سے بڑھ کر ڈراؤنا تصور اور کوئی نہیں ہے۔ اگر دنیا کے
ساٹھ کروڑ مسلمان ایک مرتبہ متحد ہو جاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان طاقتوں
کے توسیع پسندانہ عزائم اور مسلمان ملکوں کا استحصال ختم ہو کر رہ جاتا ہے صیہونی
خوب جانتے ہیں کہ جس روز مسلمان متحد ہوں گے اسرائیل کو ختم ہوتے دیر نہ لگے
گی۔ یہی خوف ان لوگوں کو بھی ہے جو ایشیا اور افریقہ پر ہندوؤں کے اقتدار
اور غلبے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ سامراجی طاقتیں اچھی طرح جانتی ہیں کہ اس
اتحاد کے بعد اُن کے لیے مسلمان ملکوں کی قسمتوں سے کھیلنا ممکن نہیں رہے گا،

جس طرح وہ ماضی میں اپنے پٹھوؤں کو کبھی یہاں کبھی وہاں برسرِ اقتدار لا کر کھیلتی رہی ہیں۔ (صفحہ ۴۳) .... مسلمان ملک جس افراتفری اور انتشار سے دوچار ہیں، اس میں اس آواز نے کہ مسلمان ملکوں کے سربراہوں کی کانفرنس منعقد کی جائے، نئی اُمید پیدا کر دی ہے .... جہاں مسلمانوں کو اپنی طرف بڑھنے والے دوستی اور تعاون کے ہاتھ کو خوش آمدید کہنی چاہیئے خواہ وہ کسی بھی ملک کا ہاتھ ہو، وہاں عالمی طاقتوں سے ہر وقت چوکنا بھی رہنا چاہیئے جو ہماری موجودہ پس ماندگی اور نااتفاقی سے فائدہ اٹھانے کی فکر میں ہر وقت لگی ہوتی ہیں۔ فی الحقیقت ان حالات میں مسلمانوں کے لیے اور بھی ضروری ہو گیا ہے کہ جمع ہوں تاکہ ہر مسلمان ملک کی طاقت سب کی طاقت بن جائے۔ یہ واحد راستہ ہے جس پر چل کر ہر مسلمان اپنی آزادی کو برقرار رکھ سکتے ہیں، دنیا کے معاملات میں صحت مندانہ اور تعمیری کردار ادا کر سکتے ہیں اور اُس نشاطِ ثانیہ سے ہمکنار ہو سکتے ہیں جس کی خواہش ہر دل میں پائی جاتی ہے۔[1]

مولانا مودودی نے برسرِ اقتدار طبقے کی غلط کاریوں پر ہمیشہ نہایت بے خوفی سے تنقید کی ہے اور اس باب میں اپنے ذاتی تحفظ اور عافیت کی کبھی پروا نہیں کی۔ مولانا کا اپنا وجود اور ان کی تحریک پوری اسلامی دنیا میں لادینیت، مادہ پرستی اور الحاد کے شدید حملوں کے مقابلے میں ایک زبردست ڈھال فراہم کرتی ہے۔ تجدد پسند شریعت (خصوصاً شخصی اور عائلی قوانین) کو بدلنے اور اُسے جدید مغرب کے نظامہائے قانون سے ہم آہنگ کرنے کی جو کوششیں کر رہے ہیں، مولانا مودودی ان ساری کوششوں کے سخت دشمن ہیں۔ بڑھتی ہوئی آبادی پر مانع حمل

---

[1] اتحادِ عالمِ اسلامی از مولانا مودودی۔

ادویات، اسقاطِ حمل اور بانجھ پن کے ذریعے قابو پانے کے لیے قومی اور بین الاقوامی طور پر جو تحریک جاری ہے، مولانا مودودی اس کے بھی شدید ترین مخالف ہیں اور اسے اسلامی تعلیمات کے صریح منافی قرار دیتے ہیں۔ ۱۹۶۲ء میں انھوں نے اسلام اور خاندانی منصوبہ بندی کے موضوع پر ایک مقالہ شائع کیا جس میں انفرادی، معاشرتی، قومی، بین الاقوامی، اقتصادی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے آبادی کو کم کرنے کے غیر فطری طریقوں کے ہولناک نتائج ناقابلِ تردید شہادتوں کے ساتھ بیان کیے۔ ۹ر اگست ۱۹۶۶ء کو ایک سرکاری فرمان کی رُو سے اس پمفلٹ اور کتاب کو خلافِ قانون قرار دے دیا جس کے ۱۹۶۳ء سے اب تک نو ایڈیشن شائع ہو چکے تھے کیونکہ حکام کو اندیشہ تھا کہ اس میں پیش کردہ پُرزور دلائل خاندانی منصوبہ بندی کے قومی پروگرام کو تلپٹ کر کے رکھ دیں گے۔ کتاب پر یہ پابندی ۱۰ر مارچ ۱۹۶۷ء تک برقرار رہی۔

مولانا مودودی گزشتہ تین عشروں سے منکرینِ حدیث، جن کے سرخیل غلام احمد پرویز ہیں اور مرزا غلام احمد قادیانی کے "مہدی" اور "نبی" ہونے کے دعووں پر قائم ہونے والی ربوہ کی قادیانی اُمت اور لاہور کی احمدیہ تحریک کی بدعات اور کافرانہ عقائد کے خلاف زبردست جنگ لڑ رہے ہیں۔ قادیانیوں کے کافرانہ عقیدے پر انھوں نے اپنے کتابچے "ختم نبوت" میں تبصرہ کیا ہے۔ اس کتاب میں دجال، حضرت مسیح علیہ السلام کی آمدِ ثانی اور امام مہدی کے موضوعات پر بھی بحث کی گئی ہے نیز اسرائیل کے توسیع پسندانہ عزائم اور عالمِ اسلام کے خلاف صہیونی سازش پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مولانا مودودی عربوں کو کئی بار متنبہ کر چکے ہیں کہ بیت المقدس صرف جہاد فی سبیل اللہ سے دوبارہ حاصل کیا جا سکتا ہے جس کی قیادت اسلامی نظام کی علمبردار ایک ایسی حکومت کے ہاتھ میں ہو جسے عوام کا مکمل اعتماد اور ان کی حمایت حاصل ہو۔ اگر عرب رہنما "رجعت پسند" اور "ترقی پسند" دھڑوں میں بٹ کر باہم دست و گریباں رہے، اتحاد کو پس پُشت ڈالے رکھا اور قوم پرستی اور سوشلزم ایسے بے معنی نعروں میں کھوئے رہے تو عوام کا مورال تباہ ہو جائے گا اور وہ اسرائیل کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کے جذبے سے عاری ہو جائیں گے۔ اگر

عرب حکمرانوں نے اپنے موجودہ طرزِ عمل کو نہ بدلا تو اسرائیل اپنی سرحدوں سے باہر پھیلنے اور قدم بقدم آگے بڑھنے کی جد و جہد میں کامیاب ہو جائے گا۔

انگلستان اور جرمنی میں مقیم مسلمان طلبہ کی انجمنیں اور جماعتیں مولانا مودودی کو متعدد مرتبہ دعوت نامے بھیج چکی تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ مولانا تشریف لائیں، اسلام کے موضوع پر لیکچر دیں اور مغربی ملکوں میں بود و باش رکھنے والے مسلمان عوام اور طلبہ کو پیش آمدہ مسائل کے حل سے آگاہ کریں، لیکن حکومت مولانا کی روز افزوں مقبولیت سے سخت خائف تھی۔ اُسے یہ ڈر بھی تھا کہ مولانا بین الاقوامی شخصیت بن جائیں گے۔ چنانچہ اُس نے انہیں باہر جانے کی اجازت نہ دی اور اس ضمن میں ان کی ہر کوشش کو ناکام کر دیا۔ مولانا کے گردوں میں پچھلے پچیس برس سے پتھری موجود تھی اور سخت تکلیف اور پریشانی کا باعث تھی۔ اگست ۱۹۶۸ء میں ایک خصوصی طبی بورڈ نے معائنہ کرنے کے بعد رائے دی کہ صورتِ حال سنگین ہے اور مولانا کو علاج کے لیے لندن جانا ضروری ہے۔ لندن میں مولانا کے دو آپریشن ہوئے۔ مولانا اگرچہ سخت کمزوری اور نقاہت محسوس کر رہے تھے، تاہم بے شمار لوگ جن میں غیر مسلم بھی تھے اور مسلمان بھی، ان سے ملنے اور گفتگو کرنے آتے۔

پاکستان روانہ ہونے سے پہلے ۱۵ دسمبر کی شام کو لندن کے ہلٹن ہوٹل میں مولانا کے اعزاز میں ایک خصوصی استقبالیہ دیا گیا جس میں انگلستان میں مقیم پاکستانی باشندوں کے ممتاز ترین نمائندوں کے علاوہ مختلف مسلمان ملکوں کے سفارتی نمائندے، انگریزی اور اُردو جرائد کے رپورٹر، مغربی افاضل اور مستشرقین بھی شریک ہوئے۔ اس موقع پر مولانا نے خطبۂ استقبالیہ کے جواب میں جو تقریر کی اس میں انگلستان میں مقیم پاکستانیوں کے مسئلے پر خاص طور پر توجہ دی۔ مولانا نے حاضرین کو یقین دلایا کہ اگر برطانیہ میں بود و باش اختیار کرنے والے مسلمان اسلامی نظریات و اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کی حتی الامکان کوشش کریں تو اسلام یورپ میں بڑی تیزی سے پھیلنے لگے گا، لیکن اگر وہ احساسِ کہتری کا شکار اور مغربی طور اطوار کی اندھا دھند نقالی کرتے رہے تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ اپنا وجود کھو دیں گے اور اجنبی تہذیب میں بالکل جذب ہو کر رہ جائیں

گے۔ مولانا نے برطانیہ میں مقیم پاکستانی مسلمانوں کے رہنماؤں کو متنبہ کیا کہ اگر مسلمان بچوں کو گھر اور اسکول میں صحیح اسلامی تعلیم نہ دی گئی تو نئی نسل مسلمان معاشرے کے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ مولانا نے "ہم رنگ ہو جانے" کے اس نعرے کا ذکر بھی کیا جس کے تحت برطانیہ مسلمانوں کو مغربی معاشرے میں جذب کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ آپ نے کہا برطانیہ کا یہ طرزِ عمل بالکل غلط ہے۔ ایک کثیر النسل (multi—racial) اور کثیر التہذیب (multi—cultural) معاشرہ، برطانیہ عظمیٰ کے لیے انتشار کی قوت بننے کے بجائے مفید ثابت ہو گا۔ ناانصافی اور داخلی کشمکش کو ختم اور مُلک کی اجتماعی زندگی کو مالا مال (enrich) کر دے گا۔

مولانا مودودی نے اٹلی اور جرمنی کی ٹیلی ویژن کمپنیوں کو بھی انٹرویو دیئے۔ انہوں نے کہا: دورِ جدید کے انسان کی سب سے بڑی اور سنگین غلطی یہ ہے کہ سائنسی ترقی کے ذریعے عناصرِ قدرت کو مسخر کرنے کے بعد وہ اس اندھے اعتقاد میں مبتلا ہو گیا ہے کہ اب اُس کو اپنی اخلاقی اور رُوحانی زندگی کے لیے پیغمبروں پر نازل شدہ وحیِ الٰہی کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ نتیجہ یہ ہے کہ مغربی قوموں کی زندگی امن و طمانیت سے یکسر محروم ہو چکی ہے۔ زندگی نے اپنے معنی اور غرض و غایت کھو دی ہے۔ خاندانی زندگی تلپٹ ہو کر رہ گئی ہے۔ جرائم کا دَور دورہ ہے۔ جگہ جگہ تشدد کا بازار اس طرح بے روک ٹوک گرم ہے کہ دنیا کا مستقبل خطرے میں پڑ گیا ہے۔ تنگ نظری اہلِ مغرب کی دوسری مہلک غلطی ہے۔ اگر مغربی تہذیب کے پاس نسلی امتیاز ایسے مسائل کا کوئی حل نہیں ہے تو لوگوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اسلام اس مسئلے کو حل کر چکا ہے اور مختلف نسلوں اور قوموں کو حقیقی معنوں میں انسانی اخوت میں منسلک کرنے کا کارنامہ کامیابی سے انجام دے چکا ہے۔ اہلِ مغرب کا فرض ہے کہ وہ اپنی محدود دنیا سے باہر نکل کر دیکھیں اور معلوم کریں کہ جہاد جنگ کی وحشت خیز تباہ کاریوں کو کس طرح ختم کرتا ہے اور خاندان اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر کس طرح مضبوط و مستحکم ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح فرد کی شخصیت تباہ ہونے سے بچ سکتی ہے جس کے نتیجے میں معاشرتی انتشار عام ہے اور ذہنی امراض وبا کی طرح پھیل چکے

ہیں۔ اسلام کی میراث صرف پیدائشی مسلمانوں کے لیے نہیں پوری نوعِ انسانی کے لیے ہے۔

دسمبر ۱۹۶۷ء کے اواخر میں مولانا مودودی پاکستان تشریف لے آئے۔ اس کے بعد ان کا زیادہ تر وقت پانچ سیاسی جماعتوں پر مشتمل تحریک جمہوریت پاکستان کے دوسرے ارکان کے ساتھ مل کر ملک کو آمریت سے نجات دلانے اور جمہوریت بحال کرنے کی جدوجہد میں گزرا۔ اس جدوجہد کا نتیجہ یہ نکلا کہ فروری ۱۹۶۹ء کے اواخر میں صدر ایوب خان گول میز کانفرنس منعقد کرنے اور ملک کی تمام بڑی بڑی جماعتوں کے رہنماؤں کے ساتھ بات چیت کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ انہوں نے ہنگامی حالات جو ستمبر ۱۹۶۵ء میں پاکستان پر بھارت کے جارحانہ حملے کے بعد نافذ کئے تھے، ختم کر دیئے۔ ڈیفینس رولز جن کے تحت مخالف سیاسی رہنماؤں کو مقدمہ چلائے بغیر غیر معین عرصے تک نظر بند رکھا جا سکتا تھا، منسوخ کر دیئے، بالغ رائے دہی کی بنیاد پر آزادانہ جمہوری انتخابات کرانے اور پارلیمانی نظام بحال کرنے کا مطالبہ تسلیم کر لیا اور اعلان کیا کہ وہ آزادانہ جمہوری انتخابات کرانے کے بعد اپنے منصب سے سبکدوش ہو جائیں گے۔ ان اقدامات سے ملک بھر میں انبساط و مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ تحریک جمہوریت پاکستان میں شامل پانچ جماعتیں ۱۹۵۶ء کا دستور بحال کرنے کا مطالبہ بھی کر رہی تھیں جو ایوب خان کے ساختہ پرداختہ دستور ۱۹۶۲ء کی بہ نسبت کہیں زیادہ اسلامی بنیادیں فراہم کرتا تھا، لیکن المیہ یہ ہوا کہ بائیں بازو کے عناصر نے بالعموم اور مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی اور مولانا بھاشانی کی چین پرست نیشنل عوامی پارٹی نے بالخصوص تشدد کا راستہ اختیار کر لیا اور گول میز کانفرنس میں طے شدہ پروگرام کو عملی جامہ پہنانے میں تعاون کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ان لوگوں نے ملک کا دورہ کیا اور اشتعال انگیز تقریریں کر کے لوگوں کو کمیونسٹ طرز کا انقلاب برپا کرنے پر اکسایا۔ طلبہ میں بے چینی اور اضطراب کی وجہ سے اسکول اور کالج گزشتہ چھ ماہ سے بند پڑے تھے، ہڑتالوں نے صنعت و حرفت کو مفلوج کر دیا تھا، ملک بھر میں، خصوصاً مشرقی پاکستان میں جلوسوں، لوٹ مار اور آتشزنی کے واقعات رونما ہو رہے تھے۔ امن و قانون کی حالت

یہاں تک ابتر ہو گئی کہ صدر ایوب خان مستعفی ہو گئے اور برّی افواج کے کمانڈر انچیف جنرل یحییٰ خان نے زمام اقتدار ہاتھ میں لے کر ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو مارشل لاء نافذ کر دیا۔ البتہ یہ مارشل لاء ایوب خان کے نافذ کردہ مارشل لاء سے مختلف تھا۔ اس مرتبہ سیاسی جماعتیں نہیں توڑی گئیں اور انہیں قانون کے دائرے میں رہ کر اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کی اجازت دے دی گئی۔ ملک میں جمہوری نظام حکومت کی بحالی کے لیے انتخابات کی تیاری کے سلسلے میں مولانا مودودی نے آٹھ نکات پر مشتمل حسب ذیل سیاسی ضابطۂ اخلاق کا اعلان کیا:

۱۔ نظریۂ پاکستان (یعنی اسلامی نظام حیات) اور ملکی سالمیت کے خلاف کوئی کام نہ کیا جائے۔

۲۔ کوئی پارٹی یا اس کا کوئی ذمہ دار شخص، معقول اعتراض و تنقید کے حدود سے تجاوز کر کے کسی دوسری پارٹی یا اس کے لیڈروں کے خلاف، اور انتخابات کے زمانے میں اس کے امیدواروں کے خلاف دشنام طرازی اور ناشائستہ پروپیگنڈا نہ کرے اور نہ ایسے الزامات لگائے جن کا ثبوت وہ نہ دے سکتا ہو۔

۳۔ ہر پارٹی کو جلسے اور جلوس اور پرامن مظاہرے کرنے کا حق ہے، لیکن کسی کو دوسروں کے جلسوں، جلوسوں اور مظاہروں کو درہم برہم کرنے یا ان میں خلل اندازی کا حق نہیں ہے۔ خاص طور پر انتخابات کے زمانے میں اگر کوئی پارٹی یہ طرز عمل اختیار کرے تو قانونِ انتخاب میں یہ تصریح ہونی چاہیئے کہ وہ انتخابات میں حصہ لینے کی مجاز نہ ہو گی۔

۴۔ کسی پارٹی کو ملک کے اندر تشدد کے ذریعے سے انقلاب لانے کی کوشش کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے یا ایسی کوئی تشدد آمیز تحریک جاری کرنے کا حق نہیں ہے جس کا مقصد جمہوری طریقوں کے بجائے جبراً ملک کے نظام میں تبدیلی لانا ہو۔ جو پارٹی اس قسم کا رویہ اختیار کرے اُسے بحیثیت ایک پارٹی کے ملک میں کام کرنے کا حق نہ

ہونا چاہیئے۔

۵۔ اگر کوئی شخص یا کوئی پارٹی یا اس کا کوئی لیڈر انتخابات کا بائیکاٹ کرنا چاہیے تو کر سکتا ہے، لیکن اگر وہ اس طرح کے اعلانات کرے کہ وہ انتخابات نہیں ہونے دے گا اور انتخابات میں حصہ لینے والوں کو زبردستی اس سے روکے گا یا پولنگ اسٹیشنوں پر انتخابات کی کارروائی نہ ہونے دے گا تو اس کو نہ صرف یہ کہ ملکی سیاست میں حصہ لینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے، بلکہ یہ باتیں از روئے قانون جرم قابلِ دست اندازی پولیس ہونی چاہیئے اور اس کی سزا مقرر ہونی چاہیئے۔

۶۔ انتخابات کا اعلان ہونے کے بعد اور دورانِ انتخابات میں حسبِ ذیل کاموں سے قطعی پرہیز کریں گی۔

الف:۔ روپے کے ذریعے یا کسی اور طرح کا لالچ دے کر ووٹ حاصل کرنا۔

ب:۔ ووٹروں پر سرکاری افسروں کے ذریعے سے دباؤ ڈال کر یا اپنے کارکنوں یا اپنے حامیوں کے ذریعے ڈرا دھمکا کر زبردستی ووٹ حاصل کرنا۔

ج:۔ برادریوں اور علاقائی، نسلی یا لسانی تعصبات کے نام پر اپیل کرنا۔

۷۔ ہر پارٹی کو اس بات کا عہد کرنا ہوگا کہ انتخابات کے ذریعے سے اگر وہ برسرِ اقتدار آئے تو وہ حسبِ ذیل چیزوں سے احتراز کرے گی:۔

الف:۔ سرکاری ملازمین اور سرکاری ذرائع اور وسائل کو پارٹی کے مفاد کے لیے استعمال کرنا۔

ب۔ ملک کے ذرائع نشر و اشاعت۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور خبر رساں ایجنسیوں کو اپنی پارٹی کے حق میں یا مخالف پارٹیوں کے خلاف پروپگنڈا کے لیے استعمال کرنا۔

ج:۔ پریس اور پلیٹ فارم کی آزادیوں پر اپنی پارٹی کے مفاد میں قدغن لگانا۔

د۔ لائسنس، پرمٹ یا کسی دوسرے مالی مفاد کے ذریعے دوسری پارٹیوں کے آدمیوں کو توڑنا یا اپنی پارٹی کی تعداد میں ان ذرائع سے اضافہ کرنا یا اپنے اثر و نفوذ کو بڑھانے کے لیے یہ ذرائع استعمال کرنا۔

۸۔ کسی ایسی پارٹی کو انتخابات میں حصہ لینے کا حق نہ ہوگا جو پاکستان کی اسلامی بنیاد کو منہدم کرنا چاہتی ہو یا پاکستان میں جمہوری نظام کے خلاف کوئی اور نظام لانا چاہتی ہو یا پاکستان کی وحدت و سالمیت کی مخالف ہو۔[1]

پاکستان میں اس وقت اسلام اور کمیونزم کے درمیان زندگی اور موت کی کشمکش جاری ہے۔ خدانخواستہ یہاں کمیونسٹ حکومت کا تختہ الٹنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جیسا کہ اب وہ عالم عرب پر مسلط ہو چکے ہیں، تو ملک اپنا آزادانہ وجود برقرار نہیں رکھ سکے گا بلکہ روس، چین اور بھارت میں لازماً تقسیم ہو کر رہ جائے گا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کمیونسٹ پاکستان کے کٹر دشمن ہیں۔ اس کا نمایاں ثبوت اس کھلے خط سے ملتا ہے جو سر سکندر حیات کے نواسے طارق علی نے پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کے نام تحریر کیا اور جو لندن یونیورسٹی کی پاکستان سوسائٹی کے نقیب و ترجمان ہیں۔ پاکستان لیفٹ ریویو (Pakistan Left Review) میں ۱۹۷۰ء کے شمارہ خزاں میں شائع ہوا۔ اس خط میں طارق علی نے لکھا:۔

"یہ ایک بے لاگ خط ہے۔ اسے اپنی ذات پر حملہ نہ سمجھیے گا۔ آپ نے ایک نئی سیاسی جماعت بنائی ہے اور اسے سوشلزم کے لیے وقف کرنے کا اعلان کیا ہے۔ بنابریں ہم آپ سے مندرجہ ذیل سوالات کا جواب چاہتے ہیں۔ آپ نے نئی جماعت کی تشکیل کیوں ضروری سمجھی جب کہ نیشنل عوامی پارٹی پہلے ہی سے موجود ہے؟ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ نیشنل عوامی پارٹی لوگوں کو احمق بنانے اور دھوکا

---

[1] پاکستان ٹائمز ۱۵ جون ۱۹۶۹ء۔ ہفت روزہ آئین ۱۲ جون ۱۹۶۹ء

دینے کے لیے اسلام کا نعرہ نہیں لگاتی ۔ سوشلسٹ ہونے کی حیثیت سے ہم ملحد ہیں ۔ سوشلسٹ ہونے کی حیثیت سے ہم نہ تو کسی مافوق الفطرت "ہستی" پر یقین و اعتقاد رکھ سکتے ہیں اور نہ اُسے کسی صورت حقیقی کمیونسٹ انقلاب کا بدل قرار دے سکتے ہیں ۔ لہٰذا یہ کہنا کہ پاکستان کی بنیادیں اسلامی اصولوں پر مبنی نظریے پر استوار کی گئی ہیں ہمارے نزدیک محض ایک بار فریب ہے ۔ مذہب ہمارے عوام کو مدتِ دراز سے گمراہ کر رہا ہے ۔ سوشلسٹ ہونے کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس جھوٹے عمل کا تیا پانچہ کر دیں ۔"

مولانا مودودی اس چیلنج کا سامنا کرنے کا مصمم ارادہ کر چکے ہیں ؛ چنانچہ انہوں نے اس حقیقت کو واشگاف انداز میں واضح کر دیا ہے کہ اسلام اور سوشلزم متضاد نظریے ہیں ۔ اس موضوع پر مولانا مودودی کی اہم ترین تحریر وہ ہے جس میں انہوں نے ہفت روزہ "چٹان" لاہور کے مدیر شورش کاشمیری کے ۱۲ سوالات کا جواب دیا ہے اور جو چٹان کے ۱۴ اپریل ۱۹۶۹ء کے شمارے میں شائع ہوئی ۔ یہ تحریر اتنی زبردست تھی کہ چٹان کا پرچہ چھپنے کے بعد تین گھنٹے کے اندر اندر ختم ہو گیا ۔ انہوں نے لکھا :-

"اسلام اور سوشلزم دو قطعی متضاد نظریے ہیں ۔ اسلام کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ ہم ایک خدا کے بندے ہیں ۔ اس خدا نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اپنی کتاب کے ذریعے سے ہمیں زندگی کے ہر پہلو میں جو ہدایات دی ہیں اُن کے برحق ہونے پر ہمارا ایمان ہے اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا کام انہی ہدایات کی پیروی کرنا ہے ۔ ہمارے لیے یہ دنیا کی زندگی ، اصل زندگی نہیں ہے بلکہ ہماری زندگی کا حقیقی مقصد آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہے اور یہ رضا ہمیں اُسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جب کہ ہم اس دنیا میں اللہ اور اُس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہدایات کی پیروی کریں ۔ اس عقیدے

پر اسلام ایک پورا نظامِ اخلاق ہمیں دیتا ہے اور ایک پورا نظامِ عبادات دیتا ہے تاکہ ہماری زندگی عملاً اس عقیدے کے ساتھ عمر بھر وابستہ رہے ۔ اس کے ساتھ اسلام ہم کو زندگی کے تمام پہلوؤں میں ایک ہمہ گیر قانون اور ضابطہ دیتا ہے جس کا دائرہ گھر اور خاندان کی زندگی سے لے کر درس گاہ اور عدالت ، پارلیمنٹ اور مارکیٹ اور بین الاقوامی تعلقات ، ہر چیز پر وسیع ہے ۔

اس کے برعکس سوشلزم کا آغاز ہی اس تصور سے ہوتا ہے کہ ہمیں کسی خدا اور کسی رسول کی رہنمائی کی حاجت نہیں ہے ، بلکہ ہم خود اپنی زندگی کے معاملات کو طے کرنے کے لیے اپنی صوابدید کے مطابق ایک فلسفۂ حیات تصنیف کرنے کا اختیار رکھتے ہیں ۔ اس بنیادی تصور کی بنا پر سوشلزم اپنا ایک فلسفۂ تاریخ تصنیف کرتا ہے ۔ ایک فلسفۂ معیشت اختیار کرتا ہے اور اُس فلسفۂ معیشت کو نافذ کرنے کے لیے جس تدبیر سے بھی کام لیا جا سکے لینا چاہیے ، خواہ وہ جھوٹ ہو یا بدعہدی ہو یا قتل و غارت اور خونریزی ۔ پھر اسلام جو اجتماعی نظام تجویز کرتا ہے ، سوشلزم کا تجویز کردہ اجتماعی نظام اس کی بالکل ضد ہے ۔ اسلام کا اجتماعی نظام ایک طرف فرد کی آزادی کو بنیادی اہمیت دیتا ہے ، لیکن اُسے ایسے حدود کا پابند بناتا ہے جن سے وہ جماعت کے لیے نقصان دہ ہونے کے بجائے مفید بن سکے ۔ دوسری طرف وہ اتنی ہی بنیادی اہمیت ایک صالح معاشرہ کے وجود کو دیتا ہے جس کے اندر انفرادی انسانی فضائل کے نشوونما کا پورا موقع ہو ، افراد اور طبقوں اور گروہوں کے درمیان کشمکش اور منافرت کے بجائے باہمی تعاون ، ہمدردی اور احسان کی روح کارفرما ہو اور پورا معاشرتی نظام برائیوں کو دبانے اور نیکیوں کو فروغ دینے والا ہو ۔ سوشلزم کے نزدیک وسائل معیشت کے معاملے میں انسانی ملکیت اور انسان کے تصرف کی آزادی

ہی تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ اس لیے وہ ایک ایسا اجتماعی نظام تجویز کرتا ہے جس میں تمام وسائلِ معیشت اجتماعی ملکیت میں لے لیے جائیں اور افراد کو اجتماعی مشین میں کَس کر رکھ دیا جاتے۔ لیکن یہ ایک عجیب تضادِ خیالی ہے کہ جو نظریہ معاشرے کے افراد کو ناقابلِ اعتماد قرار دے کر تصنیف کیا گیا ہے، وہ یہ فرض کر لیتا ہے کہ جب اجتماعی مشین کو مرکز میں چند افراد چلائیں گے تو وہ تمام عیوب سے منزہ اور سبّوح و قدوس انسان ہوں گے۔ ان کے انتظام اور قبضہ و تصرف میں پورے ملک کے وسائلِ معیشت صحیح طور پر استعمال ہوں گے اور دولت کی تقسیم بھی منصفانہ ہوگی۔

کمیونزم کے فلسفے کا آغاز ہی جانب داری کے تصور سے ہوتا ہے یعنی پرولتاریہ کی حمایت اور اس کے ماسوا تمام دوسرے افراد اور گروہوں سے شدید نفرت اور اُن کے خلاف جنگ کا جذبہ۔ اس صورت میں آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ ایک پورے معاشرے کے درمیان منصفانہ تقسیم کا تصور کیسے کیا جا سکتا ہے؟ اس کے بعد آپ نگاہ ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ محدود سے محدود تر انسانی گروہ جس کے ہاتھ میں آخرکار نظامِ تقسیم پر عملدرآمد کے اختیارات مرکوز ہوتے ہیں وہ عملاً اُس مقام پر آجاتا ہے جو بادشاہی نظام میں کسی بادشاہ اور سرمایہ دارانہ نظام میں کسی سرمایہ دار اور جاگیردارانہ نظام میں کسی جاگیردار کی جبّاریت سے بدرجہا زیادہ سخت جبّار کا مقام ہے، کیونکہ یہاں پوری مملکت کے تمام ذرائع پیداوار اُن کے قبضے میں ہوتے ہیں اور انہی کے ہاتھ میں پوری سیاسی طاقت بھی ہوتی ہے۔ اس کے بعد اگر وہ لوگوں کے لیے زندگی بسر کرنے کی ضروریات فراہم کرنے کی ذمہ داری لیتے ہیں تو اُن میں اور اس جیلر کی حیثیت میں کوئی خاص فرق نہیں رہتا جو قیدیوں کو روٹی، کپڑا، مکان اور علاج فراہم کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

صنعتوں کو قومی ملکیت میں لینے سے نہ صرف یہ کہ ہمارے اقتصادی امراض کا علاج نہ ہوگا بلکہ اس سے ایک اور مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوگا۔ ہماری پوری معیشت پر بیوروکریسی کا قبضہ ہو جاتے گا اور اس سے جو خرابیاں پیدا ہوں گی وہ موجودہ نظام سے پیدا ہونے والی خرابیوں سے ہزار گنا بڑی ہوں گی۔ برطانوی عہدِ حکومت اور پھر آزادی کے بعد گزشتہ دو عشروں میں بیوروکریسی کے جو کرتوت ہم نے دیکھے ہیں اُن کے نتیجے میں پوری قوم احتجاج پر مجبور ہوگئی، حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ یہاں بیوروکریسی کی طاقت نسبتاً محدود تھی۔ پھر اگر سیاسی اقتدار کے ساتھ ساتھ صنعت، تجارت اور زراعت کے تمام ذرائع کا کنٹرول بھی بیوروکریسی ہی کے ہاتھ میں آجاتے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُس کے ظلم و استبداد اور عوام کی کس مپرسی اور بیچارگی کا کیا عالم ہوگا۔

سرمایہ و محنت کی بنیاد پر طبقاتی امتیازات سے مراد اگر مستقل قسم کی ذات پات کا نظام ہے جیسا کہ ہندوستان میں پایا جاتا ہے، جس کو ہندو مذہب جائز قرار دیتا ہے اور جسے قانون اور حکومت کی مشینری کے تعاون سے محفوظ رکھا گیا ہے، تو اسلام میں اس کا کوئی جواز نہیں ہے۔ مسلمانوں میں جب کبھی اسلامی اصولوں سے ہٹ کر کوئی طبقاتی نظام پیدا ہوتا تو ضرور اُس نے بُرے نتائج دکھائے، لیکن اگر اُن بُرے نتائج سے ہم یہ نتیجہ اخذ کریں کہ زبردستی ایک بے طبقہ سوسائٹی اُس نمونے پر پیدا کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے جسے سوشلزم نے اپنا آئیڈیل قرار دیا ہے اور جسے وہ فی الواقع پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہے تو یہ ہماری دوسری غلطی اور پہلی غلطی سے بھی بدتر غلطی ہوگی۔ چونکہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے خوبصورتی، ذہانت اور صلاحیتوں سے یکساں طور پر نہیں نوازا ہے اس لیے ان کی جدّوجہد کے حاصل میں اختلاف اور تفاوت کا ہونا ناگزیر ہے۔ سوشلزم کا دعویٰ

پہلے یہ نہیں تھا کہ دولت کی منصفانہ تقسیم ہو بلکہ وہ یہ دعویٰ لے کر اُٹھا تھا کہ دولت کی مساویانہ تقسیم ہو، لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکا اور اُس کو اپنا نظریہ تبدیل کرنا پڑا۔ اس کے بعد اُس نے دولت کی تقسیم کی جو دوسری صورت اختیار کی وہ منصفانہ تقسیم کی تعریف میں سرے سے آتی ہی نہیں بلکہ اُس کے اُوپر اگر کوئی صحیح لفظ منطبق ہوتا ہے تو وہ جابرانہ تقسیم کا لفظ ہے۔

اسلام کہتا ہے کہ حلال طریقوں سے جو دولت بھی انسان کو حاصل ہو وہ اللہ کا فضل ہے اور اللہ جس پر جتنا چاہے فضل کرے اور حرام طریقوں سے جو مال حاصل کیا جائے اُس کا حصول جُرم ہے اور اس جُرم کی سزا نوعیتِ جُرم کے لحاظ سے اسلام میں تجویز کر دی گئی ہے۔ ناجائز ملکیت خواہ چھوٹی سے چھوٹی ہو بہرحال ناجائز ہے اور جائز ملکیت خواہ بڑی سے بڑی ہو بہرحال جائز ہے قطع نظر اس سے کہ ملکیت چھوٹی ہو یا بڑی تصرف کے تمام غلط طریقوں کو اسلام نے ناجائز قرار دیا ہے اور اس کی مختلف صورتوں کے لیے مختلف سزائیں تجویز کی ہیں۔ رہے صحیح طریقے تو ان میں سے بعض کو لازم کر دیا ہے جیسے زکوٰۃ اور بعض کے لیے ترغیب دی ہے تاکہ فرد خود اپنی رضاکارانہ نیکی کے ذریعے سے اپنے اخلاقی و رُوحانی ارتقاء کا بھی سامان کرے اور معاشرے میں بھی کشمکش اور نفرت کے بجائے جو سوشلزم کی جبلت میں ہے آپس کی محبت اور خیرخواہی پیدا ہو۔ ٹیکس اس طرح عائد کیا جانا چاہیئے کہ جس کے پاس جتنی زیادہ دولت ہو وہ معاشرے کی بھلائی کے لیے اتنا ہی زیادہ حصہ ادا کرے مگر اس میں اس بات کو ملحوظ رکھنا ہوگا کہ آدمی کے لیے جائز طریقوں سے حلال دولت کمانے کا محرک (incentive) بالکل ختم ہو کر نہ رہ جائے۔ بجائے اس کے کہ صنعت، تجارت اور دوسرے وسائل ثروت کو ضبط کر کے قومی ملکیت

بنا لیا جائے اور اس طرح چھوٹی بیماری کا علاج ایک بہت بڑی بیماری سے کیا جائے، ہم آئندہ کے لیے ان تمام حرام طریقوں کو قانوناً ممنوع کر دیں گے جن سے دولت کا ارتکاز پیدا ہوتا ہے اور پہلے جو ارتکاز واقع ہو چکا ہے اس کو مختلف قوانین کے ذریعے باقاعدہ توڑ دیں گے اور عوام کے تمام طبقات کو زندگی کی کم سے کم ضروریات خوراک، کپڑا، مکان، تعلیم اور علاج کی ضمانت دیں گے۔

پاکستان میں اس وقت جو نظریاتی انتشار پایا جاتا ہے اُس کے ذمہ دار سوشلسٹ ہیں جنہوں نے ایک ایسے مادّی فلسفے کو بطیبِ خاطر قبول کر لیا ہے جو اسلام کی تعلیمات اور اُس کے تقاضوں کا صریح مخالف ہے۔ یہ لوگ عوام کو دھوکا دینے اور اپنے پروگرام کو ان کی نظر میں خوش کُن بنانے کے لیے ان سادہ لوحوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ غیر اسلامی باتیں اسلامی ہیں۔ "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح ظاہر کرتی ہے کہ یہ سوشلزم کے مختلف مسالک (school of thought) ہی میں سے کوئی ایک مسلک ہے یا بالفاظِ دیگر اسلام کا کوئی نیا ایڈیشن ہے جو کچھ چیزیں اسلام کی اور کچھ چیزیں سوشلزم سے لے کر اسلام کے نقص اور خامیوں کو دُور کرنے کے لیے تیار کیا گیا ہے۔" اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح اسلام اور اُس کے مقتضیات کی نفی اور تذلیل پر مبنی ہے اور بجائے خود ایک متناقض اصطلاح ہے۔"

دمشق (شام) کے عربی ماہنامہ "الاخوان المسلمون" کے نامہ نگار نے مولانا مودودی کا انٹرویو لیا تھا۔ نامہ نگار نے مولانا سے سوال کیا: آپ کمیونزم کی مخالفت کیوں کرتے ہیں۔ مولانا نے فرمایا:-

"ہم کمیونزم کی مخالفت محض اس لیے نہیں کرتے کہ وہ خدا کی حاکمیت اور فلسفۂ اخلاق کا صریح منکر اور الحاد و مادہ پرستی کا پُرجوش مبلّغ اور اسے بزور

شمشیر پھیلانے کا قائل ہے بلکہ مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کمیونسٹ نظام کا قیام اور ظلم و ستم، جبر و تشدد، تعذیب و عقوبت اور خوف و دہشت کا دور دورہ آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ اس نظام کو دوام بخشنے کے لیے استبداد کو جائز قرار دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ ہم کمیونزم کی مخالفت اس لیے بھی کرتے ہیں کہ وہ آزادیٔ تنقید اور امن کیش حزب اختلاف کو برداشت نہیں کرتا، نہ وہ خرابیوں کی اصلاح یا دستوری طریقوں سے حکومت بدلنے کا موقع دیتا ہے۔ چونکہ ہمارے نزدیک مذہبی نقطۂ نظر سے ـــــ بشرطیکہ آپ مذہب کو اس کے وسیع مفہوم میں لیں ـــــ یہ امور نہایت ضروری ہیں اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ ہم کمیونزم کی مخالفت خالص مذہبی بنیادوں پر کرتے ہیں۔

ہم مغربی بلاک اور اُس کی سامراجی پالیسیوں کے بھی اتنے ہی مخالف ہیں جتنے کہ کمیونزم کے مخالف ہیں۔ ہمارے بارے میں یہ خیال سراسر غلط ہوگا کہ چونکہ ہم کمیونزم کی مخالفت کرتے ہیں اس لیے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم مغربی سامراجیوں کے حامی ہیں۔ ہم دونوں کے مخالف ہیں اور اگر کوئی شخص بیک وقت ایسے دو گروہوں کا مخالف ہے جو خود ایک دوسرے کے مخالف ہیں تو اس بنیاد پر یہ کہنا غلط ہوگا کہ چونکہ وہ ایک گروہ سے لڑ رہا ہے اس لیے لازماً دوسرے گروہ کا حامی ہے۔ ان خطوط پر سوچنا درست نہیں ہے[1]

لندن کے زمانۂ قیام میں برطانیہ کے مسلمان طلبہ کی سوسائٹی کے عربی ماہنامہ "الغرباء" کے

---

[1] The Criterion : Journal of The Islamic Research Academy, Karachi. January—February, 1969, p. 28

مدیر نے مولانا سے انٹرویو لیا۔ انہوں نے سوال کیا: "دنیا کے مختلف حصوں میں اس وقت جو اسلامی تحریکیں سرگرم عمل ہیں، ان کے لیے آپ کون سا طریق کار تجویز کرتے ہیں۔ مولانا نے جواب دیا:۔

"میرے خیال میں یہ اسلامی تحریک کے رہنماؤں اور کارکنوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے اپنے ملک کے استبداد کی ماہیت اور نوعیت کا ٹھیک ٹھیک اور دانش مندی سے تعین کریں۔ پھر اس ماہیت اور نوعیت کو سامنے رکھتے ہوئے اس استبداد کے خلاف جدوجہد کے مناسب راستے اور ذرائع اور اسلامی نصب العین کی طرف پیش قدمی کے مواقع تلاش کریں۔ مختلف مسلمان ملکوں میں استبداد کا مزاج اور پھیلاؤ اس قدر مختلف ہے کہ سب کے لیے کوئی ایک طریق کار تجویز کرنا ناممکن ہے، لیکن ان تمام حالات میں ایک بات میرے نزدیک نہایت ضروری ہے۔ وہ یہ کہ اسلامی تحریک کے رہنما اور کارکن خفیہ زیرِ زمین تحریکوں یا خونی انقلابات کے طور طریقے، چاہے وہ کتنے ہی مرغوب اور خوش کن کیوں نہ ہوں، اختیار کرنے سے مجتنب رہیں اور اس سلسلے میں ہر ترغیب اور تشویش کی مزاحمت کریں۔ اللہ کی راہ میں علانیہ اور پُرامن طریقے سے کام کرنے کی تیاری کریں، اگرچہ اس طرح انہیں شدید خطرات اور ناگفتہ مصائب حتیٰ کہ قید و بند اور پھانسیوں ہی سے دوچار کیوں نہ ہونا پڑے[1]۔"

برطانیہ اور آئرلینڈ کے مسلمان طلبہ کی انجمنوں کے وفاق کے ترجمان "دی مسلم" کے مدیر نے مولانا سے دریافت کیا: "اسلامی تحریکوں کے کارکن جو جدوجہد کر رہے ہیں، چونکہ اس میں انہیں ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی اور بدی کی طاقتیں بدستور غالب ہیں اس لیے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ

---

[1] The Criterion, March—April 1969, p..56.

دل شکستہ اور مایوس ہو جائیں؟" مولانا نے فرمایا:-

اگر اسلام کی راہ میں جدوجہد کرنے والوں پر مایوسی اور افسردگی طاری ہوتی ہے تو اس کا صرف ایک سبب ہو سکتا ہے۔ جدوجہد شروع کرتے وقت ہی وہ یہ توقع باندھ لیں کہ ان کی کوششیں ان کی زندگی ہی میں مطلوبہ پھل لے آئیں گی۔ ہمیں یہ تو امید رکھنی چاہیئے کہ جن حالات میں ہم اس وقت محصور ہیں وہ ہمارے حق میں تبدیل ہوں گے، لیکن یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ سچے مسلمان کی جدوجہد کا محرک صرف ایک خیال ہوتا ہے اور وہ ہے رضائے الٰہی کا حصول۔ ہماری نگاہیں صرف آخرت کے انعام پر مرکوز رہنی چاہئیں۔ اس دنیا میں جو بھی نتائج بھی رونما ہوں ان کی نوعیت محض ضمنی نتائج کی ہے۔ ہمارا حقیقی مقصد اپنے خالق کی مرضی کو پورا کرنا ہے۔ جو لوگ اپنی کوششوں کے نتائج فوری طور پر دیکھنے کے آرزومند ہیں انہیں بدر و احد کی لڑائیوں میں شہید ہونیوالوں کی مثالیں اپنے سامنے رکھنی چاہئیں۔ ان حضرات نے دعوتِ اسلامی کی تکمیل کی خاطر اپنا خون بہایا، لیکن کیا انہیں اپنی قربانیوں کا کوئی دنیاوی پھل ملا؟ انہوں نے صرف ان نتائج کو اپنے سامنے رکھا جو اس دنیا میں نہیں آخرت میں رونما ہونے والے تھے۔ اگر وہ اسلامی تحریک کی آبیاری اپنے خون سے نہ کرتے اور اگر وہ قربانیاں نہ دیتے تو آنے والی نسلیں ان تبدیلیوں کو نہ دیکھ پاتیں جنہوں نے تاریخ کا دھارا ہی بدل ڈالا، لیکن انہوں نے ان نتائج کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے کبھی جدوجہد نہ کی۔ وہ اپنی کوششوں کا پھل دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہے۔ ان کا حقیقی مدعا اس فرض کی ادائیگی تھا جو اللہ نے ان پر عائد کیا تھا۔ اسلام کا کام کرنے والوں کو یہی طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیئے۔[1]

---

[1] "Maudoodi Answers Questions", *The Muslim*, London, March 1969, p. 126.

اسی طرح اخوان کے عربی مجلہ "الاخوان المسلمون" کے مدیر نے دریافت کیا: مختلف مسلمان ملکوں میں بڑی طاقتوں کے اشارے پر اسلامی تحریکات کو کچلنے کی جو کوششیں حال ہی میں کی گئی ہیں، کیا اُن سے اسلامی تحریکوں کے ارکان اپنے کام کے سلسلے میں پست ہمت نہ ہو جائیں گے؟

مولانا نے جواب دیا:-

"جو لوگ فی الحقیقت اسلام سے محبت کرتے ہیں، جن کا ذہن مطمئن ہے کہ حق ہے تو یہی اور جو اس پر ایمانِ کامل رکھتے ہیں وہ موجودہ صورتِ حال میں نہ تو پست ہمت ہو سکتے ہیں نہ مایوسی کے آگے سر ڈال سکتے ہیں۔ ایسے لوگ آخر دم تک اسلام کی سربلندی کے لیے جدوجہد کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں خواہ یہ جدوجہد اس دنیا میں کامیاب ہوتی ہے یا ناکام۔ اگر وہ لوگ اِس دنیا میں بظاہر ناکام بھی رہتے ہیں تب بھی اسے اپنی ناکامی نہیں سمجھتے، کیونکہ اُن کا ایمان ہے کہ حقیقی کامیابی آخرت کی کامیابی ہے اور آخرت کی کامیابی ہی ان کی جدوجہد کا حقیقی مقصد ہوتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے وہ شخص ناکام نہیں ہوتا جو پورے خلوص اور فرض شناسی کے ساتھ جدوجہد کرتا ہے۔ حقیقی ناکامی اور ذلت و پستی سے ہمکنار تو وہ لوگ ہوتے ہیں جن کا دعویٰ تو یہ ہے کہ وہ مسلمان ہیں، لیکن اسلامی نظام قائم کرنے والوں کی جدوجہد کے راستے روڑے اٹکاتے اور انہیں شکست سے دوچار کرنے کے لیے اپنی سی ہر کوشش کر گزرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا تعالیٰ کی سزا کے مستحق ہیں۔ اِس دنیا میں بھی اور اُس دنیا میں بھی۔ اس سزا میں تاخیر تو ہو سکتی ہے، لیکن جب ان پر اللہ کا غضب ٹوٹے گا تو ساری دنیا کے لیے درسِ عبرت ہو گا۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ جس طرح کل سورج طلوع ہونے والا ہے اسی طرح اسلام کی طاقتیں بھی آخرکار فتح یاب ہوں گی۔ انشاء اللہ۔"

آج دنیا میں مسلمان جس پس ماندگی سے دوچار ہیں اس کا سبب کیا ہے؟ جمعیۃ طلبہ کے

اجلاس کراچی میں ۱۰ دسمبر ۱۹۶۶ء کو تقریر کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا:

"مسلمان ممالک میں ترقی کی رفتار جس افسوس ناک حد تک سست ہے اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے حکمران اجنبی اقدار و نظریات کو مسلمان عوام پر مسلط کرنے کی جو کوشش کر رہے ہیں اور اُس کے نتیجے میں جو مسلسل آویزش جاری ہے اس کی کتنی بھاری قیمت مسلمانوں کو ادا کرنا پڑ رہی ہے۔ ساری دنیا میں ایک مسلمان ملک بھی ایسا نہیں جس نے کسی ایک شعبے ہی میں کوئی نمایاں ترقی کی ہو۔ مثلاً ترکی کو لیجیے۔ وہ ۱۹۲۴ء سے ایک آزاد مملکت چلا آتا ہے، لیکن کیا وہ صنعت و تجارت میں کسی بڑی ترقی کا دعویٰ کر سکتا ہے؟ اسی مدت میں جاپان اور چین نے عملاً تمام میدانوں میں نمایاں ترقی کی اور اب وہ دنیا کی سب سے ترقی یافتہ قوموں کی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ ترکی نے کیوں ترقی نہیں کی؟ اس کا سبب وہ آویزش ہے جو ترکی کے حکمرانوں نے چھیڑ رکھی ہے۔ برسرِ اقتدار طبقہ ملک پر مغربی تہذیب کو مسلط کرنے کی سر توڑ کوشش کرتا رہا ہے جب کہ عوام اسلامی نظام چاہتے ہیں۔ یہی داستان کم و بیش ہر مسلمان ملک میں دہرائی جا رہی ہے۔ کوئی قوم ترقی کی راہ پر اُسی وقت گامزن ہو سکتی ہے جب کہ عوام کی اُمنگوں اور اُن کی حکومت کی پالیسیوں کے درمیان مکمل ہم آہنگی ہو۔ تمام مسلمان ممالک جس آویزش سے دوچار ہیں وہ یہ ہے کہ حکمران مسلمان عوام کو جس طرف لیجانے کے خواہش مند ہیں مسلمان عوام اُس طرف جانے کے لیے تیار نہیں۔ ادھر مسلمان عوام جس طرف جانا چاہتے ہیں ان کے حکمران انہیں اس طرف لے جانے کے لیے آمادہ نہیں۔ اس صورتِ حال نے عالم اسلام کو ایک مسلسل داخلی آویزش میں مبتلا کر دیا ہے۔

اور یہ ہے آج کا اسلام[۱]"

[۱] *Islam Today*, **Students Publications Bureau, Karachi,** ***1968. pp. 57—58.***

مولانا مودودی نے دعوتِ اسلامی کے سلسلے میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ کیفیت اور کمیت دونوں اعتبار سے گراں بہا ہیں۔ اس باب میں وہ اپنے بہت سے پیشروؤں سے سبقت لے گئے ہیں۔ انہیں نہ صرف علوم اسلامی پر مکمل عبور حاصل ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ جدید دنیوی علوم پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ اگرچہ اُن کا علم بڑی حد تک خود آموزی کا رہینِ منت ہے، تاہم اُن کا تجربہ بے پایاں ہے۔ وہ مذہب، فلسفہ، فنون و علوم، سیاسیات اور اقتصادیات پر یکساں ہمہ گیری سے لکھ اور بول سکتے ہیں۔ اسلامی نظام کو دوسرے نظامہائے زندگی پر جو تفوق اور برتری حاصل ہے مخالفین اسلام نے اسے ختم کرنے اور اس سلسلے میں لوگوں کے ذہنوں میں شکوک پیدا کرنے کی زبردست کوشش کی ہے۔ مولانا نے اپنے بے پایاں علم سے بڑے مؤثر انداز میں ان شکوک و شبہات کو رفع کیا ہے۔ انہوں نے اسلام کے مختلف پہلوؤں کی صحیح تصویر کشی کی ہے۔ خصوصاً جدید مادہ پرستانہ نظریات کی بے مائیگی کو ایک سو سے زیادہ چھوٹی بڑی کتابوں میں بالتفصیل پیش کیا ہے۔ یہ کتابیں اپنے اسلوب اور استدلال کی بنا پر جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے اپنے اندر بڑی کشش رکھتی ہیں۔ مولانا کے کردار کا ایک پہلو یہ ہے کہ اپنی ان کتابوں میں انہوں نے دوسروں کو جو کچھ تلقین کی ہے پہلے خود اس پر عمل کر دکھایا۔ قول و عمل کی اس ہم آہنگی پر ان کا بے داغ عوامی اور نجی کردار شاہد ہے۔ ماضی اور حال کے تمام دوسرے حقیقی خادمانِ اسلام کی طرح مولانا مودودی نے بھی اپنی زندگی اسلام کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ وہ بے عیب اخلاقی کردار کے مالک ہیں، نہایت نڈر، بے غرض، فروتن، بے ادعا، شفیق اور بامروّت ہیں۔ خوشامد سے نفرت کرتے ہیں، شان و شوکت، دولت مندی اور عیش و عشرت سے مجتنب رہتے ہیں۔ گھر میں خود بھی سادگی سے رہتے ہیں اور اپنے اہل بیت کو بھی سادہ رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ مولانا مودودی نہ صرف خود پابندِ شریعت مسلمان ہیں، بلکہ انہوں نے اپنی اہلیہ، چھ صاحبزادوں اور تین صاحبزادیوں کو بھی متاثر کیا ہے۔ ان کی اہلیہ ایک طویل عرصے تک مغربی پاکستان کے حلقۂ خواتین کی رہنما رہ چکی ہیں۔ وہ بڑی ہی اچھی گرہستن

اور ساں ہیں۔ فراغت کا اکثر حصہ قرآن و حدیث کے مطالعہ میں صرف کرتی اور جماعت کی بکثرت سے متاثر خواتین کو درس دیتی ہیں جو ہفتے میں ایک بار ان کے ہاں جمع ہوتی ہیں۔ مولانا کے سب سے بڑے صاحبزادے عمر فاروق "ترجمان القرآن" کے انتظام اور نشر و اشاعت میں مدد دیتے اور اس کے ساتھ ساتھ دوسرے کاموں میں اپنے والد بزرگوار کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ تمام دوسرے صاحبزادے بھی اپنے والدین کے اطاعت گزار، ان کی مساعی میں معاون، اپنے مذہب کے پابند، ذہین اور اسلامی و جدید علوم میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ مولانا مودودی روزانہ عصر کے بعد اپنے گھر کے لان میں بیٹھتے ہیں جہاں زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے مختلف عمر کے نوجوان اور بوڑھے ملاقات کے لیے آتے ہیں۔ اس نشست میں ہر شخص اسلام، قومی و بین الاقوامی معاملات کے بارے میں جو پوچھنا چاہے پوچھ سکتا ہے۔ جب میں ان کے ہاں مقیم تھی ان کے ایک بچے نے ان اصحاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا "یہ میرے ابا جان کا گھرانا ہے"۔ مولانا مودودی اپنا خاصا وقت ان خطوط کا جواب دینے میں صرف کرتے ہیں جو دنیا کے ہر حصے سے مسلمان اور غیر مسلم اسلام کے بارے میں علم حاصل کرنے کے لیے ان کے نام بھیجتے ہیں۔

تحریر و تصنیف، تبلیغ و تلقین اور عمل کے میدان میں جس قدر مؤثر کام مولانا مودودی نے کیا ہے ماضی یا حال میں احیائے اسلام کی جدوجہد کرنے والے بہت کم اصحاب کر پائے ہیں۔

> مجدد نبی نہیں ہوتا، مگر اپنے مزاج میں مزاجِ نبوت سے بہت قریب ہوتا ہے۔ نہایت صاف دماغ، حقیقت رس نظر، ہر قسم کی کجی سے پاک، بالکل سیدھا ذہن، افراط و تفریط سے بچ کر توسط و اعتدال کی سیدھی راہ دیکھنے اور اس پر توازن قائم رکھنے کی خاص قابلیت، اپنے ماحول اور صدیوں کے جمے اور رچے ہوئے تعصبات سے آزاد ہو کر سوچنے کی قوت، زمانہ کی بگڑی ہوئی رفتار سے لڑنے کی طاقت و جرأت، قیادت و رہنمائی کی پیدائشی صلاحیت، اجتہاد اور تعمیر نو کی غیر معمولی اہلیت اور ان سب باتوں کے ساتھ اسلام میں مکمل شرح صدر، نقطۂ نظر اور فہم و شعور میں پورا مسلمان ہونا، باریک سے باریک جزئیات تک میں اسلام اور جاہلیت میں تمیز کرنا اور مدت ہائے دراز کی الجھنوں میں سے امرِ حق کو ڈھونڈ کر الگ نکال لینا۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جن کے بغیر کوئی مجدد نہیں ہو سکتا اور یہی وہ چیزیں ہیں جو اس سے بہت زیادہ بڑے پیمانے پر نبی میں ہوتی ہیں۔ لیکن وہ بنیادی چیز جو مجدد کو نبی سے جدا کرتی ہے، یہ ہے کہ نبی اپنے منصب پر امرِ تشریعی سے مامور ہوتا ہے۔ اس کو اپنی ماموریت کا علم ہوتا ہے۔ اس کے پاس وحی آتی ہے، وہ اپنی نبوت کے دعوے سے اپنے کام کا آغاز کرتا ہے۔ اسے لوگوں کو اپنی طرف دعوت دینی پڑتی ہے اور اس کی دعوت کو قبول کرنے یا نہ کرنے پر لوگوں کے کافر یا مومن ہونے کا مدار ہوتا ہے۔ برعکس ان کے مجدد کو ان میں سے کوئی حیثیت بھی حاصل نہیں۔ وہ اگر مامور ہوتا ہے تو امرِ تکوینی سے ہوا کرتا ہے نہ کہ امرِ تشریعی سے۔ بسا اوقات اُسے خود اپنے مجدد ہونے کی خبر نہیں ہوتی بلکہ اُس کے مرنے کے بعد اس کی زندگی کے کارنامے سے لوگوں کو اس کے مجدد ہونے کا علم ہوتا ہے۔ وہ کسی دعوے سے اپنے کام کا آغاز نہیں کرتا، نہ ایسا کرنے کا حق رکھتا ہے، کیونکہ اس پر ایمان لانے یا نہ لانے کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ مجدد کے کارِ تجدید کے مختلف شعبے حسبِ ذیل ہیں:

(۱) اپنے ماحول کی صحیح تشخیص، یعنی حالات کا پورا جائزہ لے کر یہ سمجھنا کہ جاہلیت کہاں کہاں کس حد تک سرایت کر گئی ہے۔ کن کن راستوں سے آئی ہے۔ اس کی جڑیں کہاں کہاں اور کتنی پھیلی ہوئی ہیں اور اسلام اس وقت ٹھیک کس حالت میں ہے۔

(۲) اصلاح کی تجویز، یہ تعیین کرنا کہ اس وقت کہاں ضرب لگائی جائے کہ جاہلیت کی گرفت ٹوٹے اور اسلام کو پھر اجتماعی زندگی پر گرفت کا موقع ملے۔

(۳) خود اپنے حدود کا تعین، یعنی اپنے آپ کی قوتوں کو صحیح اندازہ لگانا کہ میں کتنی قوت رکھتا ہوں اور کس راستے سے اصلاح کرنے پر قادر ہوں۔

(۴) ذہنی انقلاب کی کوشش، یعنی لوگوں کے خیالات کو بدلنا، عقائد و افکار اور اخلاقی نقطۂ نظر کو اسلامی سانچے میں ڈھالنا، نظامِ تعلیم و تربیت کی اصلاح اور علومِ اسلامی کا احیا کرنا اور فی الجملہ اسلامی ذہنیت کو از سرِ نو تازہ کر دینا۔

(۵) عملی اصلاح کی کوشش، یعنی جاہلی رسوم کو مٹانا، اخلاق کا تزکیہ کرنا، اتباعِ شریعت کے جوش سے پھر لوگوں کو سرشار کر دینا، اور ایسے افراد تیار کرنا جو اسلامی طرز کے لیڈر بن سکیں۔

(۶) اجتہاد فی الدین، یعنی دین کے اصولِ کلیہ کو سمجھنا، اپنے وقت کے تمدنی حالات اور ارتقائے تمدن کی سمت کا اسلامی نقطۂ نظر سے صحیح اندازہ لگانا اور یہ تعین کرنا کہ اصولِ شرع کے ماتحت تمدن کے پرانے متوارث نقشے میں کس طرح ردّ و بدل کیا جائے جس سے شریعت کی روح برقرار رہے، اس کے مقاصد پورے ہوں اور تمدن کے صحیح ارتقاء میں اسلام دنیا کی امامت کر سکے۔

(۷) دفاعی جدوجہد، یعنی اسلام کو مٹانے اور دبانے والی سیاسی طاقت کا مقابلہ کرنا اور اس کے زور کو توڑ کر اسلام کے لیے ابھرنے کا راستہ پیدا کرنا۔

(۸) احیائے نظامِ اسلامی، یعنی جاہلیت کے ہاتھ سے اقتدار کی کنجیاں چھین لینا اور از سرِ نو حکومت کو عملاً اس نظام پر قائم کر دینا جسے صاحبِ شریعت علیہ السلام نے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے نام سے موسوم کیا ہے۔

(۹) عالمگیر انقلاب کی کوشش یعنی صرف ایک ملک یا ان ممالک میں جہاں مسلمان پہلے سے موجود ہوں اسلامی نظام کے قیام پر اکتفا نہ کرنا بلکہ ایک ایسی طاقتور اور عالمگیر تحریک برپا کرنا جس سے اسلام کی اصلاحی و انقلابی دعوت عام انسانوں میں

پھیل جائے، وہی تمام دنیا کی غالب تہذیب بنے، ساری دنیا کے نظامِ تمدن میں اسلامی طرز کا انقلاب برپا ہو اور عالمِ انسانی کی اخلاقی، فکری اور سیاسی امامت و ریاست اسلام کے ہاتھ میں آ جائے۔

جس شخص نے ایک، دو، تین یا چار شعبوں میں کوئی نمایاں کام انجام دیا ہو وہ بھی مجدد قرار دیا جا سکتا ہے البتہ اس قسم کا مجدد جزوی مجدد ہو گا کامل مجدد نہ ہو گا۔ کامل مجدد صرف وہ شخص ہو سکتا ہے جو ان تمام شعبوں میں پورا کام انجام دے کر وراثتِ نبوت کا حق ادا کر دے۔[1]

یہ محض ایک رائے نہیں حقیقتِ واقعہ ہے کہ مولانا مودودی اس پروگرام کے سات نکات میں کامیاب ہو چکے ہیں اور اب باقی ماندہ دو نکات کو عمل میں لانے کی جدوجہد میں مصروف ہیں، لیکن اس نمایاں کارنامے کے باوجود وہ اپنے لیے اقتدار کے خواہاں نہیں۔ مولانا کئی بار اعلان کر چکے ہیں کہ وہ ایک صحیح اسلامی ریاست میں چپڑاسی کی خدمت انجام دینے میں بھی مسرت محسوس کریں گے، لیکن ایک قومی لادینی حکومت میں کوئی بڑے سے بڑا منصب بھی کسی صورت میں قبول نہیں کریں گے۔ مولانا مودودی نے ماضی کی تمام اسلامی تحریکات کا انتہائی گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ان کی کمزوریوں اور توانائیوں پر بھی ان کی نظر ہے۔ وہ ان کی غلطیوں اور کامیابیوں سے فائدہ اٹھا کر دعوتِ اسلامی کی راہ میں اٹھنے والے ہر ممکن خطرے سے بچ سکتے ہیں۔ اس طرح اس بات کا روشن امکان ہے کہ جہاں ان کے پیشرو ناکام رہے ہیں، وہاں وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہیں گے۔ انشاء اللہ۔

---

[1] تجدید و احیائے دین از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، صفحہ ۴۵-۴۹

جماعتِ اسلامی پاکستان

جماعتِ اسلامی کی تحریک کا آغاز ۱۹۳۳ء سے ہوتا ہے جب مولانا مودودی نے اپنے اُردو ماہنامہ "ترجمان القرآن" میں اسلامی نظامِ حیات کے موضوع پر باقاعدہ لکھنا شروع کیا۔ جدید مغربی تہذیب مسلمانوں پر جس طرح اثر انداز ہو رہی تھی اور اس کے نتیجے میں جو مسائل پیدا ہو رہے تھے، "ترجمان القرآن" نے ان پر بطورِ خاص توجہ کی۔ مولانا نے اپنے پُرزور استدلال اور واضح ادبی اسلوب سے اُس مادہ پرستانہ فلسفے کی مؤثر تردید کی جو مسلمان نوجوان کے ذہن کو ماؤف کر رہا تھا۔ اس طرح بڑی کامیابی کے ساتھ اسلامی نظامِ حیات کی برتری ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

۱۹۳۷ء میں انڈین نیشنل کانگرس نے ایک تعلیمی اور سماجی پروگرام شروع کیا جو مسلمانوں کی تہذیبی زندگی کے لیے سخت تباہ کن تھا۔ ہندو استیلا کے خطرے سے مسلمانانِ ہند کو خبردار کرنے کے لیے مولانا مودودی نے "ترجمان القرآن" میں ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا۔ یہ مضامین بعد ازاں "مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش" کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ ان مضامین کے ذریعے مولانا نے ہندوستان کے مسلمانوں میں یہ احساس پیدا کیا کہ وہ ایک الگ قوم ہیں اور ہندوستان کی دوسری قوموں سے جداگانہ تشخص رکھتے ہیں۔ تحریک کا یہ دور تقریباً آٹھ برس پر محیط تھا۔ اب اسلامی نظامِ حیات کے قیام کی اجتماعی جدوجہد کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ مولانا نے اُن تمام لوگوں کو جو اُن کے

نظریات سے متفق تھے، دعوت دی کہ وہ ایک جگہ جمع ہوں اور باقاعدہ تنظیم کی صورت اختیار کریں۔ ۲۶ اگست ۱۹۴۱ء کو مولانا مودودی (اور ۷۵ دوسرے اصحاب لاہور میں جمع ہوئے اور جماعتِ اسلامی کی بنیاد رکھ دی گئی۔

جماعت اسلامی کا نصب العین پوری انسانی زندگی کو، اس کے متنوع پہلوؤں ——— عقائد، نظریہ، مذہب، اخلاقیات، کردار، طرزِ عمل، تعلیم، تربیت، معاشرتی نظام، ثقافت، اقتصادی نظام، سیاسی قالب، قانون اور عدلیہ، جنگ اور امن، داخلی امور اور بین الاقوامی تعلقات سمیت اس قانونِ الٰہی کی اطاعت میں دینا ہے جس کی وحی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اور جو قرآن و سنّت میں محفوظ ہے۔ جماعتِ اسلامی کا ابتدائی پروگرام دو مرحلوں پر مشتمل تھا۔ اسلامی نظریے کی پُرجوش تبلیغ و اشاعت اور برِّصغیر کے مسلمانوں کی عملی تربیت تاکہ وہ اس نظریے کو عملی جامہ پہنا سکیں۔ ہندویت کے مشرکانہ اثرات سے ہندوستان کا مسلمان معاشرہ بے حد بگڑ چکا تھا، اس کے اندر اسلامی تعلیمات کے منافی رسوم نے راہ پا لی تھی۔ طرّہ یہ کہ مسلمانوں کی کمزوری سے برطانوی سامراج نے بھی فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی اور انہیں اپنے سانچے میں ڈھالنا شروع کر دیا۔ میدانِ جنگ میں شکست کھانے کے بعد مسلمان اپنے فاتحین کے ذہنی غلام بھی بن گئے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ وہ اپنی ہر چیز سے نفرت اور اغیار کی ہر شے کی پوجا کرنے لگے۔

اس مرحلے پر جماعت اسلامی نے تمام غیر اسلامی اثرات، بالخصوص ہندوانہ رسوم، جدید مادہ پرستی اور الحاد پر دو طرفہ حملہ کیا۔ اُن کی جبلّی بُرائیوں کو بے نقاب کیا اور ان خرابیوں کو دُور کرنے کے لیے اسلام جو چارہ تجویز کرتا ہے اُسے پیش کیا۔

"ہمارے ہاں یہ سمجھا جا رہا ہے کہ بس مسلمانوں کی تنظیم تمام دردوں کی دوا ہے۔ "اسلامی حکومت" یا "آزاد ہندوستان میں آزاد اسلام" کے مقصد تک پہنچنے کی سبیل یہ سمجھی جا رہی ہے کہ مسلمان قوم جن افراد سے مرکب ہے وہ سب ایک مرکز پر جمع ہوں، متحد ہوں اور ایک مرکزی قیادت کی اطاعت میں کام

کریں، لیکن در اصل یہ قوم پرستانہ پروگرام ہے۔ جو قوم بھی اپنا بول بالا کرنے کے لیے جدوجہد کرنا چاہے گی وہ یہی طریقِ کار اختیار کرے گی خواہ وہ ہندو قوم ہو یا سکھ یا جرمن یا اطالوی۔ قوم کے عشق میں ڈوبا ہوا ایک لیڈر جو موقع و محل کے لحاظ سے مناسب چالیں چلنے میں ماہر اور جس میں حکم چلانے کی خاص قابلیت موجود ہو، ہر قوم کی سربلندی کے لیے مفید ہوتا ہے خواہ وہ ہٹلر ہو یا مسولینی .... اس ذریعہ سے تو اقتدار اُن ہی لوگوں کو ملے گا جو مردم شماری کے رجسٹر میں تو چاہے مسلمان ہوں، مگر اپنے نظریات اور طریقِ کار کے اعتبار سے جن کو اسلام کی ہوا بھی نہ لگی ہو۔ اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اُسی مقام پر کھڑے ہیں جس مقام پر غیر مسلم حکومت میں تھے، بلکہ اس سے بھی بدتر مقام پر۔ کیونکہ وہ قومی حکومت جس پر اسلام کا نمائشی لیبل لگا ہو گا، اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے میں اس سے زیادہ جری و بے باک ہو گی جتنی غیر مسلم حکومت ہوتی ہے۔ غیر مسلم حکومت جن کاموں پر قید کی سزا دیتی ہے وہ مسلم "قومی حکومت" ان کی سزا پھانسی اور جلاوطنی کی صورت میں دے گی اور پھر بھی اُس کے لیڈر جیتے جی غازی اور مرنے کے بعد رحمۃ اللہ علیہ ہی رہیں گے[1]"

تقسیمِ مُلک کے بعد جماعتِ اسلامی پر جلد ہی عیاں ہو گیا کہ برسرِ اقتدار طبقہ پاکستان کو صحیح اسلامی ریاست بنانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا بلکہ وہ برطانوی حکومت کی میراثِ سیئہ کو جاری رکھنے کا خواہش مند ہے

"آپ کو یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ جماعت اسلامی کا اصل مدعا موجودہ نظام کے چلانے والے ہاتھوں کا بدلنا نہیں ہے۔ بلکہ خود نظام کا بدلنا ہے۔ ہماری

---

[1] اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے۔ از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ص ۱۷، ۲۱، ۲۲۔

کوشش کا مقصود یہ نہیں ہے کہ نظام تو یہی رہے (جو ہمیں برطانیہ سے ورثے
میں ملا ہے) اور انہی اصولوں پر چلتا رہے، مگر اس کو مغربی نہ چلائے مشرقی چلائے
یا انگریز نہ چلائے ہندوستانی چلائے یا ہندو نہ چلائے مسلمان چلائے۔ ہمارے
نزدیک محض ہاتھوں کے بدل جانے سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا........ ہماری
نظر ہاتھوں پر نہیں بلکہ ان اصولوں پر ہے جن پر زندگی کا نظام چلایا جاتا ہے۔
وہ اصول اگر فاسد ہوں تو ہم ان کے خلاف جنگ جاری رکھیں گے اور انہیں
صالح اصولوں سے بدلنے کی کوشش کریں گے[1]"

چنانچہ جماعت اسلامی نے پہلا بڑا کام یہ کیا کہ رائے عامہ کو خوب اچھی طرح منظم کیا اور حکومت
پر زور دیا کہ نئی مملکت جن اغراض و مقاصد کی بنیاد پر وجود میں آئی ہے اور جنہیں پورا کرنے کا وعدہ
کیا گیا تھا، ان کے مطابق ملک کا دستور وضع کیا جائے۔ جماعت اسلامی اچھی طرح سمجھتی تھی کہ پاکستان
کے اسلامی کردار کو متعین کرنے کے لیے ایک صحیح دستور کی تشکیل و تدوین نہایت ضروری ہے۔
پاکستان کی اساس، استحکام، سالمیت اور اتحاد کا انحصار ہی اس بات پر تھا کہ نئے دستور کی ماہیت
کیا ہوگی۔ اسی بنا پر جماعت اسلامی نے اپنی ساری مساعی قومی دستوریہ سے یہ مطالبہ منوانے پر مرکوز
کر دی کہ نئے دستور میں مشہور و معروف "قراردادِ مقاصد" شامل کی جائے جس میں خصوصیت کے
ساتھ یہ تصریح ہو کہ اسلامی احکام کے خلاف کوئی قانون نہیں بنایا جائے گا اور تمام موجودہ قوانین
کو کتاب و سنت کے مطابق ڈھالا جائے گا۔ اس مطالبے سے برسر اقتدار طبقہ بُری طرح بوکھلا گیا؛
چنانچہ مولانا مودودی، میاں طفیل محمد اور مولانا امین احسن اصلاحی کو سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند
کر دیا گیا۔ جماعت اسلامی نے پوری بے خوفی اور جرأت کے ساتھ قراردادِ مقاصد منظور کرنے کا
مطالبہ جاری رکھا۔ آخر برسر اقتدار طبقہ اس مطالبے کے آگے جھکنے پر مجبور ہو گیا اور مارچ ۱۹۴۹ء

---

[1] جماعت اسلامی کی دعوت۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی ص ۱۱-۱۲۔

میں دستور ساز اسمبلی نے قراردادِ مقاصد منظور کر لی۔

"جماعت اسلامی نے عملی سیاست میں حصہ لینے کا جو فیصلہ کیا ہے،
بعض حلقوں میں اس بارے میں غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ اس لیے اس پالیسی کی قدرے
تشریح و توضیح ضروری ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ اگر جماعت اپنی سرگرمیاں
صرف "تبلیغ" تک محدود رکھتی تو زیادہ بہتر تھا۔ اس طرح وہ حکومت کی نگاہوں
سے بچی رہتی اور برسر اقتدار طبقے کے ساتھ کوئی تصادم نہ ہونے پاتا۔ اس سلسلے میں
جماعت اسلامی کا موقف نہایت واضح ہے۔ اس کی رائے میں ——— اور
یہ رائے تاریخ کی روشنی میں قائم کی گئی ہے ——— اسلام کی حقیقی اور سچی
تبلیغ نشۂ اقتدار میں مدہوش، اللہ کی رہنمائی کو بہت کم خاطر میں لانے والے
مطلق العنان حکمرانوں کے لیے کبھی خوانِ یغما نہیں رہی۔ اس کے برعکس وہ
جس نرالی قسم کی تبلیغ کو بے ضرر سمجھتے یا جس کو برداشت کرتے اور اپنی سرپرستی
سے نواز کر جس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں، اُس کا اُس تبلیغ سے کوئی تعلق نہیں
جس کا بیڑا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اٹھایا، جس کو حضورؐ نے خود منظم
کیا، جس پر حضورؐ خود عمل پیرا ہوتے اور جس کی دوسروں کو تعلیم دی۔ بنابریں
جماعتِ اسلامی تبلیغ کا چاہے کوئی سا طریقہ اختیار کرتی، اگر یہ تبلیغ اسلام کے
مکمل ضابطۂ حیات ہونے کے صحیح انقلابی پیغام پر مبنی ہوتی تو لادینیت کے
گرویدہ اور عوام پر مغربی ثقافت اور اس کی اقدار کو مسلط کرنے پر تلے ہوئے
یہ حکمران اُسے قابلِ اعتراض قرار دیتے[1]"

برسرِ اقتدار طبقہ مسلسل اسلامی نعرے لگاتا اور زبانی ہمدردی کے دعوے کرتا رہا، مگر

---

[1] جماعتِ اسلامی پاکستان از علی احمد خان ص ۱۱-۱۲

عملاً اُس نے اسلامی تعلیمات کو نافذ کرنے کی ذراسی کوشش کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ حکومت کی فضا خالص بے دینی اور ابن الوقتی سے مسموم اور گوناگوں بدعنوانیوں سے آلودہ تھی۔ سکول اور یونیورسٹیاں جہاں مخلوط تعلیم روز بروز فروغ پذیر تھی، لادینی ذہن کے حامل اور اسلامی سیرت سے کورے نوجوان پیدا کر رہی تھیں۔ ریڈیو، سینما اور اخبارات تہذیبِ جدید کے انتہائی غیر اخلاقی پہلوؤں کو ہوا دے رہے تھے۔ برسرِ اقتدار لوگ نہ صرف اس صورتِ حال کی روک تھام سے قاصر رہے تھے بلکہ بڑی سرگرمی سے اس کی سرپرستی میں مصروف تھے، لہٰذا جماعت اسلامی برسرِ اقتدار قیادت کو آئینی طریقوں سے ہٹا کر ایسے لوگوں کو آگے لانے کی عوامی مہم چلانے پر مجبور ہو گئی جو زیادہ دیانت دار، زیادہ مخلص، زیادہ اہل اور زیادہ محبِ اسلام عوامی خادم ہوں۔ یہ اقدام برسرِ اقتدار لوگوں کے لیے بے حد اشتعال انگیز اور ناقابلِ برداشت تھا، چنانچہ وہ جماعت پر وار کرنے کے لیے کسی جھوٹے بہانے کی تلاش میں لگ گئے۔ قادیانیوں کو جُداگانہ اقلیت قرار دینے کا مطالبہ اٹھا اور پنجاب میں ہنگامے برپا ہوتے تو یہ جھوٹا بہانہ ہاتھ آ گیا۔ ان لوگوں نے ان ہنگاموں کی ذمہ داری جماعت اسلامی پر ڈال دی اور مولانا مودودی کو گرفتار کر لیا۔ مولانا ابھی قید و بند ہی میں تھے کہ چیف جسٹس محمد منیر نے اپنی شہرہ آفاق "منیر رپورٹ" مرتب کی۔ اس رپورٹ کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ اگر اسلامی قانون نافذ کر دیا گیا تو پاکستان انتہائی قدامت پسند اور جنونی مُلک بن جائے گا۔ اسلامی تعلیمات کو بگاڑنے اور غلط انداز میں پیش کرنے کی جو دیدہ و دانستہ کوشش اس رپورٹ میں کی گئی ہے شاید ہی کوئی دوسری کتاب، حتیٰ کہ کسی غیر مسلم کی لکھی ہوئی کتاب، اس کی مثال پیش کر سکے۔ غیر مسلم اہلِ علم کے ذہنوں پر منیر رپورٹ کے بڑے خطرناک اثرات پڑ سکتے تھے۔ جماعت اسلامی نے فوراً اس رپورٹ کے ایک ایک نکتے کی تردید کی اور اسلامی ریاست کے خلاف جو دلائل منیر صاحب نے دیئے تھے ان سب کو غلط ثابت کیا۔ جماعت کی اس جانفشاں مساعی کا نتیجہ یہ نکلا کہ غیر مسلم اصحابِ علم نے اب اس رپورٹ کو قابلِ اعتماد علمی دستاویز سمجھنا چھوڑ دیا ہے۔

بالآخر دستور ساز اسمبلی نے ۱۹۵۶ء میں دستور منظور کر لیا۔ پاکستان کے اسلامی جمہوریہ ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔ اگرچہ جماعتِ اسلامی کے نقطۂ نظر سے اس دستور کے بہت سے پہلو ناقص تھے، تاہم اُس نے اِسے صحیح سمت کی جانب ایک انتہائی حوصلہ افزا قدم قرار دیا۔ بدقسمتی سے بعد کی حکومتوں نے اس دستور کو نظر انداز کر کے بالائے طاق رکھ دیا۔ اس دَوران میں پُورا مُلک بے دینی، بداخلاقی اور ہر طرح کی مکروہ بدعنوانیوں کا شکار ہوتا رہا۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں فیلڈ مارشل ایوب خان نے آئینی حکومت کا تختہ اُلٹ کر مارشل لاء نافذ کر دیا۔ مُلک کے جمہوری اور اسلامی دستور کے پُرزے پُرزے کر دیئے اور سیاسی جماعتیں جو چند ماہ بعد ہونے والے عام انتخابات کی تیاری کر رہی تھیں، توڑ دیں۔ مارشل لاء ہی کے دوران میں ایک نیا دستور نافذ کر دیا جو از اوّل تا آخر خود ان کا اپنا ساختہ پرداختہ تھا۔ جولائی ۱۹۶۲ء میں مارشل لاء اُٹھا دیا گیا۔

جماعت اسلامی واحد جماعت تھی جو مارشل لاء کی پابندیوں سے برسرِ اقتدار طبقے کی مؤثر سیاسی حریف بن کر اُبھری۔ اُس نے نئے دستور میں ترامیم کرنے اور اس میں ۱۹۵۶ء کے دستور کی اسلامی و جمہوری دفعات شامل کرنے کا مطالبہ کیا۔ برسرِ اقتدار گروہ نے سرکاری اخبارات میں جماعت اسلامی کے خلاف جھوٹے پراپگنڈے کی مہم شروع کر دی اور جماعت کو ہر ممکن طریقے سے بدنام کرنے کی کوشش کی[1]۔ یہ مہم ۶ جنوری ۱۹۶۴ء کو نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ جماعتِ اسلامی کو خلافِ قانون قرار دے دیا گیا اور مولانا مودودی اور جماعت کے

---

[1] اس زمانے میں جماعتِ اسلامی کے خلاف سرکاری پراپگنڈے کی مثالیں حکومت کے چھاپے ہوئے مندرجہ ذیل اُردو پمفلٹوں میں دیکھی جا سکتی ہیں: (۱) جماعت اسلامی اور قومی اخبارات۔ (۲) پاکستان اور جماعتِ اسلامی۔

اکثر رہنما گرفتار کر لیے گئے۔[1] ستم ظریفی کی انتہا یہ تھی کہ اس اقدام سے پہلے جماعت کے شدید ترین نقاد بھی یہ اعتراف کر چکے تھے کہ اس نے آج تک مُلکی قانون کی خلاف ورزی کے جرم کا ارتکاب نہیں کیا۔ ۱۳ نومبر ۱۹۶۳ء کو مولانا مودودی نے اخبارات کے نام ایک بیان جاری کیا جو نوائے وقت اور لاہور کے دوسرے اخبارات میں شائع ہوا۔ اس بیان میں مولانا نے فرمایا تھا:

"میں اصولی طور پر تمام غیر قانونی، غیر دستوری اور خفیہ طریقہائے کار کا مخالف ہوں۔ میری یہ رائے کسی مصلحت یا خوف کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ یہ میری سوچی سمجھی رائے ہے۔ سالہا سال کے مطالعہ اور غور و فکر کے بعد میں اس قطعی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ قانون کا احترام بجائے خود کسی مہذب معاشرے کی زندگی کے لیے نہایت ضروری ہے اور اگر کوئی تحریک یا جماعت ایک مرتبہ اس احترام کو پامال کر دیتی ہے تو پھر جب وہ خود برسرِ اقتدار آتی ہے تو اُس کے لیے اس احترام کو بحال کرنا فی الواقع ناممکن ہو جاتا ہے۔ اسی طرح خفیہ جدوجہد کی فطرت ہی میں ایسے نقائص اور کمزوریاں ہیں کہ جو لوگ اس سے کام لیتے ہیں وہ خود اُن لوگوں سے زیادہ خطرناک بن جاتے ہیں جن کو وہ الگ کرنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے جو کچھ بھی کیا ہے ہمیشہ کُھلے عام اور مروجہ دستور کے قانونی حدود میں رہتے ہوئے کیا ہے۔ حتیٰ کہ میں نے اُن قوانین کی خلاف ورزی بھی کبھی نہیں کی جن کے خلاف میں بڑی سخت جنگ لڑتا رہا ہوں۔ ۔۔۔۔۔۔ میں نے ہمیشہ ان قوانین کو آئینی اور دستوری ذرائع سے بدلنے کی کوشش کی ہے اور قانون کی خلاف ورزی

---

[1] حکومت نے جماعت اسلامی کو خلافِ قانون قرار دیتے ہوئے اس پر جو الزامات عائد کیے ان کے مکمل متن کے لیے دیکھیے پاکستان ٹائمز لاہور مورخہ ۷ جنوری ۱۹۶۴ء۔ نیز دیکھیے مغربی پاکستان ہائی کورٹ کراچی بینچ میں مولانا مودودی کا بیان ایکسٹرا آرڈینری جیوریسڈکشن پٹیشن نمبر ۲۰ - ۱۹۶۴ء۔

کا راستہ کبھی اختیار نہیں کیا۔"

آخر کار جب جماعت اسلامی کو خلافِ قانون قرار دینے کا معاملہ سپریم کورٹ کے سامنے آیا تو فاضل ججوں کی اکثریت نے جماعت پر پابندی عائد کرنے اور اُس کے رہنماؤں کو نظر بند کرنے کے سرکاری اقدام کو ناجائز اور غیر قانونی قرار دے دیا۔[1]

۱۹۴۷ء میں جب برِ صغیر تقسیم ہوا تو جماعت اسلامی دو حصوں میں بٹ گئی۔ ہندوستان کی تحریک جُداگانہ قیادت کے تحت اُبھری۔ اگرچہ اس کے اغراض و مقاصد اور نظریات وہی رہے جو برِ صغیر کی جماعتِ اسلامی کے تھے۔ جماعتِ اسلامی کی ایک اور شاخ ہندوستان کے مقبوضہ کشمیر میں انتہائی ناساز گار حالات کے باوجود ابھی تک سرگرمِ عمل ہے۔ سیلون میں بھی جماعت اسلامی کی ایک چھوٹی سی آزاد اور فعال تنظیم موجود ہے۔

اس وقت جماعتِ اسلامی پاکستان کے دو ہزار سے زائد ارکان اور تقریباً ایک لاکھ متفق ہیں۔ ایسے مرد و زن لاکھوں کی تعداد میں ہیں جو تحریک سے ہمدردی رکھتے ہیں، لیکن اپنے نجی حالات (مثلاً سرکاری ملازمت وغیرہ) کی وجہ سے تحریک کے کاموں میں سرگرم حصّہ لینے سے قاصر ہیں۔ اگرچہ جماعتِ اسلامی کی رکنیت کے دروازے تمام لوگوں پر کُھلے ہیں، تاہم ہر وہ شخص جو جماعت کا رُکن بننا چاہتا ہے اُس کو پہلے ایک لمبے عرصے تک آزمائشی دَور سے گزرنا اور یہ ثابت کرنا پڑتا ہے کہ اُس نے نہ صرف جماعت کے اغراض و مقاصد، طریقِ کار، پالیسی اور پروگرام کو پُوری طرح سمجھ لیا ہے اور اس کے ساتھ کامل اتفاق رکھتا ہے بلکہ وہ روزمرہ کی عملی زندگی میں اسلام کے مقتضیات پر بھی کاربند ہے۔[2] جماعت میں شامل ہونے کے بعد نئے رُکن کو اپنی شخصی زندگی کے شب و روز بڑی حد تک بدل دینا پڑتے ہیں۔ اُس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسلام کا کم سے کم اتنا علم حاصل کرے

---

[1] پاکستان ٹائمز لاہور ۲۶ ستمبر اور ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۴ء۔

[2] دستور جماعت اسلامی دفعہ ۹۔

جس سے وہ اسلامی اور غیر اسلامی طریق ہائے زندگی کے درمیان امتیاز کر سکے اور شریعت مطہرہ نے حلال و حرام کی جو حدود مقرر کر دی ہیں ان کے فہم سے پوری طرح بہرہ یاب ہو سکے۔ اُس کا فرض ہے کہ شریعت نے جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے اُن کو کرے اور جن سے باز رہنے کی ہدایت کی ہے اُن سے باز رہے۔ اُس سے یہ مطالبہ بھی کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے دوستانہ روابط پاپی اور بدکار لوگوں سے منقطع کرے اور نیک لوگوں کے ساتھ استوار کرے۔ کمائی کے حرام طریقے اختیار نہ کرے۔ ناجائز طریقے سے حاصل کردہ جائداد سے دست بردار ہو جائے اور جن لوگوں کے حقوق اُس نے غصب کر لیے تھے انہیں واپس کر دے۔ اُس سے یہ توقع بھی کی جاتی ہے کہ وہ اپنے تمام معاملات کو دیانت داری، انصاف، بے میل راستی اور خدا ترسی سے انجام دے گا۔ اپنی پسند اور ناپسند، اپنے اذواق، اپنے جذبات اور میلانات کو اس حد تک بدل دے گا کہ وہ اسلامی طرزِ حیات سے مطابقت کرنے لگیں اور اسلام کے منافی اپنے تمام سابق میلانات کو مسترد کر دے گا۔ اُس سے یہ اُمید بھی کی جاتی ہے کہ وہ اپنی بیداری کا تمام وقت اسلامی نظامِ حیات قائم کرنے کی جدوجہد میں صرف کرے گا اور زندگی کی حقیقی ضروریات کے سوا تمام وہ سرگرمیاں ترک کر دے گا جو اس نصب العین کی طرف بڑھنے میں ممد نہیں ہیں۔[1]

جماعت کے متفقین سب وہ لوگ ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ ملک میں اسلامی نظام غالب ہو وہ اس مقصد کے حصول کے لیے جماعت سے تعاون کرنا چاہتے ہیں، لیکن نجی اسباب کی بنا پر وہ اپنے آپ کو جماعت کے نظم و ضبط اور اس کی ذمہ داریوں کے حوالے کر دینے سے معذور سمجھتے ہیں۔ جب کسی گاؤں یا قصبے میں پانچ یا پانچ سے زائد متفق ہو جاتے ہیں تو ایک حلقہ متفقین وجود میں آ جاتا ہے جو ایک ناظم کے تحت کام کرتا ہے۔

جماعت میں خواتین ارکان ایک سو سے کم ہیں؛ تاہم ہمدرد خواتین کی تعداد بہت زیادہ

---

[1] ایضاً دفعہ ۸۔

ہے۔ حلقہ خواتین میں بھی رکنیت کی وہی شرائط ہیں جو مردوں کے لیے ہیں۔ ان کے علاوہ خواتین ارکان کے کچھ خصوصی فرائض بھی ہیں۔ وہ جماعت کی دعوت کو اپنے خاندان اور سہیلیوں تک پہنچائیں، اپنے بچوں کے دل میں ایمان کی شمع روشن کریں۔ اگر ان کے والد، شوہر، بیٹے یا بھائی جماعت میں شریک ہیں تو ابتلا اور آزمائش کے زمانے میں بھرد استقامت سے ان کا ساتھ دیں اس طرح سے ان کا حوصلہ بڑھائیں اور اُن کو تقویت پہنچائیں۔ اگر کسی خاتون رکن کا شوہر اسلامی تعلیمات سے بے بہرہ ہے، حرام ذرائع سے کماتا ہے یا گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے تو اُسے بڑے صبر کے ساتھ اس کی اصلاح کی کوشش کرنے یا کم از کم اُس کے بُرے کاموں سے حتی الامکان الگ رہنا چاہیئے اور قرآن و سنت کی خلاف ورزی کے معاملات میں اُس کا کہنا ماننے سے انکار کر دینا چاہیئے۔[1]

جماعت میں کسی شخص کا مرتبہ اس کی دنیوی معاشرتی حیثیت یا تعلیمی استعداد کی بنیاد پر متعین نہیں کیا جاتا بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ احکام الٰہی کا کس حد تک پابند ہے، اسلام کا کتنا فہم رکھتا ہے، اپنی زندگی کو کس حد تک اُس کے مطابق ڈھالتا ہے، تحریک کو چلانے کی کتنی صلاحیت رکھتا ہے اور اس کے اغراض و مقاصد کے لیے اپنی دولت، ذہانت، محنت اور وقت کی کس حد تک قربانی دینے کے لیے آمادہ رہتا ہے۔[2]

جماعت کی ہر مقامی شاخ ہفتے میں ایک یا دو بار اجتماعِ ارکان منعقد کرتی ہے جس میں وہ پچھلے ہفتے کے کام کا جائزہ لیتے اور آئندہ کے کام کا منصوبہ باہمی صلاح مشورے سے تیار کرتے ہیں۔ جماعت کے ہر کارکن سے اُس کی سرگرمیوں کی ہفتہ وار رپورٹ اجتماع کے انعقاد سے پہلے طلب کی جاتی ہے۔ ہر رکن کے لیے سرگرم اور فعال ہونا ضروری ہے۔ عذرِ شرعی کے بغیر مسلسل دو یا تین اجتماعات سے غیر حاضر رہنا کسی رکن کو جماعت سے خارج کر دینے کے

---

[1] حوالہ سابق دفعہ ۱۰
[2] ایضاً دفعہ ۸۳

لیے معقول سبب سمجھا جاتا ہے۔ اجتماعِ عام میں، جس میں عوام کو شرکت کی دعوت دی جاتی ہے، سب سے پہلے درسِ قرآن ہوتا ہے اور اس کے بعد درسِ حدیث۔ پھر جماعت کے لٹریچر میں سے کوئی چیز پڑھی جاتی ہے۔ بعدازاں قومی اور بین الاقوامی مسائل پر تبصرہ ہوتا ہے۔ سب سے آخر میں عام دلچسپی کے معاملات پر گفتگو ہوتی ہے۔

اجتماعات کے دوران میں جماعت کی پالیسیوں، پروگرام اور اس کے ارکان کے ذاتی اور پبلک طرزِ عمل پر آزادانہ بحث مباحثے کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ کوئی شخص چاہے کتنا ہی بلند مرتبت کیوں نہ ہو حتیٰ کہ امیرِ جماعت بھی احتساب اور تنقید سے بالاتر نہیں سمجھا جاتا۔ جس شخص پر تنقید کی جاتی ہے اُس کا فرض ہے کہ وہ یا تو حاضرین کو اپنے طرزِ عمل کے بارے میں مطمئن کرے یا معافی مانگے۔ درحقیقت اجتماعِ ارکان کا بڑا مقصد ان کو اس بات کا کھلا موقع فراہم کرنا ہے کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں تہذیب و شائستگی کے حدود میں رہتے ہوئے بے روک ٹوک کہہ دیں۔ امیرِ جماعت ——— مولانا مودودی ——— خود ہمیشہ اپنے آپ کو احتساب و تنقید کے لیے پیش کرتے رہے ہیں۔ کھلے بحث مباحثے اور بے روک ٹوک تنقید کی اس پالیسی کی بدولت جماعت میں دولت یا دوسرے عناصر کی بنیاد پر کوئی مراعات یافتہ طبقہ اُبھرنے نہیں پایا۔ تاہم بحث مباحثے کے بعد جب کوئی فیصلہ کر لیا جاتا ہے تو تمام ارکانِ جماعت پر اس فیصلے کی پابندی لازمی ہوتی ہے۔ اس طریقے سے جماعت کی صفوں میں افتراق و انتشار پیدا نہیں ہوتا۔

جماعتِ اسلامی اپنے ارکان اور کارکنوں کی اخلاقی اور روحانی تربیت پر خاص طور پر زور دیتی ہے۔ جماعت کا مرکز تربیتی نصاب تجویز کرتا ہے اور ملک بھر میں حلقہ وار اور مقامی طور پر تربیتی کیمپ منعقد ہوتے ہیں۔ اس تربیتی نصاب میں قرآن و حدیث کے مطالعہ اور انہیں جدید دَور کی ضروریات پر منطبق کرنے پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ تنظیم اور انتظامیہ کے اصولوں کی تشریح بھی کی جاتی ہے۔ گاہے گاہے مختلف ارکان کے گھروں میں شب بیداری کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے جہاں قرآن و حدیث کا درس ہوتا ہے۔

امیر جماعتِ اسلامی پاکستان کا انتخاب ہر پانچ سال کے بعد پوری باقاعدگی کے ساتھ ہوتا ہے۔ انتخاب آزادانہ ہوتا ہے اور مجرد اکثریت سے فیصلہ کیا جاتا ہے۔ جماعتِ اسلامی ایک خالص جمہوری تنظیم ہے۔ اس کی شہادت اُن انتخابی قوانین سے ملتی ہے جو دسمبر ۱۹۶۵ء میں اختیار کیے گئے۔ ناظمِ انتخاب کا تقرر تاریخِ انتخاب سے کم از کم تین ماہ پہلے کر دیا جاتا ہے۔ وہ اگر ضروری سمجھے تو اپنے معاون مقرر کرنے کے اختیارات بھی رکھتا ہے۔ مرکزِ جماعت، ناظمِ انتخاب کو ارکانِ جماعت کی فہرست تاریخِ انتخاب سے ساٹھ دن پہلے مہیا کر دیتا ہے۔ وہ تمام ارکان جن کے نام تاریخِ انتخاب سے نوّے دن پہلے رجسٹر میں درج ہوتے ہیں پرچہ رائے دہندگی حاصل کرنے کی درخواست دے سکتے ہیں۔ جو لوگ اس تاریخ کے بعد جماعت کے رکن بنتے ہیں انہیں انتخاب میں ووٹ دینے کا حق نہیں ہوتا۔ ارکان کا سلسلہ وار نمبر ہی ان کا انتخابی نمبر ہوتا ہے۔ رائے دہندگان کا نام، نمبر اور پتہ پرچہ رائے دہندگی پر درج نہیں کیا جاتا بلکہ یہ تمام تفصیلات اس کی نقل کے نمبر شمار کے ساتھ لکھ دی جاتی ہیں۔ لفافے پر رائے دہندہ کا صرف نمبر شمار ہی درج کیا جاتا ہے تاکہ ناظمِ انتخاب پرچہ رائے دہندگی وصول کرنے کے بعد لفافے کا نمبر دیکھ کر فہرست میں وصولی کا نشان لگا دے۔ لفافے رائے شماری کے وقت کھولے جاتے ہیں اور رائے دہندگی کی پرچیاں چھانٹ کر الگ کر دی جاتی ہیں۔ پھر ووٹوں کی گنتی ہوتی ہے۔ امیر جماعتِ اسلامی پاکستان کا انتخاب براہِ راست ناظمِ انتخاب کی نگرانی میں ہوتا ہے۔ انتخابی عذرداریاں نتیجۂ انتخاب کے اعلان کے بعد تیس دن کے اندر اندر دائر کی جا سکتی ہیں۔ مرکزی مجلسِ شوریٰ کے انتخاب کے لیے انتخابی ٹریبونل کا تقرر امیرِ جماعت کرتے ہیں، لیکن امیرِ جماعت کے انتخاب کے لیے انتخابی ٹریبونل کا تقرر مرکزی مجلسِ شوریٰ، ناظمِ انتخاب کے تقرر کے ساتھ ہی کر دیتی ہے۔

جماعتِ اسلامی کے انتخابات میں چاہے وہ کسی سطح سے بھی تعلق رکھتے ہوں، کوئی اُمیدوار نہیں ہوتا[1]۔ یہاں تو درحقیقت کسی شخص کی طرف سے اقتدار کی خواہش کا ذرا سا اظہار بھی اُس کو مکمل

---

[1] حوالہ سابق دفعہ ۱۷۔

طور پر نااہل قرار دے دیتا ہے۔

امیر کے فرائض حسبِ ذیل ہیں:

۱:۔ قرآن و سنت کی تعلیمات کے مطابق اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و وفاداری کو ہر چیز پر مقدم رکھنا۔

۲:۔ اپنے ذاتی راحت و آرام پر جماعت کے مفاد اور اس کی ذمہ داریوں کو ترجیح دینا۔

۳:۔ ارکان جماعت کے درمیان عدل و دیانت سے حکم کرنا۔

۴:۔ جماعت نے اُسے جو امانتیں سپرد کی ہیں اُن کی پُوری پُوری حفاظت اور نگہداشت کرنا۔

۵:۔ خود دستور کا پابند رہنا اور نظمِ جماعت کو اس کے مطابق چلانے کی پوری کوشش کرنا۔

امیر جماعت مجلسِ شوریٰ کے مقرر کردہ حدود کے اندر رہ کر جماعت کی املاک پر جماعت کے مفاد میں تصرف کرنے، نئے ارکان کو جماعت میں داخل کرنے، جو رکن نظمِ جماعت کی پابندی نہ کرے اسے خارج کر دینے، جماعت کا اجتماعِ عام بُلانے اور جماعت کے فیصلوں کو نافذ کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔[1]

نظمِ جماعت کو چلانے کی ساری ذمہ داری اگرچہ امیرِ جماعت کی ہے، تاہم اپنے اقدامات کے سلسلے میں کسی غلطی یا فسق صریح کی خلافت ورزی پر وہ مجلسِ شوریٰ کے آگے جوابدہ ہے، بلکہ اس ضمن میں کوئی بھی رکن وضاحت طلب کر سکتا ہے۔ جماعت کی دعوت کی تبلیغ و اشاعت میں ہمیشہ نظریات تو نظر رہتے ہیں اور امیرِ جماعت کی شخصیت کی مدح و توصیف کرنے اور اُس کو بڑھانے چڑھانے کی کوشش نہیں کی جاتی۔[2]

---

[1] حوالہ سابق دفعہ ۱۸۔

[2] حوالہ سابق دفعہ ۲۰۔

امیرِ جماعت کی امداد اور مشورے کے لیے ایک منتخبہ مجلسِ شوریٰ ہوتی ہے جو مندرجہ ذیل اختیارات رکھتی ہے:۔

۱:۔ جماعت کی پالیسی کی تشکیل۔

۲:۔ امیرِ جماعت کی معزولی بشرطیکہ مجلسِ شوریٰ کے دو تہائی ارکان اس کا مطالبہ کریں۔

۳:۔ مالی اور میزانیہ سے متعلق امور کا جائزہ۔

مرکزی ارکانِ شوریٰ کے چند فرائض حسبِ ذیل ہیں:۔

۱:۔ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و وفاداری کو ہر چیز پر مقدم رکھیں۔

۲:۔ امیرِ جماعت اور خود اپنے آپ پر ہمیشہ نگاہ رکھیں کہ وہ جماعت کے عقیدہ پر قائم، اس کے نصب العین سے وابستہ اور صحیح اسلامی طریق کار کے پابند ہیں۔

۳:۔ مجلس کے اجلاسوں میں پابندی کے ساتھ شریک ہوں۔

۴:۔ ہر معاملے میں اپنے علم اور ایمان و ضمیر کے مطابق اپنی حقیقی رائے کا صاف صاف اظہار کریں۔

۵:۔ جماعت کے اندر مستقل پارٹیاں اور بلاک بنانے سے محترز رہیں اور اگر مجلسِ شوریٰ یا جماعت میں کوئی شخص اس کی کوشش کرتا نظر آئے تو اُس کی ہمت افزائی کرنے یا اس سے تغافل برتنے کے بجائے اس کی اصلاح کرنے کی کوشش کریں۔[1]

جماعتِ اسلامی کی شاخیں مشرقی اور مغربی پاکستان کے تقریباً ہر اہم شہر اور قصبے میں قائم ہیں۔ ہر مقامی شاخ کا اپنا منتخبہ امیر اور مجلسِ شوریٰ ہوتی ہے جو براہِ راست مرکزِ جماعت (اچھرہ۔ لاہور) کے آگے جوابدہ ہوتے ہیں۔

جماعتِ اسلامی اپنے بیت المال کی آمدنی حسبِ ذیل ذرائع سے حاصل کرتی ہے۔

---

[1] ایضاً دفعہ ۱۳۔

۱۱- جماعت کی مطبوعات سے منافع۔

۱۲- ارکانِ جماعت سے عشر و زکوٰۃ۔

۱۳- جماعت کے متفقین کے عطیات۔

۱۴- قربانی کی کھالوں کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقوم جو صرف غریبوں اور حاجت مندوں پر صرف کی جاتی ہیں۔[1]

جماعت اسلامی کا ایک بہت بڑا اثاثہ اُس کا وسیع اور جامع لٹریچر ہے۔ جماعت کی کتابوں اور پمفلٹوں کی مقبولیتِ عام کا اندازہ اس حقیقت سے کیا جا سکتا ہے کہ بعض کتابوں کے اب تک ۱۹ ایڈیشن چھپ چکے ہیں اور اکثر کتابیں پانچ سے بھی زائد بار شائع ہو چکی ہیں۔ مُلک بھر میں بے شمار دارالمطالعے قائم ہیں جہاں سے ہر شخص باسانی جماعت کا لٹریچر حاصل کر سکتا ہے۔ ان کے علاوہ جماعت کے اکثر کارکن رضاکارانہ طور پر گھر گھر عوام کے ہر طبقے میں جماعت کا لٹریچر پھیلاتے ہیں اور اپنی کارکردگی کی رپورٹ ہر ہفتے اپنے مقامی امیر یا ناظم حلقہ کو دیتے ہیں۔ خواتین کے لیے الگ بھی خاص طور پر لٹریچر تیار کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں اب تک پچاس سے زائد کتابیں چھپ چکی ہیں۔ خواتین کا ماہوار رسالہ "بتول" بھی اس میں شامل ہے۔

جماعت تعلیم کے میدان میں بھی بڑی دلچسپی لیتی ہے۔ ۱۹۶۲ء میں خلافِ قانون قرار دیے جانے سے پہلے جماعت ۳۳ تعلیمی ادارے چلا رہی تھی جن میں اسلامی اور جدید طرز کی تعلیم دی جاتی تھی اور قرآن و حدیث، فقہ، اسلامی، عربی زبان و ادب، سیاسیات، معاشیات، تاریخ اور جغرافیہ پر خاص طور پر زور دیا جاتا تھا۔ جماعت ناخواندگی کو ختم کرنے کے لیے تعلیمِ بالغاں کے میدان میں بھی خاصی سرگرم عمل رہی ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ دو درجن سے زائد کتابیں شائع کر چکی ہے۔

---

[1] حوالہ سابق دفعہ ۸۱۔

جماعت کا ایک خاص شعبہ، شعبۂ محنت کاراں ہے۔ مزدوروں میں اسلامی تعلیمات کا فروغ، اُن کی مادّی و روحانی بہبود کو بہتر بنانے کے لیے قانون سازی کی تائید و حمایت اور اُن کی صفوں میں کمیونسٹوں اور دوسرے تخریب پسند عناصر کے نفوذ کی روک تھام اس شعبے کا مقصد ہے۔ کمیونسٹ مزدوروں کو طبقاتی کشمکش پر اُبھارنے کے لیے جو ہتھکنڈے اختیار کرتے ہیں جماعت اسلامی اُن کی شدید مخالف ہے کیونکہ اسلام اقتصادی بنیادوں پر معاشرتی تقسیم کو قبول نہیں کرتا۔

جماعت خدمتِ خلق کے کاموں میں ہمیشہ آگے رہی ہے۔ خصوصاً جب کبھی قوم پر کوئی بُرا وقت آتا ہے وہ اپنے محدود وسائل کے باوجود میدان میں آ جاتی ہے۔ تقسیم ملک کے بعد ہندوستان کے مسلمان ہندوؤں کے ہاتھوں قتلِ عام سے بچنے کے لیے لاکھوں کی تعداد میں پاکستان پہنچے اور جگہ جگہ مہاجر کیمپ قائم ہو گئے۔ جماعت اسلامی نے ان مہاجر کیمپوں خصوصاً لاہور کے کیمپ میں کٹے پھٹے مہاجرین کی بے لوث خدمت کی۔ ان کیمپوں میں بھوک، قحط اور وبائی امراض کا دَور دَورہ تھا۔ جماعت کے کارکن لاوارث لاشوں کو دفن کرتے اور ضرورت مندوں کو خوراک، کپڑا اور دوائیاں تقسیم کرتے رہے۔ مشرقی پاکستان میں حال ہی میں زلزلوں، سیلابوں اور طوفانوں سے ہولناک تباہی آئی۔ جماعت اسلامی نے اس تباہی سے متاثر ہونے والے لوگوں میں وسیع پیمانے پر امدادی کام کیا۔ ۱۹۶۵ء میں ہندوستان سے جنگ کے دَوران میں ہزاروں کشمیری مہاجرین ہندوؤں کے مظالم کا شکار ہو کر پاکستان پہنچے۔ جماعت کے کارکنوں نے ان لوگوں کے مصائب کو کم کرتے اور انہیں ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کے لیے دن رات کام کیا۔ جون ۱۹۶۷ء میں جب اسرائیل نے عرب ممالک پر جارحانہ حملہ کیا اور اسرائیلیوں نے عربوں کو غزہ، سینائی اور مغربی اُردن سے نکال دیا تو جماعت نے عرب مہاجرین کے لیے نہ صرف خوراک اور کپڑے جمع کیے بلکہ ایک طبّی مشن بھیجنے کی پیشکش بھی کی۔

خارجہ پالیسی کے میدان میں جماعت، تمام مسلمان ممالک کے ساتھ اسلامی تعلیمات کیمطابق گہرے برادرانہ روابط قائم کرنے کی حامی ہے۔ وہ مسلمان قوموں کے اتحاد و استحکام کی ضرورت پر بہت زیادہ زور دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جماعت، بلالحاظ نسل و نظریہ تمام ملکوں کیساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنا چاہتی ہے، لیکن یہ بھی ضروری سمجھتی ہے کہ پاکستان کی آزادی پُوری طرح محفوظ رہے اور وہ اقتصادی یا فوجی اعتبار سے کسی بڑی طاقت کا دست نگر بننے سے بہر قیمت احتراز کرے۔ جہاں تک سوشلسٹ بلاک کے کمیونسٹ اور مغرب کے جمہوری مُلکوں کے درمیان زوال پذیر آویزش کا تعلق ہے جماعت کی نظر میں یہ دونوں نظریات غلط ہیں۔ وہ امریکہ اور سوویٹ یونین دونوں کو عربوں کے خلاف صہیونی جارحیت کی حوصلہ افزائی اور نصرت و حمایت کا مجرم گردانتی ہے۔ پچھلے چند سالوں سے جماعت اسلامی نے اپنی کوششیں اہلِ پاکستان کو صہیونیت اور ہندوستان کی سامراجیت کے روز افزوں خطرے سے ہوشیار کرنے اور اس کا مؤثر طریقے سے مقابلہ کرنے پر مرکوز کر دی ہیں۔ جماعت اسلامی کے ایک رکن مصباح الاسلام فاروقی صاحب نے مارچ ۱۹۶۹ء میں ماسونیت Free Masonry پر ایک انکشافات انگیز کتاب "فری میسنری ایک تنقیدی مطالعہ" Free Masonry :A Critical Study لکھی جس میں انہوں نے اس خفیہ سوسائٹی کی اسلام دشمن سرگرمیوں اور صلیبیوں کے زمانے سے اب تک مختلف مسلمان ملکوں پر مترتب ہونے والے تخریبی اثرات کو بے نقاب کیا اور یہ نتیجہ نکالا کہ کسی مسلمان کا ماسونی بننا غداری اور کفر و ارتداد کے مترادف ہے۔ اس کتاب نے پاکستان کے ماسونی مراکز FreeMason lodges میں تہلکہ مچا دیا۔ مئی ۱۹۶۹ء کے آغاز میں لائل پور اور ملتان کے ماسونی مراکز سے تعلق رکھنے والے پچاس سے زائد ممتاز پاکستانی مسلمان مستعفی ہو گئے۔ انہوں نے بتایا کہ ماسونی تحریک فطرتاً صہیونی اور عملاً اسلام دشمن ہے اور مطالبہ کیا کہ ان خفیہ سوسائٹیوں کو خلاف قانون قرار دیا جائے کیونکہ یہ مُلک کے مفاد کے لیے تباہ کُن ہیں۔

جماعت اسلامی نے کمیونزم اور سوشلزم کے خلاف بھی ایک زبردست مہم چلا رکھی

ہے۔ اس نے ۱۹۶۹ء کے ابتدائی مہینوں میں بھاری تعداد میں اُردو پمفلٹ شائع کیے جن میں اسلامی نقطۂ نظر سے مارکسٹ نظریہ پر تنقید کی۔ مارکسزم کے برعکس اسلامی تعلیمات اس مغالطہ آمیز فریب کو مسترد کرتی ہیں کہ معاشی مسئلہ انسانی زندگی کا سب سے بڑا لازمی جز ہے۔ قرآنِ کریم اس اصول پر بار بار زور دیتا ہے کہ دنیاوی مفادات نجات اخروی کے تابع ہونے چاہئیں؛ تاہم چونکہ کمیونزم اور سوشلزم پر ایمان رکھنے والے لوگ اسکولوں، ٹریڈ یونینوں اور نشر و اشاعت کے عوامی اداروں میں خطرناک حد تک نفوذ کر چکے ہیں اس لیے جماعت نے قرآن و سنت کی بنیاد پر نام نہاد "معاشی مسئلے" کا مثبت اور تعمیری حل پیش کرنا نہایت ضروری سمجھا ہے؛ چنانچہ مارچ ۱۹۶۹ء میں جب پاکستان میں ہنگامے اور بے چینی انتہا کو پہنچ چکی تھی جماعتِ اسلامی نے معاشی مسئلے کے متعلق اپنا منشور شائع کر دیا۔ پُورا متن درج ذیل ہے:

"ہمارے مُلک میں اس وقت جو معاشی نظام پایا جاتا ہے وہ صرف اس وجہ سے ازسرتاپا ظلم بن گیا ہے کہ اس میں سابق جاگیرداری نظام اور جدید سرمایہ داری نظام کی تمام بُرائیاں جمع ہو گئی ہیں اور ان پر ایک مطلق العنان اور خود غرض بیوروکریسی کی بُرائیوں کا مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ مجلسِ عاملہ جماعتِ اسلامی پاکستان مسلسل کئی روز تک اس صورت کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ جب تک اس پُورے نظام میں بنیادی تبدیلیاں نہ کی جائیں یہاں عدل و انصاف قائم نہیں ہو سکتا، مگر وہ تبدیلیاں لازماً ایسی ہونی چاہئیں جن کے ساتھ افراد کے بنیادی حقوق اور معاشرے کی شہری آزادیاں بھی برقرار رہیں ورنہ ایک ظلم کی جگہ دوسرا عظیم تر ظلم قائم ہو جائے گا اور یہاں کوئی جمہوریت نہ چل سکے گی۔ لہٰذا اس مجلس کی رائے میں یہ مطلوبہ تبدیلیاں جن اصولوں پر مبنی ہونی چاہئیں وہ حسب ذیل ہیں:-

۱- سُود، سٹہ، جوا اور دوسرے ان تمام طریقوں کو جنہیں اسلامی شریعت نے حرام قرار دیا ہے، قانوناً ممنوع کر دیا جائے اور صرف کسبِ حلال کے دروازے لوگوں کے لیے کھلے رکھے جائیں۔ نیز حرام طریقوں سے دولت صرف کرنے کے دروازے بھی بند کر دیئے جائیں۔

صرف اسی طرح نظامِ سرمایہ داری کی جڑ کٹ سکتی ہے اور وہ آزاد معیشت بھی باقی رہ سکتی ہے جو جمہوریت کے لیے ضروری ہے۔

۲۔ اب تک ناجائز اور حرام طریقوں اور ایک فاسد نظام کی غلط بخشیوں سے دولت کا جو انتہائی ظالمانہ ارتکاز ہو چکا ہے اس کا استیصال کرنے کے لیے اسلامی اصولوں کے مطابق ان تمام لوگوں کا سختی کے ساتھ محاسبہ کیا جائے جن کے پاس دولت کا غیر معمولی اجتماع پایا جاتا ہے اور وہ سب کچھ ان سے واپس لے لیا جائے جو حرام طریقوں سے حاصل کیا گیا ہے۔

۳۔ ایک مدت تک زرعی املاک کے معاملے میں غلط نظام رائج رہنے کی وجہ سے جو ناہمواریاں پیدا ہو چکی ہیں ان کو ختم کرنے کے لیے شریعت کے اس قاعدے پر عمل کیا جائے کہ غیر معمولی حالات میں ایسی غیر معمولی تدابیرِ اصلاح اختیار کی جا سکتی ہیں جو اسلام کے اصولوں سے متصادم نہ ہوتی ہوں۔ اس قاعدے کو ملحوظ رکھتے ہوئے:

الف:۔ ان تمام نئی اور پُرانی جاگیرداریوں کو قطعی ختم کر دیا جائے جو کسی دَورِ حکومت میں اختیارات کے ناجائز استعمال سے وجود میں آئی ہوں کیونکہ ان کی ملکیت بھی شرعی طور پر صحیح نہیں ہے۔

ب:۔ قدیم املاک کے معاملے میں زمین کی ملکیت کو ایک خاص حد (مثلاً سو یا دو سو ایکڑ) تک محدود کر دیا جائے اور اس سے زائد ملکیت کو منصفانہ شرح پر خرید لیا جائے۔ یہ تحدید صرف عارضی طور پر پچھلی ناہمواریاں دُور کرنے کے لیے کی جا سکتی ہے۔ اسے مستقل حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ کیونکہ مستقل تحدید صرف اسلامی قانونِ وراثت ہی سے نہیں بلکہ متعدد دُوسرے شرعی قوانین سے بھی متصادم ہوتی ہے۔

ج:۔ تمام زمینیں خواہ وہ سرکاری املاک میں سے ہوں یا مذکورہ بالا دونوں طریقوں سے حاصل ہوئی ہوں یا نئے بیراجوں کے ذریعے سے کاشت

کے قابل ہو گئی ہوں۔ ان کے بارے میں یہ قاعدہ طے کر دیا جائے کہ وہ غیر مالک کاشت کاروں، یا اقتصادی حد سے کم زمین کے مالکوں کے ہاتھ آسان اقساط پر فروخت کی جائیں گی اور اس معاملے میں قریبی علاقوں کے لوگوں کا حق مقدم رکھا جائے گا۔ سرکاری لوگوں یا افسروں کو سستے داموں دینے یا عطیے کے طور پر دے دینے کا طریقہ بند کر دیا جائے اور جن کو اس طرح زمینیں دے دی گئی ہیں انہیں واپس لے لیا جائے۔ نیز نیلام کے ذریعے سے فروخت کرنے کا طریقہ بھی ترک کر دیا جائے۔

د:۔ مزارعت کے متعلق اسلامی قوانین کی سختی کے ساتھ پابندی کرائی جائے اور تمام غیر اسلامی طریقوں کو از روئے قانون روک دیا جائے تاکہ کوئی زمین داری ظلم کی شکل اختیار نہ کر سکے۔

۴۔ معاوضوں کے درمیان موجودہ تفاوت کو جو ایک اور سو سے بھی زیادہ ہے گھٹا کر فی الحال ایک اور بیس کی نسبت پر اور بتدریج ایک اور دس کی نسبت پر لے آیا جائے۔ نیز یہ طے کر دیا جائے کہ کوئی معاوضہ اس حد سے کم نہ ہو جو موجودہ زمانے کی قیمتوں کے لحاظ سے ایک کنبے کی بنیادی ضروریات کے لیے ناگزیر ہے۔ یہ حد بحالتِ موجودہ ڈیڑھ سو اور دو سو کے درمیان ہونی چاہیے اور قیمتوں کے اُتار چڑھاؤ کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کم سے کم حدِ معاوضہ پر وقتاً فوقتاً نظرِ ثانی کی جاتی رہنی چاہیے۔

۵:۔ کم تنخواہ پانے والے ملازمین کو مکان، علاج اور بچّوں کی تعلیم کے سلسلے میں مناسب سہولتیں دی جائیں۔

۶:۔ تمام صنعتوں میں مزدوروں کو مذکورہ بالا کم سے کم حدِ معاوضہ کے علاوہ نقد بونس بھی دیا جائے اور بونس شیئرز کے ذریعے سے انہیں صنعتوں کی ملکیت میں حصہ دار بنایا جائے تاکہ جس صنعت سے وہ تعلق رکھتے ہیں اس کی ترقی سے ان کی ذاتی دلچسپی وابستہ ہو جائے اور

جس دولت کے پیدا کرنے میں ان کی محنت شامل ہے اس کے منافع میں وہ حصہ دار ہوں۔

۷:۔ موجودہ لیبر قوانین کو بدل کر ایسے منصفانہ قوانین بنائے جائیں جو سرمایہ اور محنت کی کش مکش کو حقیقی تعاون میں تبدیل کر دیں، محنت پسند گروہ کو اس کے جائز حقوق دلوائیں اور نزاعات کی صورت میں تصفیے کا ایسا طریقہ مقرر کر دیں جو ٹھیک ٹھیک انصاف قائم کر سکتا ہو۔

۸:۔ ملکی قوانین اور انتظامی پالیسیوں میں اس طرح ترمیم و اصلاح کی جائے کہ صنعت و تجارت پر سے چند لوگوں کا تسلط ختم ہو اور معاشرے کے زیادہ سے زیادہ افراد ان کی ملکیت اور منافع میں حصہ دار بن سکیں۔ نیز قوانین اور پالیسیوں کی ان تمام خامیوں کو بھی دُور کیا جائے جن کی بدولت ناجائز نفع اندوزیاں کی جاتی ہیں، مصنوعی گرانی پیدا کر کے خلقِ خدا کے لیے زندگی بسر کرنا دشوار کر دیا جاتا ہے اور ملک کی معاشی ترقی کا فائدہ عوام تک نہیں پہنچنے دیا جاتا۔

۹:۔ جن صنعتوں کو کلیدی اور بنیادی اہمیت حاصل ہے اور جن کا نجی ہاتھوں میں چلنا اجتماعی حیثیت سے نقصان دہ ہے ان کو قومی انتظام میں چلایا جائے۔ اس امر کا فیصلہ کرنا کہ کن صنعتوں کو قومی انتظام میں چلانا ضروری ہے ایک ایسی نمائندہ اسمبلی کا کام ہے جو عوام کی آزادانہ مرضی سے منتخب ہوتی ہو اور اس کا فیصلہ کرتے ہوئے یہ اطمینان کر لینا بھی ضروری ہے کہ ان صنعتوں کا انتظام بیوروکریسی کی ان معروف خرابیوں کا شکار نہ ہونے پائے جن کی بدولت صنعتوں کو قومی انتظام میں چلانا فائدے کے بجائے اُلٹا نقصان کا موجب بن جاتا ہے۔

۱۰:۔ بینکنگ اور انشورنس کے اس پورے نظام کو جو دراصل یہودی سرمایہ داروں کے دماغ کا آفریدہ ہے اور جس کی تقلید ہمارے ملک میں بھی کی جا رہی ہے یکسر بدل کر اسلامی اصولِ شرکت و مضاربت اور تعاونِ باہمی کے مطابق از سرِ نو تعمیر کیا جائے۔ اس بنیادی اصلاح کے بغیر ان دونوں چیزوں کے مفاسد کسی طرح دُور نہیں کیے جا سکتے۔ خواہ انہیں قومی ملکیت ہی میں لے لیا جائے۔

۱۱:۔ زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کا انتظام کر کے کفالتِ عامہ کی اس اسلامی اسکیم کو عمل میں لایا

جائے جس سے بہتر سوشل سیکوریٹی کی کوئی اسکیم آج تک کوئی نظام وضع نہیں کر سکی ہے۔ یہی ایک یقینی ذریعہ ہے جس سے ملک میں کوئی فرد غذا، لباس، مکان، علاج اور تعلیم سے محروم نہیں رہ سکتا۔

۱۲:۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان عدم مساوات dis parity دُور کرنے کے لیے تحریک جمہوریت کے آٹھ نکاتی پروگرام میں سے ان چھ نکات پر عمل کیا جائے جو اس مسئلے سے متعلق تحریک جمہوریت نے بالاتفاق طے کیے تھے۔

ان اصولوں پر معاشی اصلاحات کا ایک مفصّل پروگرام مرتب کرنے کے لیے جماعتِ اسلامی کی ایک مخصوص کمیٹی کام کر رہی ہے جو عنقریب اپنی تجاویز پیش کر دے گی، لیکن مجلسِ عاملہ یہ بات واضح کر دینا ضروری سمجھتی ہے کہ صرف معیشت ہی انسانی زندگی کا اصلی یا واحد مسئلہ نہیں ہے بلکہ وہ زندگی کے دوسرے مسائل کے ساتھ گہرا ربط رکھتی ہے۔ جب تک اسلامی تعلیمات اور احکام کے مطابق اخلاق، معاشرت، تعلیم، سیاست، قانون اور نظم و نسق کے تمام شعبوں میں ہمہ گیر اصلاحات نہ ہوں محض معاشی اصلاح کا کوئی پروگرام بھی کامیاب اور نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا۔ جماعتِ اسلامی اپنے منشور میں ان ہمہ گیر اصلاحات کا ایک تفصیلی نقشہ پیش کرے گی جو ان شاء اللہ جلد ہی منظرِ عام پر آ جائے گا۔"

جماعتِ اسلامی مندرجہ ذیل مقاصد کی علمبردار ہے:۔

۱:۔ قرآن و سنّت پر مبنی اسلامی نظامِ حیات کا نفاذ۔

۲:۔ معاشرتی، اقتصادی اور تعلیمی شعبوں میں تمام لوگوں کو مساوی مواقع کی فراہمی۔

۳:۔ تمام شہریوں کے لیے معقول معیارِ زندگی اور غذا، لباس، مکان اور طبّی امداد کا اہتمام۔

۴:۔ تقریر و تحریر، انجمن سازی، اخبارات، لیبر یونینوں اور دیگر تنظیموں کے قیام کی آزادی۔

۵۔ بنیادی انسانی حقوق کے تحفظ اور قانونی عدالت میں مقدمہ چلائے بغیر قید و بند سے محفوظ رہنے کی ضمانت۔

۶۔ حکومت کے محکموں اور پبلک اداروں سے بدعنوانیوں کا انسداد اور سول سروس اور پولیس کی تنظیم نو تاکہ وہ عوام کی بہترین انداز میں خدمت کر سکیں۔

۷۔ عوام کے مفاد کی خاطر دولت کے حصول اور مصرف پر بعض پابندیوں کے ساتھ نجی ملکیت اور صنعتیں قائم کرنے کے حق کی ضمانت۔

۸۔ غیر سودی بنیادوں پر شیئر انشورنس اور بینکاری کا قیام، کلیدی صنعتوں اور قومی اہمیت کے منصوبوں کو قومیانا۔

۹۔ تعمیر و ترقی کے ابتدائی مرحلوں میں نجی زرعی اراضی کی ملکیت کی تحدید۔ نہری اراضی زیادہ سے زیادہ دو سو ایکڑ اور بارانی زمین زیادہ سے زیادہ چار سو ایکڑ۔

۱۰۔ سرکاری زمینوں اور جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں سے حاصل کردہ اراضی کو غیر مالک کاشت کاروں میں ۱۲½ ایکڑ تک بلاقیمت اور چھوٹے زمینداروں میں مناسب قیمت پر تقسیم۔

۱۱۔ بے روزگاروں کو روزگار کی فراہمی۔ مجرد آدمی کو کم سے کم ایک سو روپے ماہوار اور عیال دار کو دو سو روپے ماہوار تنخواہ۔

۱۲۔ زرعی اور صنعتی مزدوروں کو منافع میں حصہ دینے اور مزدوروں کی شرائطِ کار کی اصلاح کا اہتمام۔

۱۳۔ ۵۰۰ روپے ماہانہ سے کم آمدنی والے افراد کو شدید ہنگامی ضروریات پوری کرنے کے لیے بلاسود قرض کی ادائیگی۔

۱۴۔ میٹرک تک مفت تعلیم اور اسلامی اساس پر مبنی ایسی پالیسیوں کا اہتمام جن سے ایماندار، خدا ترس اور ملک و ملت کے لیے مفید نسل تیار ہو سکے۔

۱۵۔ بالغ رائے دہی کی بنیادوں پر براہ راست انتخابات، قانون ساز اسمبلی میں عوام کی مکمل نمائندگی اور اسمبلی کو میزانیہ کی منظوری اور قانون سازی کا اختیار کامل دینے کا اہتمام۔

۱۶۔ ملکی قانون کی نظر میں تمام شہریوں کی برابری اور بے لاگ اور بلا تاخیر انصاف کی ضمانت۔

۱۷۔ انتظامیہ سے عدلیہ کی آزادی۔

۱۸۔ حکومت کی مالی پالیسیوں کے واضح اور صحیح رُخ کا تعین، تاکہ مفاد پرست طبقے کی من مانیوں اور بھاؤ طے کرنے والی کارخانے داروں کی انجمنوں کی روک تھام اور اشیائے ضرورت کی قیمتوں میں تخفیف کر کے غریب عوام کی مشکلات کا ازالہ ہو سکے۔

۱۹۔ دیہات اور شہروں میں گھریلو صنعتوں اور صنعت گھروں کا وسیع پیمانے پر قیام۔

۲۰۔ دیہات کی تہذیبی اور اقتصادی ترقی کا بندوبست۔

۲۱۔ ملک کے تحفظ کی خاطر تمام صحت مند شہریوں کو فوجی اور شہری دفاع کی تربیت۔

۲۲۔ دنیا کے تمام ملکوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات خواہ وہ کسی نظریے کے علمبردار ہوں نیز مسلم اکثریت والے ممالک کے ساتھ اسلام کی بنیاد پر برادرانہ روابط۔

۲۳۔ اسلامی اقدار پر مبنی پاکستانی معاشرے کی تعمیر نو کے سلسلے میں رائے عامہ کو حکومت کی تائید و حمایت کے لیے تیار کرنا۔

۲۴۔ قومی کردار کو مضبوط بنانا، لوگوں کے اخلاقی اور تعلیمی معیار کو بلند کرنا اور اس ضمن میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کو کام میں لانا۔

ایک بار میں نے مولانا مودودی سے دریافت کیا: جماعت اسلامی خالص اسلامی نظام کی علمبردار ہے پھر وہ تحریک جمہوریت میں دوسری جماعتوں کے ساتھ اشتراک و تعاون کرنے کے لیے اس قدر بے تاب کیوں ہے؟ حالانکہ یہ جماعتیں اس کے پروگرام کی متعدد اہم

باتوں سے اختلاف رکھتی ہیں۔ مولانا نے فرمایا: اس وقت اہم ترین اور اشد ضروری کام یہ ہے کہ آمریت کو ختم کر کے حقیقی جمہوریت بحال کی جائے۔ اسلام اور مغربی جمہوریت کے درمیان تصادم کا باعث صرف ایک امر ہے۔ وہ یہ کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے حاکمیت کی سزاوار اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بے ہمتا ہے، جب کہ لادینی جمہوریت کے نزدیک کسی ملک کی حاکمیت کے مالک اس کے عوام ہوتے ہیں۔ ایسے جمہوری ملک کی نمائندہ مقننہ اپنے لیے اکثریت کی مرضی کے سوا اور کوئی پابندی تسلیم نہیں کرتی۔ اس کے برعکس جس ریاست میں اسلامی قانون حکمران ہوتا ہے اُس کا اوّلین فرض یہ ہے کہ وہ شریعتِ الٰہی کو نافذ کرے۔ اس شریعت کو نہ تو کوئی اکثریت منسوخ کر سکتی ہے نہ قرآن و سنت کے احکامات میں کسی قسم کی کوئی صریح تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ تاہم مولانا نے فرمایا: کلیت پسندانہ آمریت کے مقابلے میں لادینی جمہوریت قابلِ ترجیح ہے۔ کلیت پسندانہ آمریت خصوصاً سوشلزم کے سائے میں محبِ اسلام عناصر کو نہایت بے رحمی سے کچلا اور تعذیب و اذیت کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اسلامی تحریک کے کام کرنے کی تمام راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ اس کے برعکس جمہوری طرزِ حکومت میں پارلیمنٹ میں نمائندگی حاصل کرنے کے مواقع میسر رہتے ہیں۔ جماعت سازی، اظہارِ رائے اور پریس میں تنقید کی آزادی برقرار رہتی ہے۔ ایسی حکومت میں جماعتِ اسلامی عوام کی تعلیم و تربیت کا کام بے روک ٹوک جاری رکھ سکتی ہے۔

جماعتِ اسلامی کی نظر صرف پاکستان تک محدود نہیں ہے۔ وہ بالآخر پوری دنیا میں اسلامی نظام قائم کرنے کا عزم و تمنا رکھتی ہے۔

جماعتِ اسلامی، اسلامی نظریات اور اسلامی طرزِ حیات کی دعوت و تبلیغ میں پوری سرگرمی سے مصروف اور اُن تمام بُرائیوں اور بدعنوانیوں کے خلاف نبرد آزما ہے جن کی وجہ سے لادینیت اور مادہ پرستی کا ہر طرف دَور دورہ ہے۔ یہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے کہ مسلمانوں کی بھاری اکثریت، اور اُن میں جدید تعلیم یافتہ اصحاب کی بڑی تعداد بھی شامل ہے،

اسلامی نظامِ حیات کے نفاذ کی خواہش مند اور عصرِ جدید کی ان تمام اقدار کو مسترد کرتی ہے جو دینِ برحق کے منافی اور معاند ہیں۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ اسلامی تعلیمات سے بخوبی واقف نہیں ہیں۔ اگرچہ انہیں جدید زندگی کے مکروہ طور اطوار سے نفرت ہے، لیکن وہ غیر منظم ہیں۔ انہیں رائے دینے کا حق بھی حاصل نہیں۔ ان کی کوئی متحدہ طاقت نہیں۔ اس کے مقابلے میں مغربیت اور لادینیت کی حامی طاقتیں پوری طرح منظم اور مضبوط رشتۂ اتحاد میں مربوط ہیں۔ وہ مسلمان ممالک کے در و بست، پریس، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور نظامِ تعلیم پر چھائی ہوئی ہیں اور خوب سوچے سمجھے منصوبوں کے مطابق مغربیت کو مسلمانوں پر مسلّط کر رہی ہیں۔ بنابریں ہر ملک اور ہر جگہ کے محبِ اسلام عناصر کے لیے لازمی ہے کہ وہ منظم ہوں اور بنیانِ مرصوص بن کر بدی کی ان طاقتوں سے لڑیں۔ اسلامی نظام کی جدوجہد کرنے والے ایک مرتبہ بڑے پیمانے پر منظم اور متحد ہو گئے تو مادہ پرستانہ نظریات کے حامی عناصر کے لیے ان کا مقابلہ کرنا دشوار ہو جائے گا اس لیے کہ موخر الذکر عناصر اپنی مصلحتوں، مفادات اور ناہموار اغراض سے تحریک حاصل کرتے ہیں، جبکہ اوّل الذکر لوگ اس لڑائی میں فتح یاب ہونے کے لیے اپنی ہر چیز حتٰی کہ جان تک قربان کر دینے کے متمنی ہوتے ہیں۔

جماعتِ اسلامی پاکستان کے بدترین دشمن بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ یہ موجودہ دَور کی سب سے بڑی، سب سے طاقتور، سب سے زیادہ متحرک اور سب سے منظم اسلامی تحریک ہے۔ اس کی انتہائی فہیم و ہوش مند، باخبر، مخلص، بے لوث اور دیانت دار قیادت، اس کے ہمہ تن سرگرم اور پُرجوش ارکان، اس کے ہزاروں ہمدرد جن میں سے بہت سے پاکستان میں اعلیٰ مراتب پر فائز ہیں، سارے عالمِ اسلام میں اس کے بہی خواہوں کی بڑھتی ہوئی تعداد، اس کا اعلیٰ پایہ کا وسیع لٹریچر جو بیس سے زائد زبانوں میں منتقل ہو چکا ہے، یہ سارے امور اس بات کی بہترین ضمانت ہیں کہ یہ تحریک مستقبل میں فتح یاب ہو کر رہے گی۔

جماعتِ اسلامی کی دعوت کا خلاصہ یہ ہے ”مسلمان اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم

کی اطاعت کریں۔ منافقت، دورنگی اور ان تمام باتوں کو ترک کر دیں جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں۔ اللہ کے باغیوں اور اسلامی نظامِ حیات کے منکروں کو رہنمائی کے منصب سے الگ کر دیں اور سچے مسلمان بن جائیں۔ جو لوگ ہماری اس دعوت کو حق سمجھتے ہیں وہ ہمارے ساتھ تعاون کریں۔ اور جو ہمارے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنا چاہتے ہیں وہ اللہ کے آگے جوابدہی کے لیے تیار ہو جائیں۔"

حاصلِ بحث

اِسلام اور دُنیائے مغرب میں تبلیغی جدّوجہد

یورپ اور امریکہ نظریاتی اعتبار سے دیوالیہ ہو چکے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان ملکوں میں اخلاقی خلاء پیدا ہو گیا ہے، چنانچہ بہت سے نیک نیت مسلمانوں کو یقین ہے کہ یہ خلاء بالآخر دنیائے مغرب کو اسلام کی آغوشِ شفقت میں پہنچا دے گا۔ ان لوگوں کی رائے ہے کہ چونکہ اسلام کا مستقبل امریکہ اور یورپ میں پنہاں ہے اس لیے ہمیں اپنی ساری تبلیغی اور دعوتی مساعی انہی ممالک میں مرتکز کر دینی چاہئیں۔ زیرِ نظر باب کا مقصد یہ بتلانا ہے کہ یہ ضرورت سے زیادہ رجائیت اور خوش خیالی کس قدر بے حاصل ہے۔

بے شک مغرب کے بعض خال خال اور غیر معمولی افراد حلقہ بگوشِ اسلام ہو چکے ہیں[1]، لیکن ان کا دین وایمان محض ایک ذاتی معاملہ بن کر رہ گیا ہے جس کا مغربی معاشرے پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ اِسلام عیسائیت سے بالکل الگ اور ممتاز دین ہے۔ وہ نہ تو عیسائیت کی طرح محض خدا اور بندے

---

[1] یورپی اور امریکی نومسلموں کے مسلمان ہونے کی داستان معلوم کرنے کے لیے کتاب Islam Our Choice پڑھیے جو دوکنگ مسلم مشن اور لٹریری ٹرسٹ ووکنگ لندن نے شائع کی ہے۔

کے باہمی تعلق کا نام ہے اور نہ محض آخرت میں انفرادی نجات کا تصور۔ اس کے برعکس وہ انسان
کی پرائیویٹ زندگی کے ساتھ ساتھ اُس کی پبلک زندگی سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ وہ انفرادی معاملہ
ہونے کے ساتھ ساتھ سماجی اور اجتماعی معاملہ بھی ہے۔ اسی طرح وہ مطالبہ کرتا ہے کہ معاشرے
کے تمام شعبوں کو ایک معیّن اور مخصوص تہذیبی سانچے میں ڈھالا جائے۔

ہم مسلمانوں کو اس سنگین حقیقت سے پہلو تہی نہیں کرنی چاہیئے کہ اسلام کے خلاف
مغرب کا عناد محض تاریخی اسباب پر مبنی نہیں ہے بلکہ ان سے کہیں زیادہ اس عناد کی اساس وہ
بنیادی تناقض ہے جو دونوں تہذیبوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ اسی تناقض کا یہ نتیجہ ہے کہ
جدید مغربی ذہن کو اکثر حقیقی اسلامی قدریں نہ صرف انتہائی غیر دلکش بلکہ صریحًا اَنمل بے جوڑ نظر آتی
ہیں۔ اسلام کا پوری زندگی پر حاوی ہونا اور کسی دوسرے نظام کو اپنا شریک و سہیم تسلیم نہ کرنا،
مذہب، قانون اور حکومت کا اتحاد و امتزاج، جہاد کا تصور، پردہ، تعددِ ازدواج کی کھلی قانونی
اجازت، اکثر فنونِ لطیفہ اور تفریحات کی ممانعت یا حوصلہ شکنی اس سلسلے کی چند مثالیں ہیں۔ ذیل
کا اقتباس ایک نو مسلم مغربی خاتون کے مکتوب سے لیا گیا ہے جو انہوں نے مجھے لکھا تھا۔ یہ خاتون
اپنے شوہر کے ساتھ صدقِ دل سے مسلمان ہوئی تھیں۔ اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغربی طرزِ
زندگی کو چھوڑ کر اسلامی طرزِ حیات کو اپنانے میں ان میاں بیوی کو کیسی نفسیاتی محرومی سے دوچار
ہونا پڑا۔ وہ لکھتی ہیں:

"آپ کی خوش نصیب شخصیت کے برعکس ہم مغربی زندگی سے جی بھر کر
لطف اندوز ہوتے تھے۔ میرے شوہر گیارہ برس سے پیانو بجاتے آرہے تھے۔
انہیں یورپ کی کلاسیکی موسیقی اور امریکی حبشیوں کے مقدس نغمہ و سرود سے عشق
تھا۔ وہ بڑی عمدہ تصویریں، خصوصًا عوام الناس کی تصویریں کھینچ سکتے تھے۔ ہم
دونوں کو رقص کا بھی شوق تھا اور گاہے گاہے اپنے اس شوق کو پورا بھی کیا
کرتے تھے۔ اسی طرح ہم ہر قسم کے مغربی کھانے کھایا کرتے اور حلال و حرام کی ذرا

بھی تمیز نہ تھی۔ ہم دونوں اپنی ہفتہ وار چھٹی اپنے دوستوں کے ساتھ گزارتے۔ ان
دوستوں میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ ساحل پر غسل کرنے جاتے۔ ریستورانوں،
تھیٹروں، فنونِ لطیفہ کے عجائب گھروں اور سینماؤں کی سیر کرتے۔ اچھے سے
اچھا لباس پہنتے اور چھوٹی چھوٹی خواہشات پر دل کھول کر روپیہ لٹاتے.....
ہم دونوں میں سے کسی نے بھی پورا پورا اندازہ نہیں کیا تھا کہ اسلام ہماری زندگی
کے انتہائی ذاتی اور بے تکلف دائرے میں بھی کتنا گہرا دخل رکھتا ہے۔ ہم نے
پاکستان میں رہنے کا فیصلہ کیا تو میرا خیال تھا کہ مجھے ساڑی یا قمیص اور شلوار
پہننا اور دوپٹہ اوڑھنا ہوگا، لیکن برقعے اور پردے کی ناگزیر ضرورت کا پتہ
اُس وقت چلا جب ہم نے اپنے مسلمان پڑوسیوں کی روزمرّہ زندگی کا مشاہدہ
شروع کیا۔ ہمیں کبھی احساس تک نہ ہوا تھا کہ اپنے گھر والوں اور دوستوں کی
تصویر کشی بھی کوئی معیوب چیز ہے، یا یہ کہ بیوی اپنے شوہر کے ساتھ جب اور
جہاں چاہے نہیں جا سکتی، سینما دیکھنا بُرا ہے، سمندر کے کنارے پیرنے کے
لیے جانا ٹھیک نہیں۔ تاہم تفریح کا جو ساز و سامان ہم یورپ میں چھوڑ آئے تھے
اُس کی تلافی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث سے ہو گئی جس میں حضور
نے فرمایا ہے کہ مردوں کو "تیر اندازی کرنے، اپنے گھوڑوں کو سدھانے اور اپنی
بیویوں کے ساتھ ہنسی دل لگی کرنے" کی اجازت ہے۔ دوسرے تمام میلانات
کو وقت کا ضیاع سمجھنا چاہیئے۔ ہم دونوں تسلیم کرتے ہیں کہ یہ بات درست ہے
لیکن جس نشاط و تفریح سے یورپ میں لطف اندوز ہوا کرتے تھے اُس سے الگ
رہنا آج بھی ہمیں وحشت خیزی کی حد تک دوبھر معلوم ہوتا ہے۔"

دراصل یہ ہمارا اپنا قصور ہے۔ ہم اسلام کو پوری دیانت داری اور جرأت مندی کے ساتھ
من و عن پیش نہیں کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ نو مسلم اہلِ مغرب کی اکثریت اسلام کے بگڑے ہوئے تصور

سے بڑی مشکل میں پھنس جاتی ہے اس لیے کہ وہ اپنے کافر ذہنوں کو مسلمان ذہنوں میں تبدیل کرنے سے نفسیاتی طور پر قاصر رہتے ہیں، چنانچہ وہ نئے دین میں داخل ہوتے ہیں تو بالکل بے خبری میں اپنی پرانی قدریں اور طریقہائے فکر ساتھ لے کر آتے ہیں۔ پھر انہیں اپنے نئے ماحول سے ہم آہنگ کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ انجام کار وہ اکثر تلخ مایوسیوں کا شکار ہو جاتے ہیں، جو انہیں بسا اوقات ارتداد تک پہنچا دیتی ہیں۔ جدید ذہنوں کو متاثر کرنے کے لیے ہم بڑی عیارانہ سوفسطائیت سے کام لیتے ہیں اور اپنے مذہب کو شکر چڑھی گولی کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ اس طرح ہم اہلِ مغرب کو اسلام کے بارے میں ایک ایسا تصوّر دیتے ہیں جس سے وہ فی الحقیقت بالکل پاک ہے۔ اگر ہم صدقِ دل سے یہ ایمان رکھتے ہیں کہ اسلام دوسرے تمام نظام ہائے حیات سے اعلیٰ و برتر ایک خدائی نظامِ حیات ہے تو ہمیں ان لوگوں کی نہ تو تنقید سے ڈرنا چاہیئے، نہ مذمت سے جن کی اقدار ہماری اقدار سے بالکل مختلف ہیں۔

بالفرض مغرب کی تہذیب جدید نظریاتی اعتبار سے دیوالیہ بھی ہو چکی ہے تب اہلِ مغرب نے ابھی تک اس حقیقت کو تسلیم نہیں کیا اور جب تک ان کا طرزِ حیات دنیا میں ہر جگہ غلبہ پا رہا ہے اور مختلف تصوّرات کی حامل تمام دوسری تہذیبیں بسرعت زوال پذیر ہیں۔ اُس وقت تک وہ اس حقیقت کو تسلیم بھی نہیں کر سکتے۔ وہ اپنے طرزِ حیات کی برتری اور تفوق پر یقین محکم رکھتے ہیں۔ جب تک اِس طرزِ حیات کا دنیا میں ڈنکا بجتا رہے گا اُن سے یہ توقع غلط ہوگی کہ وہ اپنی تہذیب کو چھوڑ کر ایک ایسی تہذیب کو اپنا لیں گے جو اس سے بالکل مختلف بھی ہے اور جس کا عظیم الشان ماضی بس تاریخ کے اوراق کی زینت بن چکا ہے۔

ہماری ایک بدنصیبی اور بھی ہے۔ مسلمان ملکوں سے یورپ اور امریکہ جانے والے طلبہ اور سفارتی نمائندوں کی کھیپ میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ اضافہ سوائے نقصان کے اور کوئی چیز اپنے دامن میں نہیں رکھتا۔ مغربی ملکوں میں جانے والے مسلمان اپنے سینوں میں اسلام

کی دوسرے تمام نظامہائے حیات پر برتری کا یقین و اعتقاد اور دوسروں کو اس دولت سے بہرہ ور کرنے کا جوش و جذبہ لے کر نہیں جاتے۔ اس کے برعکس انہیں اپنے "پس ماندہ" اور "غیر ترقی یافتہ" ہونے کا احساس ہر وقت سرنگوں اور شرمسار کیے رکھتا ہے، چنانچہ وہ اہلِ مغرب کو یقین و ایمان کی روشنی سے بہرہ ور کرنے کے بجائے مغرب کے تعلیمی اداروں میں مغربی نظریات اور تکنیک پر عبور حاصل کرتے ہیں اور جب واپس آتے ہیں تو ان نظریات اور طور اطوار کو اپنے ساتھ لے کر آتے ہیں۔ ان سب سے بدتر وہ سفارتی نمائندے ہیں جو سرکاری تقریبات میں شراب پیتے اور غیر محرم عورتوں کے ساتھ ناچتے ہیں اور پھر بڑے فخر کے ساتھ اخبارات میں تصویریں چھپواتے ہیں اس طرح وہ بڑی بے حیائی سے اِسلام کے ایک ایک حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور اپنے ضمیر میں ذرا بھی خلش محسوس نہیں کرتے۔

امریکہ اور یورپ والے جب یہ دیکھ رہے ہوں کہ وہ ملک جہاں مسلمان صدیوں سے بھاری اکثریت میں چلے آتے ہیں، مغربی تہذیب و ثقافت کو اپنانے اور اپنی اسلامی میراث کو تج دینے کے لیے نہایت بے چین ہیں، تو ایسی صورت میں اُن سے یہ توقع کہ وہ حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں گے، کیا سراسر غیر منطقی بات نہیں ہے؟ جس حق کے لیے مسلمان خود عملاً کوئی جذبۂ احترام ظاہر نہیں کرتے غیر مسلم اُسے مقدس گردان کر کیوں کر اپنا سکتے ہیں؟ کیا یہ بات مضحکہ خیز اور صریح منافقت نہیں ہے کہ ہم یورپ اور امریکہ کے غیر مسلموں کو تو اسلام کا سیاسی نظام اپنانے کی دعوت دیں اُس کی حسنات کے گن گائیں اور یہ وعظ کریں کہ اسلام ایک مکمل اقتصادی نظام ہے اور اپنے دامن میں تمام معاشرتی مسائل کا حل رکھتا ہے، لیکن عالمِ اسلام کے کسی گوشے میں ایسے معاشرے کا عملاً وجود تک نہ ہو۔ اس سے بڑھ کر مضرت رساں بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہم سر پھرے قوم پرست آمروں کے سائے میں براستے نام سیاسی آزادی، فنّی اور صنعتی ترقی، لادینی تعلیمی اداروں کے فروغ و عروج، عورتوں کو رائے دہی کے حق، سعودی عرب میں غلامی کی تنسیخ اور مکہ و مدینہ کے مقدس شہروں میں فلک بوس عمارتوں کی تعمیر کو اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے ساتھ خلط ملط

کریں۔ یہ باتیں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ یا "بیداری" کا مظہر نہیں ہیں بلکہ ان سے تو مسلمان ملکوں میں مغربی تہذیب و نظریات کے بڑھتے ہوئے غلبے کا پتہ چلتا ہے۔ جب تک ہم خود اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اپنے دین کو نافذ کرنے کی حقیقی، زندہ اور عملی مثال پیش نہیں کرتے غیر مسلم دنیا پر کسی قسم کا فیصلہ کن دینی اور اخلاقی اثر ڈالنے کی توقع یکسر عبث ہے۔

اہلِ علم کا فرض

مسلمان اہلِ علم خالص سیاسی اور اقتصادی مسائل میں ضرورت سے زیادہ اُلجھے ہوئے ہیں۔ حالانکہ تجدّد کی لعنت وہ سنگین مرض ہے جس نے تمام مسلمان ملکوں کو زبردست مصیبت میں ڈال رکھا ہے۔ انہیں چاہیئے کہ وہ اس مرض کی طرف ہمہ تن متوجہ ہوں اور اس کا مداوا ڈھونڈیں۔ انہیں اس دیسی تجدّد پرستانہ تحریک کو خوب اچھی طرح پہچان لینا چاہیئے جو وقت کے ساتھ ساتھ بدلنے کا نعرہ لگا کر قرآن و سنّت پر مسلمانوں کے ایمان کا ایک ایک نشان مٹا دینا چاہتی ہے۔ یہ تحریک نتائج کے اعتبار سے فلسطین پر صیہونی تسلّط، کشمیر پر بھارتی استیلاء، حبشہ میں مسلمانوں پر ظلم و ستم اور قبرص میں تُرک اقلیت کی نسل کشی کی کوششوں سے کہیں زیادہ خطرناک اور تباہ کُن ہے۔ یہ سب مسائل صرف ایک بُرائی کا مظہر ہیں۔ وہ بُرائی جس کے ارتکاب کے مجرم بدقسمتی سے مسلمان بھی اتنے ہی ہیں جتنے کہ غیر مسلم۔ اور وہ ہے جنگ جُویانہ قوم پرستی۔ غیر مسلم جن گمراہ کُن من گھڑت نظریات میں مبتلا ہیں اگر ہم مسلمان بھی ان میں برابر کے شریک ہوں تو پھر ہم ان سے افضل کیونکر ہو سکتے ہیں؟

مسلمان علماء کا اوّلین فرض یہ ہے کہ وہ اُن تمام فلسفوں کو رد کر دیں جو آج دُنیا میں حکمران ہیں۔ سقراط، افلاطون اور ارسطو کے مقالات جو وحی و تنزیل پر مبنی خالص بدیہی صداقت کے منکر ہیں اور عقلی تحقیق اور "فکری آزادی" کے نام پر ریب و تشکک اور بدعت و کفر کو نیکی کی حیثیت سے بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ سیاسی مصلحت پرستی جس کی تلقین میکیاولی نے اپنی کتاب "پرنس" میں کی ہے۔ والٹیر کی نام نہاد روشن خیالی جو مذہب سے تعلق رکھنے

والی ہر چیز کو توہم، تعصب اور جنون گردانتی ہے۔ فرائیڈ کے اصول جو بے روک ٹوک جنسی تعلقات کو افراد اور معاشرے کے لیے انتہائی صحت مند ہونے کا پراپگنڈا کرتے ہیں، مارکس کا عقیدہ و نظریہ جو اقتصادی بہبود کو کسی ریاست کی سرکاری پالیسی کا سب سے بڑا ہدف قرار دیتا ہے۔ ایسا ہدف جس پر تمام دوسری اقدار قربان کر دینی چاہئیں یا انہیں اس کا تابع مہمل بنا دینا چاہیئے۔ جو کہتا ہے کہ کسی مخصوص معاشرے میں تہذیبی نظریات مادی احوال کے تابع ہوتے ہیں اور اخلاقی اور روحانی ارتقاء کا انحصار مادی ترقی پر ہوتا ہے۔ سب سے بڑھ کر وہ نظریۂ ارتقاء جو پہلے ڈارون نے پیش کیا اور پھر جسے ہربرٹ سپنسر نے عمرانیات پر منطبق کر دیا۔ ضرورت ہے کہ ان تمام بے سروپا من گھڑت نظریات کے ایک ایک نقطے کی مفصل تردید کی جائے۔ دلائل انتہائی منطقی اور مؤثر ہوں اور اسلوبِ بیان نہایت عالمانہ، باوقار اور اس قدر دلچسپ ہو کہ پڑھے لکھے لوگوں کے وسیع حلقے کو اپنی جانب کھینچ سکے۔ ساتھ ہی ساتھ مسلمان اہلِ علم اللہ تعالےٰ کی حاکمیتِ مطلقہ، اُس کے نازل کردہ اور ناقابلِ تغیر قانون کی بے چون و چرا اطاعت کی ضرورت، حلال و حرام، حدودِ شرعی، پردہ اور جہاد کے تصورات کی پُرزور تائید کریں تاکہ لوگ مرعوبانہ نقطۂ نظر کا شکار ہونے کے بجائے ان نظریات کی فطری خوبیوں کے قائل ہوں۔

جب اس قسم کی عالمانہ تصانیف لوگوں کی بھاری تعداد کو اپنی جانب کھینچ لیں گی تو اسلامی تصورات، ٹھوس معاشرتی اداروں (یعنی اسلامی سکول، اسلامی خیراتی ادارے، اسلامی شفاخانے اور سائنسی تحقیقات کے مراکز وغیرہ) کی شکل اختیار کر لیں گے۔ ایک بار یہ اسلامی متبادل ادارے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہو گئے، تو عالمِ اسلام کو مغرب کے رنگ میں رنگنے کا عمل خود بخود ختم ہو جائے گا۔

چنانچہ غیر ملکی استعمار کے منحوس نتائج پر منہ بسورنے کے بجائے ہم مرض کی ظاہری علامات پر شکوہ سنج ہونا چھوڑ دیں گے اور مرض کی چارہ جوئی میں لگ جائیں گے۔

اِسلامی نشاۃِ ثانیہ کے اِمکانات

صحیح اسلامی معاشرہ تعمیر کرنے کی جدوجہد کرنے والوں کے مخالف بغلیں بجا بجا کر کہتے ہیں کہ اسلامی تہذیب ہمیشہ کے لیے معدوم ہو چکی ہے۔ اس کا تخلیقی قدرِ ماضی کی تاریخ بن چکا ہے اُس کے دامن میں کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہی جسے وہ دنیا کے سامنے پیش کر سکے۔ مسلمان ممالک نے مغربی تہذیب کے ہاتھوں یکے بعد دیگرے جس طرح شکست کھائی اُس کے ایک ایک مرحلے کی داستان یہ لوگ بغلیں بجا بجا کر بڑی تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ اس طرح یہ ثابت کرتے ہیں کہ اسلامی زندگی کا انتشار اور مسلمانوں کو مغرب کے رنگ میں رنگ دینے میں مکمل کامیابی ناگزیر ہے۔ مزید براں وہ بڑے وثوق سے یہ بھی کہتے ہیں کہ اس عمل کو کوئی قوت نہیں روک سکتی۔ مفروضہ یہ ہے کہ جدید تہذیب ناقابلِ تسخیر ہے۔ ان پامال اور فرسودہ جملوں نے مسلمانوں کی نوخیز پود کو پست ہمت کرنے میں جو کامیاب کردار ادا کیا ہے ہمارے دشمنوں کا بڑے سے بڑا ماہرانہ پراپگنڈا بھی نہیں کر سکا۔ اگرچہ مغربی تہذیب کے ناقابلِ تسخیر ہونے کا پراپگنڈہ بڑے زور شور سے کیا جاتا ہے لیکن اس کا حقیقت سے دُور کا بھی تعلق نہیں۔ نسلی نفرت، طبقاتی کش مکش، لاقانونیت کی وبا، تخریبی مقاصد کے لیے سائنسی کارناموں کا بے جا استعمال، خاندان کا بے جا اضمحلال، ناجائز جنسی تعلقات کا عالمی شوق اور انتہائی واہیات تعیشات پر ترقی اور انسانی سرمایہ کا بے اندازہ ضیاع

اس تہذیب کی چند انتہائی جراحت پذیر کمزوریاں ہیں۔ ماضی میں تمام دوسری تہذیبیں جن باتوں سے ہلاکت کے گھاٹ اتریں وہی موجودہ تہذیب کو بھی یقیناً تباہ کر کے رہیں گی۔ مخالفین کے مقابلے میں ہمارے پاس گراں بہا اثاثہ یہ ہے کہ حقیقی اسلامی زندگی اس قسم کی تمام بدعنوانیوں سے بالکل پاک اور منزہ ہے۔ مغربی تہذیب لوگوں کو اس لیے ناقابلِ تسخیر نظر آتی ہے کہ کوئی دوسری تہذیب مدِ مقابل نہیں ہے۔ ایک مرتبہ کوئی مؤثر حریف میدان میں آگیا تو جدید تہذیب کی بوسیدگی اور سٹراند کھل کر سامنے آجائے گی۔

ہمارے مقصد کے لیے انتہائی تباہ کن ہمارے وہ مصنّفین اور اہلِ قلم ہیں جو عظمتِ رفتہ کے گن گا کر دورِ جدید کے مسائل کا قابلِ عمل اور حقیقت پسندانہ حل تلاش کرنے سے گریز کرتے ہیں وہ اس حقیقت کو یکسر نظرانداز کر دیتے ہیں کہ ایک ہزار برس پہلے مسلمانوں نے جو کارنامے انجام دیے تھے ان کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے سے یہ ضمانت نہیں ملتی کہ ہمارا اسلامی معاشرہ مستقبل میں بھی نمو پذیر ہوگا۔ یہ نیک نیت مصنّفین حضور مقبول صلی اللہ علیہ وسلّم اور حضورؐ کے اصحابؓ کی مدح و توصیف میں کتابوں پر کتابیں لکھتے ہیں، اسلام کی شاندار روحانی برتری کے گیت گاتے ہیں اور مادہ پرست مغرب کی شدید مذمّت کرتے ہوئے نہیں تھکتے، گویا ان کی پُرزور لفاظی کے نتیجے میں اسلام کا حسین و جمیل مثالی نظام خود بخود وجود میں آجائے گا اور انہیں کسی مزید جدّوجہد کی زحمت نہ اُٹھانا پڑے گی۔

ایک مسلمان اس مسئلے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”دُنیا بھر کے مسلمان تاریخ کے نازک ترین دَور سے گزر رہے ہیں مغربی تہذیب جو جدیدیت پسندی کہلاتی ہے، سائنسی ترقی کی زبردست قوت کے بل پر دوسری تہذیبوں پر غالب آچکی ہے۔ عیسائیت نے اس کا جان توڑ کر مقابلہ کیا، لیکن وہ زیادہ مدّت تک ثابت قدم نہ رہ سکی کیونکہ اس کی زرہ بکتر میں بہت سے خطرناک شگاف تھے۔ دوسرے مذاہب بھی عیسائیت کی طرح

سے حشر سے دوچار ہوئے۔ ممکن ہے کہ بعض ممالک میں ابھی تک کچھ رسوم مروّج ہوں، لیکن اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ وہ سب جدیدیت پسندی سے سخت متاثر اور اُس کے رنگ میں رنگے جا چکے ہیں۔ ان میں سے بعض تو یکسر بدل اور اپنی اصلیت کھو چکے ہیں۔ اگرچہ تمام ملکوں کے مسلمان جدیدیت پسندی کی زبردست ضرب سے بچنے کی سرتوڑ کوشش کر رہے ہیں، تاہم وہ ہر جگہ اس کے مقابلے میں پسپا ہو رہے ہیں۔ نوبت بایں جا رسید کہ اکثر مسلمان بھی اس کا خیر مقدم کر رہے ہیں اور اس عالمی تہذیب میں بتدریج جذب ہوتے جا رہے ہیں ...... “

جو لوگ اسلامی زندگی کو اعلیٰ پیمانے پر نافذ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں بظاہر ان کی کامیابی کے مواقع دھندلے سے نظر آتے ہیں۔ مغربی استعمار سے سیاسی حاکمیت کی بازیافت کے باوجود مغربی تہذیب و ثقافت کے اثرات کمزور نہیں پڑے۔ اس کے برعکس اقتصادی ترقی کے نعرے کی آڑ میں ایشیا اور افریقہ کو مغرب کے رنگ میں رنگنے کا کام تیز تر ہو گیا ہے۔

”انیسویں صدی کے آغاز نے ہمارے اسلامی معاشرے کو موجودہ دور کے عالمگیر معاشرے میں جذب ہوتے دیکھا.......... میری رائے میں ان پیچیدگیوں سے آگاہی ہمارے آج کے اسلامی معاشرے کا سب سے بڑا اور واحد مسئلہ ہے۔ مغرب کے اثرات اتنے عظیم اور گہرے تھے کہ جب مسلمان قومیں سیاسی آزادی سے ہمکنار ہوئیں تو انہیں پتہ چلا کہ روایاتی اسلامی طریقِ زندگی

"The Spell of Modernism," Bashir-ud-din, *The Radiance Views Weekly*, New Delhi, September 13, 1964, p. 9.

کی طرف پلٹنا ممکن نہیں رہا۔[1]"

مذکورہ بالا اقتباس ہمارے جدید تعلیم یافتہ "اعلیٰ طبقے" کی ذہنیت کا مثالی نمونہ ہے، لیکن کیا ہمیں مکمل قنوطیت کے آگے سپر انداز ہو جانا چاہیئے اور اپنی شکست مان لینی چاہیئے؟ کیا ہمارے لیے امید کی کوئی کرن باقی نہیں رہی؟

اسلامی نشاۃِ ثانیہ کا امکان اس وقت چاہے کتنا ہی تاریک نظر آتا ہے، میرے نزدیک اُمید کی کرن اب بھی موجود ہے، بشرطیکہ ہم بروقت اور بروزوں قدم اٹھائیں۔ امید کی یہ کرن مندرجہ ذیل مفروضات پر مبنی ہے:

۱۔ اسلام کے بنیادی مآخذ ——— قرآن و سنّت ——— مفاسد اور بگاڑ سے بالکل پاک اور جوں کے توں ہیں۔ کوئی دوسرا مذہب ایسی فوقیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

۲۔ اسلامی تعلیمات جامع اور ہمہ گیر ہیں اور کسی دُوسرے نظریے کی دست نگر نہیں۔ اسلام کسی ایسی تہذیب کے ساتھ امتزاج اور مصالحت کو برداشت نہیں کرتا جس کے اصول اُس کے اصولوں سے متصادم ہوں۔ اسلام واحد مذہب ہے جو پوری انسانی زندگی کی شایانِ شان رہنمائی کرتا ہے۔ اِسلام صرف یہی نہیں کہتا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے، بلکہ بالصراحت یہ بھی بتاتا ہے کہ ہمیں کس طرح کرنا چاہیئے؟ دوسرے تمام مذاہب کی تعلیمات قلیل، محدود اور جزوی ہیں۔

۳۔ اسلام کو اس کی حقیقی پاکیزہ صورت میں محفوظ رکھنے اور تبلیغ و اشاعت کرنے کے لیے اِسلامی تاریخ کے ہر دَور اور ہر ایک وقت ہر مسلمان مُلک میں مجدّدین پیدا ہوتے رہے ہیں۔ اگرچہ مغربی عالموں اور

---

[1] Shafiq Ghorbal, Director of the Institute of Higher Arabic Studies of the Arab League, Cairo, quoted from *Islam the Straight Path*, Edited by Kenneth Morgan, The Ronald Press, New York, 1958, p. 78.

سیاستدانوں کی تائید و حمایت اور حوصلہ افزائی سے ہمارے تجدد پسند اپنی اسلام کی مسخ شدہ تعبیر کو پورے معاشرے پر مسلط کرنے میں کوشاں ہیں، تاہم وہ لوگ اس کی سخت مزاحمت کر رہے ہیں جو اس منافقانہ دام فریب میں نہیں آئے اور اسلام کو بے آمیزش اور درست حالت میں محفوظ رکھنے کا عزمِ صمیم کیے ہوئے ہیں۔

۴۔ مراکش سے انڈونیشیا تک مسلمانوں کی بھاری اکثریت اسلام چاہتی ہے۔ انہیں ایک مرتبہ متحرک اور زندگی بخش قیادت میسّر آگئی تو وہ انتہائی جوش و خروش سے اسلام کی پیروی کرنے لگیں گے۔

اگر یہ سچ ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اسلامی قیادت کسی ایک مسلمان مُلک میں بھی کیوں اُبھرنے نہیں پاتی؟ ہمیں یہ بات خوب اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ اسلامی قیادت کے فقدان کا سبب نہ تو مغربی تہذیب کی کسی فطری خوبی میں پنہاں ہے اور نہ اسلام کی کوئی فطری خامی اس کی ذمہ دار ہے۔

اس سوال کا جواب مغربی استعمار کی فطرت کے صحیح ادراک سے مل سکتا ہے۔ ۱۹۰۸ء میں لارڈ کرومر نے اپنی کتاب مصرِ جدید **(Modern Egypt)** کے آخری باب میں بڑے انکشاف انگیز انداز میں لکھا ہے کہ جونہی انگریزی تعلیم کے ذریعے انگریزی تہذیب کے رنگ میں رنگی ہوئی دانشوروں اور سیاستدانوں کی ایک ایسی نسل تیار ہو جائے گی جو اقتدار کی باگ ڈور سنبھال سکے اُس وقت انگلستان اپنی تمام نو آبادیات کو سیاسی آزادی دیدے گا، لیکن برطانوی حکومت کسی آزاد اسلامی ریاست کو کسی حالت میں ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہیں کرے گی۔[1] جو بات مصر کے متعلق درست تھی وہ پاکستان کے بارے میں بھی اتنی ہی درست اور صحیح ہے اور جو پالیسی برطانیہ کی تھی اُسی پالیسی پر فرانس، اٹلی اور ہالینڈ بھی گامزن تھے اور وہی پالیسی آج امریکہ اور رُوس کی ہے۔ لہٰذا ہماری سیاسی حاکمیت محض برائے نام ہے۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور مغربی طاقتیں اقتصادی امداد کی آڑ میں اسے برائے نام رکھنے پر تُلی ہوئی ہیں۔

اس ضمن میں مسلمان ممالک کے معاشرتی ڈھانچے کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

ہماری معاشرتی اور اقتصادی سیڑھی کے سب سے بالائی ڈنڈے پر ہمارا جدید تعلیم یافتہ اعلیٰ طبقہ بیٹھا ہوا ہے۔ یہ لوگ اگرچہ نسلاً عرب، ہندوستانی ملائی یا افریقی ہیں مگر ذہنی اعتبار سے اپنے سابق

---

[1] جلد دوم صفحہ ۵۶۷

آقاؤں کا ہو بہو چربہ ہیں اور اپنے ملکوں کو مغربی معاشرے کے رنگ میں پوری طرح رنگنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ یہ طبقہ پوری آبادی میں ایک چھوٹی سی اقلیت ہے، تاہم سارا اقتدار اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اگر اس کی سرگرمیوں کی بروقت روک تھام نہ کی گئی تو یہ بگڑی ہوئی اخلاقی اور تہذیبی اقدار جو اب تک طبقۂ اشراف تک محدود ہیں، پھیل جائیں گی اور عوام کے سارے طبقات کو بگاڑ دیں گی۔

سیڑھی کے نچلے سرے پر ایک اور گروہ ہے جو تمام مسلمان ملکوں کی آبادی میں تین چوتھائی سے بھی زیادہ ہے۔ یہ ہیں سیدھے سادے عام لوگ۔ اس گروہ میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو خوش قسمتی سے تہذیب جدید کے اثرات سے محفوظ رہے ہیں اور جدید تعلیم سے بہرہ ور نہیں ہوتے۔ یہ مسلمان زیادہ تر غریب، ناخواندہ اور ادنیٰ پیشوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ علماء اور مساجد کے امام بھی جنہوں نے دینی مدارس (مثلاً الازہر اور دیوبند وغیرہ) میں تعلیم پائی ہے اسی زمرے میں شامل ہیں۔ ان میں سے اکثر بہ باطن اچھے مسلمان ہیں۔ بعض اسلامی احکام کے پابند بھی ہیں لیکن اپنی لاعلمی کی بنا پر آسانی سے دھوکے میں آجاتے ہیں۔ یہ لوگ اکثریت میں ہیں، لیکن کمزور اور غیر منظم ہونے کی وجہ سے بے بس اور قومی زندگی میں غیر مؤثر ہیں۔ طرّہ یہ کہ اس گروہ کے اکثر نہیں تو بہت سے لوگ اسلامی احکام ذاتی اذعان ویقین سے زیادہ محض عادت یا رسم کے طور پر بجا لاتے ہیں۔ جس روایاتی تہذیب وثقافت کی یہ نمائندگی کرتے ہیں اس میں نہ تو قوّت محرکہ رہی ہے نہ زندگی، چنانچہ ہمارے جدید تعلیم یافتہ نوجوان ہر پرانی، قدیم، پسماندہ، غریب اور فرسودہ چیز کو اسلام کے ساتھ نتھی کر دیتے ہیں۔ دوسری طرف ہر مغربی چیز انہیں درخشاں اور خوبصورت نظر آتی ہے۔ غیر ملکی سیاحوں کے نزدیک یہ روایاتی تہذیب مشرق کے زوال پذیر آثار باقیہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے چونکہ کوئی نوجوان اپنے آپ کو پسماندہ یا رجعت پسند جنونی کہلانا گوارا نہیں کرتا اور چاہتا ہے کہ اُسے روشن خیال، جدید زمانے کا انسان اور ترقی پسند سمجھا جائے اس لیے جونہی یہ نوجوان اعلیٰ سرکاری یا مشنری تعلیمی اداروں سے کاروباری، ماہرین فن، ڈاکٹر، استاد یا سماجی کارکن بن کر نکلتے ہیں، شہرت وناموری اور عزّت واحترام حاصل کرنے کے لیے "روایت پسندی" کو ختم کرنے اور جدّت پسندی کی "برکات" کو ملک کے بعید ترین گوشوں تک پھیلانے کا مصمّم ارادہ کر لیتے ہیں، حکومت کی مکمل تائید، مغربی طاقتوں کی

فنّی امداد کے پروگرام اور کاروبار میں غیر ملکی سرمایہ کاری کے سہارے انہیں اپنی کامیابی کا یقین ہوتا ہے۔ سیدھے سادے عوام زیادہ سے زیادہ بے جان مزاحمت ہی کر سکتے ہیں۔ اگر وہ خود مغلوب نہیں ہوتے تو جدید تعلیم حاصل کرنے کے بعد اُن کے بچے تو ضرور ہو جاتے ہیں۔

معاملہ اگر ان دونوں گروہوں کے ہاتھ میں ہوتا تو صورت حال یقیناً مایوس کن تھی، لیکن خدا کا شکر ہے کہ ایک تیسرا گروہ بھی بتدریج اُبھر رہا ہے۔ یہ گروہ تعداد میں سب سے کم ہے، لیکن مسلمان معاشرے کا مستقبل اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اُس کا قطعی رُخ یہی لوگ متعین کریں گے۔ یہ وہ مرد اور خواتین ہیں جو مغربی تہذیب کی زد میں رہے ہیں، جدید تعلیم یافتہ بھی ہیں، بعض یورپ اور امریکہ میں تعلیم بھی پاتے رہے ہیں اور کام بھی کر رہے ہیں۔ اللہ کے فضل وکرم سے انہوں نے اپنے دین وایمان اور اسلام کی محبت کو برقرار رکھا ہے، اپنی روزمرّہ زندگی میں اس پر عمل کرتے ہیں اور اپنے دین کو نافذ کرنے کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کا جوش وجذبہ رکھتے اور ہمہ تن آمادہ رہتے ہیں۔ اسلامی زندگی میں مغربی تہذیب کے بڑھتے ہوئے نفوذ کی مؤثر مزاحمت کے لیے جس فکری اسلحہ کی ضرورت ہے اُس سے پوری طرح لیس ہیں، چنانچہ صرف یہی لوگ عالم اسلام کی رہنمائی کے اہل ہیں

معاصر مسلمان مصنّفین اور اہلِ علم کی یہ عام رائے ہے کہ یورپ کا مسیحی کلیسا اپنے غیر عقلی عقائد مثلاً تثلیث، مسیح کا انسانی شکل اختیار کرنا، انسان کا پیدائشی گناہ گار ہونا۔ اور پاپائیت کے رجعت پسند ادارے کی بنا پر اثر واقتدار سے محروم ہوا۔ دوسری طرف اسلام ایک آسان، سادہ اور ہر قسم کی پیچیدگیوں سے پاک نظریۂ زندگی ہے۔ نہ تو فطرتاً سائنسی ترقی سے متصادم ہے اور نہ عام اہلِ ایمان سے الگ تعلگ پروہتوں کے کسی مخصوص طبقے کا قائل ہے۔ بنا بریں ہمارا مذہب اس آفت سے محفوظ ہے جس سے عیسائیت دوچار ہوئی۔ استدلال کا یہ انداز بظاہر بڑا خوش آئند اور طمانیت بخش ہے، لیکن درحقیقت یہ ایک خطرناک خوش خیالی ہے۔ مسیحی عقائد اور ادارے، اسلام سے کتنے ہی متضاد سہی، ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ عیسائیت کے زوال کا سبب یہ عقائد اور ادارے نہ تھے۔ جب کیتھولک کلیسا زمانۂ احیاء کے لادینی ہیومانزم، پروٹسٹنٹ تحریک اصلاح اور انقلاب فرانس کے عقب میں آنے والے ملحد مادّہ پرستی کے سیلاب سے دوچار ہوا

تو اُس نے خالص منفی طریقوں سے کام لے کر اسے روکنے کی کوشش کی۔ اُس نے اپنی ساری قوت غیر مقلدین کو تعذیب و اذیت کا ہدف بنانے، گمراہوں کے منظم تعاقب، بدنام احتسابی عدالتوں کے انعقاد اور گمراہ کُن کتابوں کو نذرِ آتش کرنے پر صرف کر دی۔ اگر کیتھولک کلیسا مثبت طریقے اختیار کرتا، محض کفر و بدعت کے فتوے لگانے اور کتابوں کو ممنوع قرار دینے کے بجائے اپنے اجل فضلاء کو مادّہ پرست فلسفیوں کے غلط نظریات کی مؤثر اور معقول دلائل سے تردید کے کام میں لگاتا تو وہ اپنے اثر و اقتدار کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہو جاتا۔ بدقسمتی سے اُس نے اپنے ارکان کے اذہان و قلوب سے اپیل کرنے اور ان کے دلوں میں عیسائیت کی محبت کی رُوح پھونکنے کے بجائے جبر و تشدد سے کام لیا۔ ان متشددانہ اقدامات نے نفرت اور بغاوت کی آگ بھڑکانے کے سوا کچھ نہ کیا۔ اگر کلیسا کے نقطۂ نظر کو مان لیا جائے کہ بدعتی اور زندیق اسی سزا کے مستحق تھے جو انہیں ملی، تب بھی محض جبر و تشدد کے طریقے نہ صرف ظالمانہ اور انسانیت سوز بلکہ قطعاً غیر مؤثر اور خود اپنے مقصد کی مکمل شکست کے موجب ہوتے ہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ ہم مسلمانوں کی تاریخ اختلافِ رائے رکھنے والوں کو تعذیب و اذیت کا نشانہ بنانے کے واقعات سے بڑی حد تک پاک ہے، تاہم دیانتداری کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس بات کا اعتراف کریں کہ ایسی ہی غلطی ہم سے بھی سرزد ہوتی ہے اگرچہ قدرے نرم انداز میں۔ ہمارے جدید تعلیم یافتہ نوجوان مغربی تہذیب کے سبز باغ پر جس طرح روز افزوں ریجھتے جا رہے ہیں اُس کا مقابلہ ہم اس تہذیب کو "مادّہ پرستانہ"، "بے خدا" اور "شیطانی" قرار دینے سے (جو حقیقت کے اعتبار سے بالکل درست ہے) نہیں کر سکتے۔ ہم اپنے تجدد پسندوں پر کفر کے فتوے لگا کر مغربی تہذیب کو اپنانے سے نہیں روک سکتے۔ سوال یہ نہیں ہے کہ وہ کافر قرار دیئے جانے کے سزاوار ہیں یا نہیں۔ اغلباً وہ سزاوار ہیں۔ لیکن کیا اس طرح کے فتوے لگا کر ہم اپنے مقصد کے لیے کوئی تعمیری کام کر سکتے ہیں؟ اس کا جواب زوردار "نہیں" میں ملے گا۔ آخری فیصلہ ہمارے نہیں خدا کے ہاتھ میں ہے۔ ہم مسلمانوں کو اپنی انتہائی جدوجہد اسلام کی خاطر وقف کر دینی چاہیئے اور یہ بات اللہ پر چھوڑ دینی چاہیئے کہ وہ جس طرح چاہے ان لوگوں کو سزا دے۔

ہم مسلمان آج جس بحران سے دوچار ہیں وہ کوئی نیا نہیں ہے۔ صدیوں پہلے ہم ایسے ہی

مسئلے سے دوچار ہو چکے ہیں۔ جب لادینی یونانی ہیومانزم کی مقبولیتِ عام پر شعور رہی تھی جس کی نشر و اشاعت الکندی، ابن سینا، الفارابی اور ابن رشد ایسے معتزلہ فلسفی کر رہے تھے۔ ان سب نے بالکل ہمارے آج کے تجدد پسندوں کی طرح اسلام کا ایک نیا مارکا تیار کرنے کی کوشش کی، لیکن اللہ کے فضل و کرم سے امام غزالیؒ نے اپنی کتاب "تہافت الفلاسفہ" میں ان کے دلائل کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا اور اُن کے منطقی مغالطے اور فکری بددیانتی کو ایسے مؤثر انداز میں بے نقاب کیا کہ معتزلہ تحریک کی پیش قدمی رُک گئی۔ امام ابن تیمیہؒ نے ان عقلیت پسندوں پر آخری مہلک ضرب لگائی۔ اس کے بعد یونانی ہیومانزم اپنا سارا اثر و نفوذ کھو بیٹھا اور معتزلہ فلسفی اسلامی دنیا کی نظر میں پھر کبھی عزت و احترام کا مقام حاصل نہ کر سکے۔

آج عالمِ اسلام کو تمام باتوں سے زیادہ، ایک نئے غزالی اور نئے ابن تیمیہ کی ضرورت ہے۔ ان کے جانشینوں کا کام اتنا پیچیدہ نہیں ہو گا جتنا کہ پہلی نظر میں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ قدیم یونان کا لادینی ہیومانزم عصرِ جدید کے مادّہ پرستانہ فلسفے سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے۔ موخر الذکر فلسفہ اوّل الذکر کی محض ایک مزید ارتقائی شکل ہے۔

ہمارے جدید ابن تیمیہ کا اہم ترین فرض یہ ہے کہ وہ "ترقی" کے غبارے سے ہمیشہ کے لیے ہوا نکال دے۔ ہمارے دلوں میں "تبدیلی"، "ترقی"، "وقت کے ساتھ ساتھ چلنے"، "زمانے کے چیلنج کا مقابلہ کرنے" کا جو خیال بس گیا ہے وہ سوائے ایک تجدد پسندانہ عقیدے کے اور کچھ نہیں ہے جو ڈارون کے نظریۂ ارتقاء سے ماخوذ ہے اور جسے کارل مارکس نے تاریخ کی مادّی تعبیر کی حیثیت سے معاشرتی فلسفے میں سمو دیا تھا۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمیں صرف اللہ تعالیٰ کی مرضی اپنے سامنے رکھنی چاہیئے اور قرآن و سنّت کی غیر مشروط اطاعت کرنی چاہیئے۔ ایک مرتبہ ہم تہذیبی آزادی سے ہمکنار ہو گئے تو پھر ہمیں اسلامی اقدار و نظریات کے دائرے کے اندر خود بخود فطری انداز میں رونما ہونے والے معاشرتی ارتقاء سے خوف کھانے کی کوئی ضرورت نہیں رہے گی۔ جب تک ہم جدت پسندی کے غلام رہیں گے تبدیلی کا مطلب بجز اس کے اور کچھ نہ ہو گا کہ ہم اسلامی اقدار کو چھوڑ کر مغربی طرزِ زندگی کو اپنا لیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ حالات میں ہر تبدیلی اسلامی نقطۂ نظر سے نقصان اور مضرت کے مترادف ہے۔

تہذیب جدید میں کوئی چیز "جدید" اور "ترقی پسندانہ" نہیں ہے۔ سائنس، ٹکنالوجی اور اقتصادی ترقی کے علی الرغم مغربی تہذیب میں پیریکلیز[1] کے عہد سے کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

ابن تیمیہ کے نئے جانشینوں کو تجدد پسندوں کے ایک اور عقیدہ کو بھی بے نقاب کرنا ہوگا اور وہ ہے طلبہ اور اساتذہ کو تحقیق کی مکمل آزادی دینے کا عقیدہ، جو ہمارے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں باقاعدہ ایک ڈھونگ (Bogy) بن چکا ہے۔ "عقل" اور سائنٹفک تحقیق کی مکمل آزادی کا مطالبہ بھی تہذیب جدید کا ایک ازعانی اصول ہے جو سقراط کے فلسفے سے (جو اس کے شاگرد افلاطون نے مرتب کیا تھا) اخذ کیا گیا ہے اور آج تک "لبرلزم" کے بھیس میں باقی ہے۔ اس "نام نہاد" آزادیٔ فکر کا واحد مقصد مذہب کے بنیادی اصولوں کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرنا، اور خدا، اس کی وحی اور آخرت کا مضحکہ اڑانا ہے۔ اسے سوویٹ یونین کے ۱۹۳۶ء کے دستور میں قانونی شکل دے دی گئی ہے؛ چنانچہ تمام روسی شہریوں کو مذہب دشمن پراپگنڈے کی کھلی چھٹی ہے۔ آزادی حقیقی معنی میں ہر پہلو سے آزادی ہونی چاہیئے، لیکن مغربی تہذیب کی سرپرستی میں نام نہاد "عقل" کے لیے لازمی ہے کہ وہ ہمیشہ وحی و الہام کے خلاف صف آرا رہے اور اس کی کبھی حمایت نہ کرے۔ لہٰذا اس نام نہاد "عقل" اور "علمی" تحقیق کو صرف ایک ہی سمت یعنی مادہ پرستی کی راہ پر بڑھنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ یہ لوگ روایاتی دینی تعلیم کو اس بنا پر بُرا بھلا کہتے نہیں تھکتے کہ اس میں تنقیدی، تخلیقی اور آزادانہ غور و فکر کا فقدان ہے، لیکن ہمیں خود ان کے اپنے اندازِ غور و فکر میں بھی کوئی اپج یا آزادی نظر نہیں آتی۔

ہمارے تجدد پسندوں کی ایک اور پسندیدہ تکنیک یہ ہے کہ وہ "رُوح" کا تصادم اسلام کے "ظاہری معنوں" سے کرواتے ہیں، گویا وہ دونوں ایک دوسرے سے منافی ہیں۔ تجدد پسند کہتے ہیں کہ ہماری شریعت کے ظاہری معنی اس کی رُوح کو قتل کر دیتے ہیں؛ چنانچہ مرحوم سید امیر علی اپنی مشہور کتاب "دی سپرٹ آف اسلام" میں یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ پردہ کے ظاہری احکام انتہائی غیر اسلامی ہیں، لیکن

---

[1] تقریباً ڈھائی ہزار برس پہلے قدیم ایتھنز کا ایک حکمران۔

مرد و زن کے آزادانہ اختلاط کا مغربی تصور اور مرد و زن کی مکمل مساوات اسلام کی سچی "روح" ہے۔ شریعت کے الفاظ تعدد ازدواج کی اجازت دیتے ہیں، لیکن یک زوجگی (ایک ہی وقت میں ایک بیوی رکھنا) جیسا کہ لبرل عیسائی سمجھتے ہیں، قرآن کی روح کے عین مطابق ہے۔ قرآن کریم کے سیدھے سادے واضح احکام مسلمانوں پر بار بار زور دیتے ہیں کہ وہ جارح غیر مسلموں کے خلاف جہاد کریں، ان احکام کی رُو سے جہاد مسلمانوں کا مقدس فریضہ ہے، لیکن سید امیر علی کہتے ہیں کہ اسلام، مذہب کے نام لڑی جانے والی تمام جنگوں کو ناپسندیدہ قرار دیتا ہے۔ وہ ہر قیمت پر امن کو ترجیح دیتا ہے۔ اس فہرست میں بغیر حد و اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ مغالطہ کہ "الفاظ تو قتل کرتے ہیں اور "روح" زندگی بخشتی ہے"، خالص مسیحی تصور ہے جو عہد نامہ جدید میں سینٹ پال کی کتاب (Epistles) سے لیا گیا ہے۔ عیسائی تعلیمات جو کچھ بھی کہتی ہیں، ہمیں مسلمان کی حیثیت سے اخلاقی دیانت سے کام لیتے ہوئے یہ اعتراف کرنا چاہیئے کہ یہ تصور اسلامی اقدار کے لیے بالکل اجنبی ہے۔ جس طرح کوئی مخلوق اپنے بیرونی قالب کے بغیر وجود نہیں رکھ سکتی اسی طرح انسانی معاشرے میں مختلف اداروں کے لیے تنظیم کا ہونا نہایت ضروری ہے اس لیے کہ ہم مادی وجود کے بغیر محض روح کی حیثیت سے زندہ نہیں رہ سکتے۔ اگر انسان کا جسم کسی دوسری مخلوق کے قالب میں تبدیل کر دیا جائے تو وہ انسان نہیں رہے گا۔ بعینہٖ اسلام کی رُوح اور قالب کا معاملہ ہے۔ اسلام کی رُوح اپنے قالب کے ساتھ اور قالب روح کے ساتھ زندہ و برقرار رہ سکتا ہے۔ انہیں نہ تو تقسیم کیا جا سکتا ہے اور نہ ایک دوسرے سے جُدا۔

جدید ٹکنالوجی کا جب سے چلن ہوا تمام مذاہب کے ماننے والوں میں یہ لا متناہی اور لاحاصل بحث چھڑ گئی ہے کہ مذہب جدید سائنسی ترقی کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے یا عدم مطابقت۔ اگر سچائی ایک ہے تو صحیح اور دو ٹوک معنی میں کوئی سچا مذہب سچے علم کے ساتھ کبھی متصادم نہیں ہو سکتا۔ یہ سوال صرف اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ جدید سائنس اخلاقاً غیر جانبدار نہیں ہے بلکہ اس کا ارتقاء مادہ پرستانہ فلسفے کے زیر اثر اور سرپرستی میں اس کے اہم ترین آلۂ کار اور سب سے طاقتور ہتھیار کی حیثیت سے ہوا ہے۔ عصر جدید کے مسلمان اہلِ علم کا ایک نہایت ضروری فرض یہ ہے کہ وہ حقیقی، مفید اور تعمیری علم کو فرضی علم، مادہ پرستانہ نظریے اور

قیاس سے الگ الگ کر کے بتائیں۔

میرا اندازہ یہ ہے کہ آنے والا مجدد یا مہدی اپنے زمانے میں بالکل جدید ترین طرز کا لیڈر ہوگا، وقت کے تمام علوم جدیدہ پر اُس کو مجتہدانہ بصیرت حاصل ہوگی۔ زندگی کے سارے مسائل مہمہ کو وہ خوب سمجھتا ہوگا۔ عقلی و ذہنی فراست، سیاسی تدبر اور جنگی مہارت کے اعتبار سے وہ تمام دنیا پر اپنا سکہ جما دے گا اور اپنے عہد کے تمام جدیدوں سے بڑھ کر جدید ثابت ہوگا (ص ۵۲، ۵۵)...... میں نے یہ بات جو کہی ہے کہ مہدی موعود جدید ترین طرز کا لیڈر ہوگا اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ڈاڑھی منڈوائے گا، کوٹ پتلون پہنے گا اور اپ ٹو ڈیٹ فیشن میں رہے گا۔ بلکہ اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ وہ جس زمانے میں بھی پیدا ہوگا اُس زمانے کے علوم سے، حالات سے اور ضروریات سے پُوری طرح واقف ہوگا اور ان تمام آلات و وسائل سے کام لے گا جو اس کے دَور میں سائنٹفک تحقیقات سے دریافت ہوتے ہوں۔ یہ تو ایک امر بجی عقلی بات ہے جس کے لیے کسی سند کی ضرورت نہیں ہے کسی جماعت کے حصولِ مقصد اور کسی تحریک کے غلبہ کا فطری راستہ یہی ہے کہ وہ قوت کے تمام جدید ترین وسائل کو قابو میں لائے اور اپنا اثر پھیلانے کے لیے جدید ترین علوم و فنون اور طریقہ ہائے کار کو استعمال کرے...... (ص ۱۷۰ - ۱۷۱)[1]

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے پاس صرف ایک چارۂ کار رہ گیا ہے وہ یہ کہ ہم اپنے دشمن سے دست و گریباں ہو جائیں اور اپنی ساری قوت سمیٹ کر اُس سے بھڑ جائیں۔ نیز یہ کہ ہمارے پاس اپنے دشمن سے جنگ لڑنے کے لیے مؤثر ہتھیار ہونے چاہئیں۔ لیکن ایک بات سے متنبہ رہنا چاہیے۔ جدیدیت کے ساتھ دست و گریباں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اس سے لڑنا ہے مصالحت کرنا نہیں۔ اپنی اس نظریاتی و نفسیاتی جنگ کے دوران میں ہمیں یہ بات ہرگز فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ ایک بار اگر ہم نے کسی مصلحت کے تحت

---

[1] تجدید و احیائے دین۔ از مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی۔

اپنے دشمن سے مصالحت کر لی اور اس کے ساتھ تشبہ اختیار کر لیا تو ہم ویسے ہی کافر ہو جائیں گے جیسے ہمارا دشمن ہے۔ پھر ہمارے لیے اپنی جدوجہد جاری رکھنے کا کوئی جواز نہ رہے گا۔

"باخدا مسلک بے خدا قیادت کے تحت زندہ نہیں رہ سکتا۔ بنابریں باخدا انسانوں پر واجب ہے کہ وہ دنیا میں باخدا قیادت قائم کریں...... مسلمان مفاد پرستانہ مقاصد کے لیے قیادت نہیں چاہتے۔ مادہ پرستوں کے ساتھ ان کی لڑائی اس لیے نہیں ہے کہ وہ انہیں قیادت سے محروم رکھنا چاہتے ہیں۔ مسلمان، اصولوں کی بنیاد پر دوبارہ قیادت حاصل کرنے کے خواہاں ہیں۔ مادہ پرست، دنیا کو بداعمالی اور اپنے خالق کے خلاف کھلی بغاوت کی طرف لے جا رہے ہیں...... اس بے خدا تہذیب و ثقافت کے ماحول میں زندگی کے باخدا نظریہ، اس کے مقاصد اور اصولوں کا لوگوں کے دل و دماغ کو متاثر کرنا نہایت مشکل ہے۔ اس لیے کہ (جدید) زندگی کا سارا رجحان یکسر ان کے خلاف ہے...... مسلمان اس نظریہ اور عمل کے مخالف ہیں اور ایک ایسا باخدا گروہ ہیں جو اپنے اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ ایمان مسلمانوں کو نہ صرف مغرب کے مادہ پرستانہ مسلک سے دُور رہنے کا حکم دیتا ہے بلکہ دنیا کو اس صراطِ مستقیم کے دکھانے کا فرض بھی عاید کرتا ہے جس پر وہ خود چل رہے ہیں۔ اس فرض کو مسلمان اُس وقت تک کامیابی سے ادا نہیں کر سکتے جب تک وہ دنیا کی قیادت کو مادہ پرستوں کے ہاتھ سے دوبارہ نہ چھین لیں[1]۔"

---

[1] Islamic Ideology and its Impact on Our Times, ...hmud Brelvi, published by the author, Karachi, ...7, pp. 14-15.

مریم جمیلہ (سابق مارگریٹ مارکس) نیویارک کے ایک یہودی خاندان میں ۱۹۳۴ء میں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم امریکی سیکولر اداروں میں حاصل کرنے کے بعد ۱۹۵۲ء میں نیویارک یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔ ۱۹۵۹ء میں مشرف بہ اسلام ہوئیں۔ ۱۹۶۲ء میں مفکرِ اسلام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے طویل مراسلت کے بعد مولانا کی دعوت پر پاکستان تشریف لے آئیں اور جماعت کے ایک ہمہ وقتی کارکن سے نکاح کر لیا۔ اب اسلام کی قلمی خدمت کی سعادت حاصل کر رہی ہیں۔ ان کی متعدد کتابیں اور مقالات شائع ہو کر اہلِ علم اور اربابِ نظر سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

زیرِ نظر کتاب "اسلام ـــ ایک نظریہ ایک تحریک" موصوفہ کی انگریزی کتاب "اسلام اِن تھیوری اینڈ پریکٹس" کا ترجمہ ہے۔

اس کتاب کے پہلے باب کا عنوان ہی "یہودیت سے اسلام تک" ہے۔ یہ ذہنی اور روحانی سفر کی مختصر لیکن خیال افروز داستان ہے۔ یہ کتاب ۴ حصّوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں اپنے قبولِ اسلام کے ساتھ فاضل مؤلفہ نے "مسیحی لادینیت" کا اسلامی اقدار کی روشنی میں جائزہ لیا ہے اور "دنیائے اسلام" کے بارے میں ان غلط فہمیوں اور کج بیانیوں پر بحث کی ہے جو مغرب میں عام ہیں ـــ دوسرے حصّہ میں صحت و صفائی، آداب و اخلاق، عرب ثقافت، فنونِ لطیفہ، خواتین، معاشرتی تقاضوں کے بارے میں اسلامی تعلیمات پیش کی گئی ہیں ـــ تیسرا حصّہ عالمِ اسلام کی ان سرکردہ شخصیات کے تذکرہ اور نقد و تبصرہ پر مشتمل ہے جنھوں نے مختلف ادوار میں عالمِ اسلام کے مختلف خطّوں میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کی۔ اس فہرست میں محمد بن عبدالوہابؒ، سنوسی تحریک، شاہ ولی اللہؒ، سید احمد شہیدؒ، سعید حلیم پاشا، جمال الدین افغانی، سید محمد رشید رضاؒ، شیخ حسن البناءؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ، علامہ اقبالؒ، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور جماعتِ اسلامی شامل ہیں۔ اس حصہ کے بعض مندرجات اور نتائج کے بعض پہلوؤں سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن مصنّفہ نے اپنی بات اخلاص اور پورے زور سے کہی ہے۔

آخری حصّے میں مغربی دنیا میں اسلام اور مشنری تحریکوں کی سعی و جہد کا جائزہ لیا ہے۔ اہلِ علم مسلمانوں پر جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اس کا ذکر کیا ہے اور اس بات سے بحث کی ہے کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے امکانات کس حد تک ہیں۔

پوری کتاب اپنے اندر فکر انگیز مباحث رکھتی ہے۔ مصنفہ کی راست فکری اور غیر مرعوبانہ ذہن بجائے خود ان پشتینی مسلمانوں کے لیے بے حد سبق آموز ہے جو اسلام کا مطالعہ اور اس کا دفاع سخت مرعوبانہ ذہنیت سے کرتے ہیں۔